اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اپریل ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۷ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

حضرت زاہرؓ سے نبی ﷺ بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت زاہرؓ بازار میں اپنا کوئی سامان بیچ رہے تھے کہ اِتنے میں نبی ﷺ وہاں سے گزرے۔ آپ ﷺ نے پیچھے سے آ کر اُن کو اس طرح پکڑ لیا کہ وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے۔ حضرت زاہرؓ گھبرا کر کہنے لگے "ارے! چھوڑو! مجھے، کون ہے؟؟"

تھوڑی دیر بعد حضرت زاہرؓ نے پہچان لیا کہ یہ نبی ﷺ ہیں، تو وہ اور زیادہ اپنے آپ کو نبی ﷺ کے سینہ مبارکہ سے چمٹانے لگے۔ نبی ﷺ نے (مذاقاً) فرمایا "کون اِس غلام کو خریدے گا؟"

حضرت زاہرؓ کہنے لگے "اے اللہ کے رسول! اگر آپ مجھے بیچ دیں گے تو کھوٹا پائیں گے!"

آپ ﷺ نے فرمایا "مگر اللہ کے نزدیک تم کھوٹے نہیں ہو۔"

صحیح ابن حبان، الحظر والاباحہ، المزاح والضحک، الرقم: ۵۷۹۰

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اپریل ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۷ء

شمارہ نمبر ۱۱

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

ادب و دب

پرانے چاول

قندِ شیریں

قطعات

قہقہہ نواز

ولائتی زعفران

ہنسپتالیات

ہزلیات و شگفتیات

سفر وسیلۂ ظفر

فیس بک کے موج میلہ

دیسی لمرکے

جستہ جستہ

اعظم نصر، سید ممتاز علی بخاری، ارسلان بلوچ ارسل، ابنِ صفی، مشتاق احمد یوسفی، مولانا چراغ حسن حسرت، مشفق خواجہ وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ تمام شمارے archive.org کے ذیل ربط پر ڈاؤن لوڈ کرنے کے لئے دستیاب ہیں۔

https://archive.org/details/@nzkiani

شرگوشیاں

ہمارے ادباء عموماً اور مزاح نگار خصوصاً اپنی تحریروں میں کچھ ایسے الفاظ و محاورات کا استعمال کر جاتے ہیں جو رائج تو ہیں لیکن مذہبی اعتبار سے درست نہیں ہیں۔ مثلاً پیٹ پوجا، صلواتیں سنانا، آنتوں کا قل ہو اللہ پڑھنا، غضب خدا کا، خدا جھوٹ نہ بلوائے ان میں اوّل الذکر کا پس منظر ہندووانہ ہے لہٰذا ہمیں پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا کی جگہ عربی محاورہ ''اول طعام بعد کلام'' استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ پوجا خالص ہندوانہ تصور ہے۔ مسلمان پیٹ کی عبادت نہیں کرتے بلکہ محض اس کی ضرورت پوری کرتے ہیں، یہ تو ہندوؤں کا کام ہے کہ جس چیز سے ذرا مطلب ہو یا جس کا خوف ہو اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کے بھگوانوں اور دیوتاوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ہاں جو پیٹ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں، اُنہیں ''عباد البطن'' کہتے ہیں یعنی پیٹ کا بندہ۔ صلوات کا مطلب عربی میں دعا اور رحمت کے ہیں لیکن اُردو میں یہ گالیاں دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے ظاہر ہے اس لفظ کا یہ استعمال مناسب نہیں۔ آنتوں کا قل ھو اللہ پڑھنا بھوک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس محاورے کا اِن معنوں میں استعمال بھی درست نہیں۔ غضب خدا کا ہم کسی ظالمانہ کام کے موقع پر بولتے ہیں جو اکثر ہم انسانوں نے ہی کئے ہوتے ہیں۔ اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پہ حاوی ہے۔ جھوٹ بھی خدا نہیں بلواتا شیطان کے کہنے پر انسان خود ہی بولتا ہے۔ کچھ ایسا حال ان خالص ہندووانہ پس منظر کے حامل محاورات کا ہے مثلاً حسن کی دیوی، لکشمی مہربان ہوگئی، جنم جنم کا ساتھ، بھگوان کی کرپا سے۔ ہمیں اپنی تحریروں میں ان کے استعمال سے گریز کرنا چاہیئے۔ اسی طرح مذہبی کلمات کو طنزیہ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کسی کام کے خراب ہو جانے پر ''سبحان اللہ'' اور ''ماشاءاللہ'' بولتے ہیں جو کہ ان کلمات کی توہین ہے، اس سے بچنا چاہیئے اور کسی برے کام پر ماشاءاللہ یا سبحان اللہ کہنا بھی بہت سنگین غلطی ہے، جیسا کہ طوائفوں اور تماش بینوں میں ماہرانہ ڈانس کی تحسین کے لئے ان الفاظ کا استعمال عام ہے۔ ان غلط الفاظ و محاورات کی طرح مسلمانوں میں کچھ غلط رسومات اور تہوار بھی اب ہمارے کلچر میں رائج ہو گئے ہیں، ان میں اپریل فول تو علماء ادباء اور مصلحین کی کوششوں سے تقریباً دم توڑ گیا ہے لیکن سالگرہوں اور ویلنٹائن ڈے کے تہوار اب ہمارے کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے کی مقبولیت کی وجہ ہمارے نوجوانوں میں اِس کی دلچسپی ہے اور مذہبی حلقوں میں اس سے شدید مخالفت ہوتی ہے، اس کے باوجود یہ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے اور اب تو برقی میڈیا بھی اس کی تشہیر میں ہراول دستے کا کردار ادا کر رہا ہے اور وہ صرف اشتہار لینے اور ریٹنگ بڑھانے کے لئے اس میں پیش پیش ہے اس سے جو نوجوان نسل تباہ ہو رہی ہے اس کی بلا سے۔ سالگرہوں کا معاملہ اس سے زیادہ گھمبیر ہے۔ عام لوگ تو بچوں کی محبت میں بلا سوچے سمجھے لگ گئے جبکہ کچھ مذہبی حلقوں نے اسے مذہب کی سند بھی دے دی ہے اور انہوں نے بھی محبت کے نام پر بعض مذہبی شخصیات کے جنم دن پر خوشی منانا شروع کر دی حالانکہ یہ غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ عیسائیوں میں کرسمس ہندووں میں جنم اشٹمی اور سکھوں میں جنم وارہ سالگرہوں یا جنم دن کی اشکال ہیں، مسلمانوں کو تو محبت کا طریقہ بتایا گیا تھا کہ محبوب رہنماؤں کی اطاعت کی جائے، ہم نے اسے عشق کا نام دیا حالانکہ عشق عربی زبان کا لفظ ہے اور عربی ادب میں جنسی دلچسپی کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی صرف بیوی یا محبوبہ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، باقی رشتوں کے لئے نہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ مجھے اپنی ماں،، بہن، بیٹی سے عشق ہے اس کے لئے محبت کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے، اس لئے مقدس شخصیات کے لئے بھی محبت کا لفظ استعمال ہو گا عشق نہیں۔ اور سالگرہ پر خوشی تو مضحکہ خیز ہے کیونکہ دراصل عمر بڑھتی نہیں گھٹتی ہے اللہ ہمیں اصلاح کی توفیق دے آمین۔

خادم حسین مجاہد

محمد عارف

طنز و مزاح کیا ہے؟

کتاب "مزاحیہ غزل کے خدوخال"
مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن، کا ایک ذیلی باب

اُردو ادب میں طنز و مزاح کو عموماً یکساں معنوں میں لیا اور اکٹھا استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ طنز اور مزاح میں فرق ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر ایک دوسرے کے متوازی بھی چل رہے ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ایسے ملی ہوتی ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ طنز سے مراد طعنہ، ٹھٹھہ، تمسخر یا رمز کے ساتھ بات کرنا ہے جب کہ مزاح سے خوش طبعی، مذاق یا ظرافت مراد لیا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

"عام طور پر "طنز" اور "مزاح" کے الفاظ کو ملا کر بطور ایک مرکب کے استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ دو مختلف المعانی الفاظ ہیں۔ مزاح کے لفظی معنی ہنسی مذاق، جب کہ طنز کے معنی طعنہ یا چھیڑ کے ہیں۔" [۱]

سیّد ضمیر جعفری کی ایک غزل کے دو اشعار کے ذریعے طنز اور مزاح کے فرق کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

آٹھ دس کی آنکھ پھوٹی آٹھ دس کا سر کھلا
لو خطیبِ شہر کی تقریر کا جوہر کھلا

اُن کا دروازہ تھا مجھ سے بھی سوا مشتاقِ دید
میں نے باہر کھولنا چاہا تو وہ اندر کھلا

یہاں پہلا شعر طنز اور دوسرا مزاح کی عمدہ مثال ہے۔

مشہورِ زمانہ مزاح نگار جناب اسٹیفن لی کاک اپنی کتاب "Humourand Humanity" میں مزاح کی تخلیق کے متعلق لکھتے ہیں:

"مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔" [۲]

مزاح کی اس تعریف کے مطابق ایک مزاح نگار زندگی میں موجود ناہمواریوں کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ تخلیقی سطح پر اس کا اظہار یوں کرتا ہے کہ اس سے ہنسی کو تحریک ملتی ہے۔ طنز اور مزاح میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ ایک مزاح نگار مزاح کا حصہ بن کر اس سے محظوظ ہو رہا ہوتا ہے جب کہ طنز نگار سارے ماحول سے الگ تھلگ ہو کر اور اپنے آپ کو بچا کر چوٹ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ

"طنز میں ایک گونہ جارحیت اور ایذا کوشی کا عنصر موجود ہوتا ہے اور مزاح میں انسان دوستی کا شائبہ پایا جاتا

ہے۔"[۳]

طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ادب میں طنز کی اہمیت اس کی مقصدیت کے باعث ہے، اسی باعث اس کی تلخی گوارا کر لی جاتی ہے۔مقصد کے بغیر طنز و مزاح کی تخلیق ممکن نہیں کہ خالص مزاح سے تو صرف ہنسی، دل لگی یا مذاق وغیرہ کا کام ہی لیا جا سکتا ہے اور یہ مزاح کی عمومی سطح ہوتی ہے۔اس صورت میں اس کی کوئی واضح سمت نہیں ہوتی مزاح اسی وقت سمت آشنا ہوتا ہے جب اس میں طنز شامل ہو۔گویا طنز ہی مزاح کی سمت متعین کرتا ہے۔ایک مزاح نگار معاشرے میں موجود بُرائیوں اور ناہمواریوں پر اس انداز سے چوٹ کرتا ہے کہ ہنسی کے ساتھ ساتھ ان معاملات پر غور وفکر کی دعوت بھی ملتی ہے۔بقول خواجہ عبدالغفور:

"مزاح کی سطح اس وقت بلند ہوتی ہے جب مزاح نگار ذاتی تنقید سے گزر کر حالات، سماج، معاشرہ، سیاست، واقعات اور ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اس سطح پر پہنچ کر مزاح طنز میں تبدیل ہو جاتا ہے اور رکاکت سے گریز کرتے ہوئے انسانی ماحول کا بہترین نقاد بن جاتا ہے۔"[۴]

مسرت اور عنصرِ استعجاب (Element of Surprise) مزاح کے دو لازمی اجزا ہیں ایک مزاح نگار اپنی ذہانت اور فطانت سے کسی صورت حال کے وہ پہلو معلوم کر لیتا ہے جو عام شخص کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں اور ان کا اظہار ایک ایسے موڑ پر کرتا ہے کہ سننے والے کو حیرت اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔یہ سارا عمل انتہائی پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے تاہم ایک مزاح نگار اس کو مہارت سے فطری انداز میں پیش کرتا ہے۔اسی ضمن میں رشید احمد صدیقی کی یہ رائے دیکھیے:

"طنز و ظرافت کا شمار دنیا کے مہلک ترین اسلحہ جات میں ہوتا ہے،اس کے استعمال کا منصب ہر وقت، ہر سپاہی یا پیادہ کو نہ ہونا چاہیے،بل کہ سپہ سالار کی خاص اجازت پر اور اس کی براہ راست نگرانی میں اس کو بروئے کار لانا چاہیے"[۵]

طنز و مزاح سے محظوظ ہونے کے لیے انسان میں اس صفت کا ہونا ضروری ہے جو اسے حیوانِ ظریف کے مقام پر فائز کرتی ہے۔مزاح صرف عیب جوئی، طعن و تشنیع یا فقرے بازی کا نام نہیں بل کہ ہم آہنگی، تضاد میں امتیاز، نامعقولیت اور ناہمواریوں کو ایسے دل پذیر انداز میں اُجاگر کرنے کا نام ہے کہ سننے والا قائل ہو جائے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

"ہنسی انسانی جبلتوں میں سے ہے۔اس جبلت کا اظہار تخلیقی سطح پر ہو تو مزاح جنم لیتا ہے۔دوسروں کو بھی مزاح کی مسرت میں شریک کرنا مزاح نگار کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔"[۶]

طنز اور مزاح اکٹھے ہوں یا الگ الگ، ان کی تخلیق اور اظہار کے لیے جو حربے استعمال کیے جاتے ہیں ان کو سمجھے بغیر طنز و مزاح کو سمجھنا مشکل ہے، جیسے موازنہ و تضاد میں بہ یک وقت دو مختلف چیزوں سے مشابہت اور تضاد کا موازنہ کر کے ہنسی کو بیدار کیا جاتا ہے۔دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب میں بھی مزاح کے اس حربے سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔تاہم موازنے کے لیے ناموزونیت اور بے ڈھنگے پن کا مشاہدے میں آنا ضروری ہے۔ اردو مزاحیہ نظم ونثر میں اس کی کامیاب مثالیں ملتی ہیں۔

مزاحیہ صورتِ حال طنز و مزاح کا ایک اہم اور مشکل حربہ ہے اس کی وجہ زبان و بیان اور الفاظ کی سلاست و بلاغت کے خیال کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیز صورتِ حال کی پیدائش بھی ہے۔یہ خالص مزاح کی معیاری قسم ہے، جیسے کیلے کے چھلکے سے پھسلنے سے جو مضحک صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اس پر بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔بقول پروفیسر محمد طٰہٰ خان:

"بین الاقوامی مزاح تو واقعاتی مزاح ہے"[۷]

بذلہ سنجی (Wit) کا حربہ ذہانت، نکتہ آرائی اور بر جستگی کا حربہ ہے۔

"سنجیدہ گفتگو یا تحریر کے دوران اچانک کوئی ایسی تڑپتی مچلتی بات کرنا یا کہنا جو قاری یا سامع کو نہال کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کر دے نغز یا بذلہ سنجی

کہلاتی ہے۔"[۸]

سیّد عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"جہاں بہ ظاہر مشابہت موجود نہیں ہوتی وہاں متخالف اور متضاد چیزوں میں ایک وجہِ شبہ پیدا کی جاتی ہے اور یا جہاں یک رنگ مشابہت ہوتی ہے، وہاں مصنف اپنے ذوق یا بذلہ سنجی سے کام لے کر عدم مشابہت کے عنصر دریافت کرتا ہے۔"[۹]

الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا ہونے والا مزاح "لفظی بازی گری" کے زمرے میں آتا ہے۔اس تکنیک میں عام طور پر ایسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے جن کے قریب اور بعید دو معنی ہوں، کہنے والا اوّل الذکر مراد لیتا ہے اور سننے والا بعد الذکر۔ایہام اور الفاظ کی تکرار سے پیدا ہونے والا مزاح بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔اردو شاعری کے ابتدائی دور میں "ایہام گوئی" کی تحریک میں لفظی بازی گری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔مرزا غالب جب بہادر شاہ ظفر کو عید ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا "مرزا کتنے روزے رکھے؟" جواب دیا" پیرو مرشد ایک نہیں رکھا۔"

مزاحیہ کردار طنز و مزاح کی تخلیق کا اہم جزو ہیں۔ مزاحیہ کردار کی تخلیق میں مبالغہ آرائی سے کام لے کر اس کے انداز و اطوار کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے کہ مضحک صورتِ حال پیدا ہو کر طنز و مزاح کا باعث بنتی ہے۔مزاحیہ کردار اس لیے بھی مشکل ہے کہ تخلیق کردہ کردار، سامنے آتے ہی قاری یا سامع کے چہرے پر ہنسی کی لہر دوڑ جانا ضروری ہے۔اردو نثر میں رتن ناتھ سرشار کا "خوجی"، ڈپٹی نذیر احمد کا "ظاہر دار بیگ"، پطرس بخاری کا "مرزا صاحب"، شفیق الرحمان کا "شیطان"، محمد خالد اختر کا "چچا عبدالباقی" اور مشتاق احمد یوسفی کا "مرزا عبد الودود" وغیرہ اس کی کام یاب مثالیں ہیں۔اُردو مزاحیہ شاعری میں مجید لاہوری نے "مولوی گل شیر خان اور ٹیوب جی تارُ جی" اور سیّد ضمیر جعفری نے "قیس" کو پے در پے مزاحیہ غزل کے اشعار میں استعمال کر کے انھیں بطور کردار متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن جان دار مزاحیہ کردار تخلیق نہ کر سکے۔

اشارے یا کنائے میں ایسی بات کرنا کہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھا دینا رمز کہلاتا ہے۔یہ حربہ بھی طنز و مزاح میں بہ کثرت استعمال ہوتا ہے۔رمز میں طنز و مزاح ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوتے ہیں تاہم طنز کا عنصر غالب ہوتا ہے۔غالب کا یہ شعر رمز کی عمدہ مثال ہے:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

مبالغہ کو اردو سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔سنجیدہ شاعری میں یہ حربہ بات میں زور پیدا کرنے کے لیے، جب کہ مزاحیہ شاعری میں مزاح پیدا کرنے کے لیے مستعمل ہے۔مبالغہ میں کسی چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کے بیان کر کے ہنسی کو تحریک دی جاتی ہے۔ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا یہ شعر دیکھیے:

وہ ہے سترہ کی اور میں ستر کا
پانچ مرلے کہاں کنال کہاں

تشبیہ و استعارہ مزاح کے اہم حربے ہیں۔تشبیہ کا لفظ "شبہ" سے نکلا ہے جس کا معنی ہے "مماثل ہونا"۔علم بیان کی رو سے کسی ایک شے کی کسی اچھی یا بری خصوصیت کو کسی دوسری شے کی اچھی یا بری خصوصیت کے مشابہ قرار دینا تشبیہ ہے۔لغوی معنوں میں استعارہ سے مراد "ادھار لینا" ہے۔شعری اصطلاح میں استعارہ وہ صفت ہے جس کے تحت کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں سے ہٹ کر کسی اور شے سے مشابہت کی وجہ سے اس کے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے۔سیّد عابد علی عابد رقم طراز ہیں:

"جن لوگوں نے ظرافت، بذلہ سنجی، طنز، ہجو اور متعلقہ اصنافِ ادب کا بدقتِ نظر مطالعہ کیا ہو وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے کہ ظرافت ہو کہ بذلہ سنجی، طنز ہو کہ ہجو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنف ایسی اشیا میں مشابہتیں دریافت کرتا ہے جو بہ ظاہر معلوم ہوتی ہوں یا

ایسی اشیا میں اختلافات کے پہلو ڈھونڈ کے دکھاتا ہے جہاں یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اختلاف کی کوئی صورت پیدا ہو گی۔[۱۰]

مزاح کے حربہ کے طور پر تشبیہ و استعارہ کا استعمال طنزیہ و مزاحیہ نظم و نثر میں عام ہے۔

رعایتِ لفظی ایک ایسا شاعرانہ عمل ہے جس میں کسی لفظ کی معنوی پہلو داری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر ایک نئی صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے۔"الفاظ کی رعایت سے پیدا کی جانے والی گفتگو رعایتِ لفظی ہے۔"[۱۱] رعایتِ لفظی ایہام ہی کی ایک قسم ہے جس میں کسی شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے جس کے دو مفہوم نکلتے ہوں اور ان مفاہیم کا بُعد ہی مزاح کا محرک بنتا ہے۔

اُردو میں "پیروڈی" کے لیے "تحریف" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔"ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر" کے مطابق الفاظ کی تبدیلی اور کمی بیشی، کسی فن پارے کے انداز و اسلوب کی نقل یا موضوع اور ہیئت کی نقل سے پیروڈی کی جا سکتی ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اس صنف میں جدت تو ہوتی ہے لیکن اوریجنل خیال یا اسلوب نہیں ہوتا۔اردو ادب کے آغاز ہی سے اس کے نقوش ملتے ہیں اور طنز و مزاح کے شعری و نثری سرمائے میں اس کی عمدہ مثالیں دستیاب ہیں۔

طنز و مزاح کی تخلیق کے لیے بنیادی طور پر یہی حربے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر طنز و مزاح کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔طنز تاریخی، اخلاقی، سماجی اور ادبی رجعت پسندی اور زوال پذیری پر ایسے انداز میں چوٹ کرتی ہے کہ ہنساتی بھی ہے اور حساس دلوں کو رُلاتی بھی ہے۔اچھی طنز اپنے معاشرے اور زمانے کی آئینہ دار ہوتی ہے جب کہ مزاح چٹکیاں لیتا، گدگدی کرتا خوش طبعی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ہنسی برائے ہنسی ہوتے ہوئے بھی مزاح کے سماجی کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے رِستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے اور دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بد مزہ زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے۔فی الوقت افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غم گسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔"[۱۲]

حوالہ جات

۱۔رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۳

۲۔Stephen Leacock Humour and Humanity, London , New Cheap Ed. Purnell and Sons1930, P11

۳۔علی عباس جلالپوری، مقاماتِ وارث شاہ، لاہور تخلیقات پبلشرز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۴

۴۔ خواجہ عبدالغفور، شگوفہ زار، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۲

۵۔رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، نئی دہلی، جامعہ مکتبہ، دوسری بار ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۱

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴۳

۷۔محمد طٰہٰ خان، پروفیسر، انٹرویو: راشد حمید، ڈاکٹر، مشمولہ: گفتگو نما، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۱

۸۔اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴

۹۔عابد علی عابد، سیّد، اسلوب، لاہور مجلسِ ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۲

۱۰۔عابد علی عابد، سیّد، البیان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۸۸

۱۱۔ محمد طٰہٰ خان، پروفیسر، قرینۂ شعری، پشاور، جدون پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵

۱۲۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۲، ۴۳

مشاعرے

ہماری ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہیں ان مشاعروں کے ذریعے ہی آجکل اردو زبان بہت تیزی سے پھل پھول رہی ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ مشاعروں کو سب سے پہلے سمجھا جائے۔ یہ مشاعرے اصل میں ہیں کیا یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے شاعر اپنا تازہ کلام سناتے ہیں اور سامعین و اپنے ہم عصروں سے داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم اپنے اشعار کو نہ صرف ادب کی کسوٹی پر بلکہ سامعین کے مزاج کے اعتبار سے پرکھتے ہیں۔ یہ داد و تحسین الفاظ کے انتخاب تشبیہات کے سلیقے استعارات کے حسن اور تخیل کی بلندی کے علاوہ ادائیگی، لب و لہجہ و تلفظ کے ساتھ شاعری کے اوزان کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ اب مشاعروں کا یہ معیار بدل رہا ہے۔ اب نہ تو داد و تحسین میں بیشتر وہ سچائی ہے اور نہ اشعار میں اب وہ گہرائی، ویسے بھی مشاعروں کے اشعار اور رسائل و جرائد میں چھپنے والی شاعری یکسر مختلف ہے۔ آجکل مشاعروں میں ان اشعار کو ہی پسند کیا جا رہا ہے جو کے حسن و عشق یا مذہبی جذبات کو ہوا دینے کے لئے لکھے جا رہے ہیں جو مسلم شعراء کی جانب سے سندِ وفاداری بن جاتے ہیں۔

ہمارے ان ادبی مشاعروں کا ایک اور اہم حصہ ہیں شاعرات۔ مشاعرہ اور شاعرات اب لازم و ملزوم ہیں اب تو حالت یہ ہے کہ جب تک مشاعرے کے اسٹیج پر شاعرہ نہ ہو تب تک مشاعرے کا اسٹیج ایک بیوہ کی مانگ کی طرح سونا بن جاتا ہے۔ اور اس پر ستم یہ کہ ترنم سے پڑھنے والی بہترین آواز کی مالک کم سن شاعرہ، ایسا مشاعرہ اب مظاہرہ ہیں یہاں نہ تو اب ادبی روایات کا عمل دخل بچا ہے اور نہ ہی بزرگوں اور استادوں کی شایان شان آداب۔ زندگی کی اس تیز رفتاری کے ہمارے مشاعروں کے اسٹیج کو بہت ہی پریکٹیکل اور پروفیشنل بنا دیا ہے یہاں عام طور سے ایک ہی غزل کو پچاسیوں مرتبہ تازہ کلام کے عنوان سے یعنی نئی پیکنگ میں سنا دیا جاتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ داد و تحسین بھی کہہ کر تالیوں کی شکل میں مانگی جاتی ہے اور شاعر جب تک اسٹیج چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے منہ سے خود اپنے اشعار پر تالیاں نہ مانگ لیں۔

ذکر خانساماؤں کا

پڈنگ بناتے بناتے انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ ''میں نے بارہ سال انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں اس لئے اکڑوں بیٹھ کر چولہا نہیں جھونکوں گا'' مجبوراً کھڑے ہوکر پکانے کا چولہا بنوایا۔ ان کے بعد جو خانساماں آیا اس نے کہا ''میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا برادے کی انگیٹھی پر'' چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی۔ تیسرے کے لئے چکنی مٹی کا چولہا بنوانا پڑا۔ چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا خریدا اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولہے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔

اُس ظالم کا نام نہیں یاد آ رہا البتہ صورت اور خدوخال اب تک یاد ہیں، ابتدائے ملازمت سے ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا بلکہ پابندی سے ملباری ہوٹل میں اکڑوں بیٹھ کر دو پیسے کی چٹ پٹی دال اور ایک آنے کی تندوری روٹی کھاتا ہے۔ آخر ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے ذرا سختی سے ٹوکا کہ گھر کا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ تنک کر بولا ''صاحب! ہاتھ بیچا ہے زبان نہیں بیچی''

مشتاق احمد یوسفی

آج کل اکثر نام نہاد شاعرات کے ساتھ یہ معاملہ الگ ہے۔ ان کو داد و تحسین ملتی ہے مگر ان کی پرفارمینس سے زیادہ ظاہری زیبائش پر۔ ان میں بیشتر تعداد ان شاعرات کی ہے جو اردو میں ایک لفظ نہیں لکھ سکتیں آج مشاعروں میں سینئر شاعرات کی صفِ اوّل میں دکھائی دیتی ہیں اور ان کا ترنم ان کی تمام تر خامیوں کی چشم پوشی کر دیتا ہے۔

میں یہاں یہ بات بھی بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کے ہاتھ میں شاعری کا اسکرپٹ (اشعار) ہندی یا رومن میں لکھے دکھائی دیتے ہیں اور وہ بہت فخر سے اُردو کے مشاعرے پڑھتی ہیں۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایک شعر اپنے نام کے ساتھ لکھ دو تو وہ بغلیں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں یقیناً آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے ان میں بہت سے شعرائے کرام کے نام بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی اُردو زبان کا دم بھرنے والے اور اُردو زبان کی روٹی کھانے والے یہ لوگ آخر کس اینگل سے اُردو زبان کی ترقی کر رہے ہیں۔

مشاعروں میں اکثر شاعرات کا تو یہ عالم ہے کہ ان کے استاد نے غزل لکھ دی اور انہوں نے پڑھ دی اور آدھا پیسہ ادھر اور آدھا پیسہ اُدھر، اُدھر اس کے علاوہ داد بھی ان ہی شاعرات کو ملتی ہے جو کہ ہمارے خیمے کی ہیں اگر دوسرے خیمے کی شاعرہ نے اسٹیج پر اپنی محنت سے کہی ہوئی کتنی ہی اچھی غزل کیوں نہ کہی ہو مجال ہے جو ذرا بھی کسی کی توجہ نصیب ہوجائے۔ اس طرح سے مشاعرہ فکسنگ کی بھی ایک نئی روایت شروع ہوچکی ہے۔ میں نے اکثر مشاعروں میں دیکھا ہے کہ ہمارے شاعر حضرات ان خواتین کو نشانہ بناتے ہوئے سنجیدہ، رنجیدہ اور خندیدہ اشعار میں ذکر کرتے ہیں کہ جو خواتین شاعری کی بحر سے بھی واقف نہیں ہیں وہ بیرون ممالک کا سفر کر رہی ہیں یا اچھے ترنم سے کامیابی حاصل کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ میں یہاں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ اکثر شاعر حضرات اِن کو خود کلام لکھ کر دیتے ہیں اور مشاعروں میں ان کا نام دیتے ہیں اور ان کو خود ہی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتی ہوں۔ محفل صنم کی جانب سے ۱۰ فروری ۲۰۱۷ء کو جناب معروف رائے بریلوی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اگلے دن یعنی ۱۱ فروری ۲۰۱۷ء کو جشن ثروت جمال تھا اور جناب معروف صاحب اس مشاعرے کی نظامت اور شرکت کیلئے ہی دہلی آئے تھے۔ میں نے بھی اس پروگرام میں بطور سامع شرکت کی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہی اشعار اس مشاعرے میں تازہ کلام کے عنوان سے سنے جو میری نشست میں پڑھے جاچکے تھے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے اس میں حیرت کی کیا بات ہے ۔۔۔ ہے جناب کیونکہ اشعار وہی تھے مگر کہنے یا پڑھنے والے حضرات جدا تھے یعنی میں نے تین ایسے اشعار کی نشاندہی کی جو ایک دن پہلے میرے یہاں نشست میں دوسرے شاعر حضرات نے پڑھے اور جشن ثروت جمال میں دوسرے شعراء نے مگر کلام ایک ہی

تھا۔اسی لئے میں نے ان لوگوں کوادبی ٹھگ کا نام دیا ہے ایک تو پرانا کلام نئے عنوان سے اور پھر ستم دیکھو وہ ان کا کلام بھی نہیں، سامعین سے داد و تحسین کی طلب ایسی کہ پوچھو مت۔ یہ لوگ ادب کے نام پر سامعین کا وقت،ان کا ادب کے لئے شوق سب ہی کچھ ٹھگ ہی رہے ہیں۔

ابھی بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی ہے میرا ذریعۂ معاش درس وتدریس سے وابستہ ہے یہ واقعہ ہے تقریباً ۲فروری ۲۰۱۷ء کا میں نے اپنے اسکول کے گراؤنڈ میں ایک صاحب کو دیکھا اور چونک گئی،ان سے آنے کا سبب پوچھا۔انہوں نے مجھے ایک لفافہ دکھایا اور کہا کہ اس میں اُردو اکادمی کا خط ہے جو میرا دعوت نامہ ہے،لال قلعے کا مشاعرہ پڑھنے کے لئے۔ میں نے ان کو مبارکباد دی اور کہا جناب یہ تواچھی بات ہے مگر یہاں آنے کا سبب تو بتائیں وہ بولے مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ اس خط کے حساب سے مجھے لال قلعے کا مشاعرہ پڑھنا ہے اور ۱۶،۰۰۰روپے بطورِ نذرانہ ملیں گے اس کے علاوہ کیا لکھا ہے مجھے نہیں معلوم اور اس کا جواب اُردو میں دینا ہے اس لئے آیا ہوں کہ کوئی اُردو میں اس کا جواب لکھ دے اور اس خط کا پورا مضمون مجھے پڑھ کر بتا دے۔ میں نے دریافت کیا کہ جناب یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ آپ کو اُردو لکھنی پڑھنی نہیں آتی اور آپ شاعری کیسے کرتے ہیں۔ وہ بولے میرے لئے اُردو زبان کے حروف تہجی کالا اکشر بھینس برابر ہے۔۔۔ہندی میں لکھتا ہوں، کام چل رہا ہے۔ بس اس خط کا جواب لکھوا دیں میں جلدی میں ہوں۔

اس واقعہ کے بعد دل چاہا کہ ان لوگوں کی ان حرکتوں کے لئے قلم اٹھایا جائے اور سب کے سامنے یہ واقعات لانا نہایت ضروری ہیں اور قابل غور بات یہ ہے کہ ہماری اردو اکادمی کے پاس اردو زبان میں لکھنے پڑھنے والوں کا کتنا فقدان ہے کبھی تو یہاں کوئی دکھائی دیتے ہیں اور دہلی کی نمائندگی کرنے کے لئے ایسے شاعر جو اردو زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ کیا ہم کو اپنی اردو اکادمی کا نام تبدیل کر دینا چاہیئے۔

اردو زبان کے نام پر یہ ادبی ٹھگی کب تک چلتی رہے گی اور

ایک زمانے میں وہابی بھی اچھی خاصی گالی تھی۔صوبۂ سرحد کے ایک مولوی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک ہندو دکاندار گھسیٹامل سے ناراض ہو گئے تو کہہ دیا کہ گھسیٹامل ''وہابی'' ہے اس لئے کوئی شخص اس سے لین دین نہ رکھے۔ گھسیٹامل کو معلوم ہوا تو مولوی کے قدموں پر آ گرا۔ اب کے مولوی صاحب نے وعظ کیا تو اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ گھسیٹامل نے ''وہابیت'' سے توبہ کر لی ہے۔

حرف وحکایت از چراغ حسن حسرت

ہم فخر سے ان مشاعروں کو زبان کی ترقی اور کامیابی کا ضامن قرار دیتے رہیں گے۔حالانکہ میرے یہ تجربات بہت سے نام نہاد ادب نواز لوگوں کو ناگوار گزر سکتے ہیں مگر زبان خاموش رہ سکتی ہے قلم نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مشاعروں میں چند جو نام نہاد شاعرات ہیں ان کے اشعار احساس اور جذبات سے یکسر خالی ہیں صرف ان کے تصنع ،سنگھار کو ہی مدنظر رکھ کر نہ صرف مشاعروں میں بلایا جاتا ہے بلکہ بہت وقت تک عوام کو روکے رکھنے کا سبب بھی قرار دیا جاتا ہے اس لئے ایسی شاعرات مشاعروں کے لئے ضروری قرار دی جاتی ہیں۔

یہ ادبی ٹھگی کب تک چلے گی ان کے ذمے دار کون ہیں؟ کون ہیں ادب کے وہ ٹھیکیدار، جو ادب کے مزدوروں سے انکی کمائی کی کمیشن کھانے کے لئے ایسی نا زیبا حرکتیں کر کے ان مشاعروں کا معیار و وقار تباہ کر رہے ہیں۔خدارا اپنی زبان اور تہذیب کو ان ادبی ٹھگوں سے محفوظ کرلو ورنہ آنے والی نسلیں نہ ہم کو معاف کریں گی اور نہ ہم ان کو زبان کی بدحالی کے لئے ذمے دار قرار دے پائیں گے۔

پطرس بخاری

مریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات کا تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات کو ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا، غبن کا الزام لگا، ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں شائستہ سے شائستہ دوزمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا، کہ اُن پر پنچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں، میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ اعلان کر چکا ہوں، اور اب میں بہانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دو ایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس

کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا احمق ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے، زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا چنانچہ میں نے مشغلۂ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بیحد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے، بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے پھر مقامی اخبار کے بیحد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام "مرید پور گزٹ" ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں، دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔ رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاء پردازی، صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھ کو مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ میں نیا پنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں میں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا، بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے بھی بر سبیلِ تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اُس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی، بہر حال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز، ایک کرسی اور گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ دمہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کیلئے بیتاب ہیں۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذاتِ بابرکات کی از حد ضرورت ہے لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ "خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر" اِسی طرح کی تین چار براہین قطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بے حسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بیچاروں کی بہبود اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔

مرزا صاحب بچّوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا سخت ناپسند تھا۔ حالانکہ ان کی بیگم سمجھاتیں کہ مسلمان بچّے ہیں، آپس میں نہیں لڑیں گے تو کیا غیروں سے لڑیں گے۔ ایک روز ہم لڑ رہے تھے، بلکہ یوں سمجھیں رونے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ یوں بھی رونا بچّوں کی لڑائی کا ٹریڈ مارک ہے۔ اِتنے میں مرزا صاحب آ گئے۔

''کیوں لڑ رہے ہو''

ہم چپ! کیونکہ لڑتے لڑتے ہمیں بھول گیا تھا کہ کیوں لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں خاموش دیکھا تو دھاڑے ''چلو گلے لگ کر صلح کرو!'' وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ ہم ڈر کے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اس بار جب میں نے لوگوں کو عید ملتے دیکھا تو یہی سمجھا کہ یہ سب لوگ بھی ہماری طرح صلح کر رہے ہیں۔

افرا تفریح از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزار ہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اُٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لئے ماحضر لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی، کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا، اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا، طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

''ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔''

''ہندو مسلم شیر و شکر ہیں۔''

''ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔''

''جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا، وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنھوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔''

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں ''سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا'' والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا، کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی، جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا، تقریر کا آغاز سوچا۔ سوچا اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ:

''پیارے ہم وطنو!''

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایہ ناز شاعر یعنی الطاف حسین حالؔی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلمبند کئے تھے، اُس کو کیا معلوم تھا، کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کے المناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اِس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا، افلاس، غربت، بُغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا، کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا، جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت، آب وہوا، مغربی تہذیب۔ لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا، اور پھر اصل وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے، آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو

اس شعر پر ختم کروں گا کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنایا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا،

(۱) تمہید اشعار حالی۔ (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو۔)
(۲) ہندوستان کی موجودہ حالت۔
(الف) افلاس
(ب) بغض
(ج) قومی رہنماؤں کی خودغرضی
(۳) اس کی وجہ۔
کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں۔
کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں۔
کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔
تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ، جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو۔)
(۴) پھر بتاؤ، کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔
(نعروں کے لیے وقفہ۔)
اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔
(اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں، ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ۔)
(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصیات اتحاد کی تلقین، شعر
(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)

اس خاکے کے تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ نمبر ۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں آواز سب تک پہنچ سکے اور سب اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ہار پہنائے۔ اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے، انہوں نے کہا، ''سر باہر نکالئے، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار میرے گلے میں تھے۔ ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا، مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا۔ اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف پایا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے، تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا تا رہا تھا۔ دائیں بائیں، سرخ سرخ جھنڈیوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ ''مثلاً ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔'' ''مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔'' ''ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔''

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا صدرِ جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:

''حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج جلسے میں تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔۔۔''

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی

محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں ہیں گھبراؤ نہیں رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا، دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا، ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کردوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا، صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

''۔۔۔مرید پور کا شہران پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کی ذات نوع انسان کے لئے۔۔۔''

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس سے پہلے یہ بتانا ہے، کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا، جاہل کہنا چاہیئے، یہ ٹھیک نہیں، غیر مہذب۔

''ان کی اعلیٰ سیاست دانی، ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں، لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے۔۔۔''

ہاں وہ تقریر کاہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں، لیکن وہ تو آخر میں ہیں، وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ آپ کے دل ہلا دیں گے، اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے۔۔۔''

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی اتنے میں صدر نے مجھ سے کچھ کہا مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں شور تھا، میں بیہوشی سے ذرا ہی دور تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی بیان کرنی ہے۔ اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی بگلے اور لومڑی کی کہانی۔ نہیں ٹھیک ہے دوبیل۔۔۔''

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا، وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میز بھاگنے کو ہے۔ اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی، گلا خشک تھا، بصد مشکل میں نے یہ کہا۔

''پیارے ہم وطنو!''

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی، اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا۔

خربوزے

عملی زندگی میں کئی سال لگاتار ''جھک'' مارنے کے بعد ہم بالآخر اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صورتحال خواہ کچھ بھی ہو، خربوزے، بیوی اور ڈرائیور کی کبھی تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ یہ تینوں لوگ تعریف سنتے ہی ''چوڑ'' ہو جاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ہم نے چند روز پہلے خربوزے کو اپنے کالمانہ قصیدے کا موضوع بنایا۔ ہمارا خیال تھا کہ اِس حوصلہ افزائی کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور یہ سلسلۂ مٹھاس یونہی جاری وساری رہے گا مگر یقین کیجئے، وہ دن اور آج کا دن، مذکورہ کالم چھپتے ہی یہ ''سبزی نما پھل'' اپنا اصلی رنگ جمانے لگا۔ آج کل جس قماش کے خربوزے آرہے ہیں اس سے کم از کم ہمیں تو یہی گمان گزرتا ہے کہ جیسے پورے ملک کو شوگر ہو گئی ہے اور ہمارے کسان اور زمیندار بھائی انتہائی حکیمانہ طور پر محتاط کاشتکاری کر رہے ہیں۔

خربوزے از آفتاب اقبال

''پیارے ہم وطنو!''

اس کے بعد ذرا دم لیا، اور پھر کہا، کہ:

''پیارے ہم وطنو!''

کچھ نہ آیا، کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ سینکڑوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں، لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

''پیارے ہم وطنو!''

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا، کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا، ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں، تو پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔

''پیارے ہم وطنوں! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے، کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں۔۔۔ سمجھے آپ؟ (وقفہ۔۔۔) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نیا شارہ کیا ہے گویا چنداں صحیح نہیں۔'' (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی، اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

''ہاں تو بات دراصل یہ ہے، کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے، جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔'' (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا، کہ کلام کچھ بیربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

''مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجئے لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں، اس لئے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھئے نا۔ کہ اگر۔'' (بلند اور طویل قہقہہ)

''حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔ (قہقہے اور شور وغوغا۔۔۔ اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے ہیں۔)

شیخ سعدی نے کہا ہے۔ کہ:

چو از قوم یکے بیدانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے۔) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔

بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے دل پکار میں چلاؤں ہائے گل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:

''جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں، ان کی زندگیاں لوگوں کے لئے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چار دانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی۔) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خودغرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے، کہ زندگی کے وہ تمام شعبے۔۔۔''

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آگریں، لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

''حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے! تم دو بیل ہو۔۔۔''

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی، تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا، اور زقند بھر کے دروازے میں باہر کا رخ کیا، ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا، ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی میں بے تحاشہ اس میں گھس گیا، ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اُس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے نہ مجھے خود وہاں جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

سیّد عارف مصطفیٰ

کراچی کا جغرافیہ

روشنیوں کا شہر کہتے ہی پہلے جو شہر ذہن میں آتا تھا اسے کراچی کہا جاتا تھا لیکن اب کراچی کا نام سنتے ہی ذہن کی پہلے سے جلتی بتیاں بھی بجھنے لگتی ہیں، پھر اب تو پاکستان میں کئی شہر اور بھی ایسے ہیں کہ جہاں بہت ڈھیر سی بتیاں جلنے لگی ہیں اور یوں ان بتیوں کو دیکھنے کے لئے کم ہی لوگ کراچی کا رخ کرتے ہیں، ہاں البتہ بیشمار ایمبولینسوں کی گھومتی بتیوں کو شریک مقابلہ کرلیا جائے تو یہ اب بھی سب سے آگے ہے۔ جیسا کہ عرض کیا کہ اب کراچی کا نام آتے ہی ذہن میں کچھ بھی نہیں آتا بس ایک سناٹا سا گونجتا اور اندھیرا سا چھا جاتا ہے، لیکن اِس کی وجہ لوڈ شیڈنگ کم اور بلڈ شیڈنگ زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔

اِس شہر میں اب کام کرنے کے لئے آنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے اور کام دکھانے والوں کا شمار دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے، اِسی وجہ سے یہاں سے جانے والے تابوتوں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی ہر سال چند سر پھرے سر سے کفن باندھ کر یہاں کو دہی پڑتے ہیں اور اِن میں سے کئی کے سر سے بندھا کفن ہی ان کے کام بھی آجاتا ہے۔۔ لیکن اگر آپ ان میں سے ہیں جو محض سیر سپاٹے کے لئے اِس عروس البلاد میں آن پہنچے ہیں تو مناسب ہے کہ میں بطور گائیڈ آپ کے ساتھ ہولوں تا کہ اگر آپ مارے جائیں تو کوئی تو ہو جو فوری طور پہ آپ کے لواحقین کو مستند اور فوری اطلاع فراہم کرسکے۔ رہی میرے تحفظ کی بات تو خطرہ تو میرے لئے بھی ہے لیکن روز روز کے خطرات نے اسے میرے لئے معمول کی بات بنادیا ہے اور اگر کسی روز اخبار کسی ''ٹارگٹ کلنگ'' کی خبروں سے خالی ہو تو لگتا ہے کہ اخبار نہیں کوئی علمی مقالہ پڑھ رہا ہوں۔

کراچی کے سلسلے میں پہلے تو یہ جان رکھیئے کہ اس شہر میں گھومنے پھرنے کے آداب اور قرینے کل عالم سے مختلف ہیں اور اُنہیں سمجھنا بیحد ضروری ہے، مثلاً یہ کہ دوسرے مہذب شہروں کی طرح یہاں فٹ پاتھ پہ چلنے پہ اصرار مت کیجئے گا کیونکہ فٹ پاتھ نظر ہی نہیں آئے گا۔ ظاہری بات ہے کہ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ محض آپ کو فٹ پاتھ دکھانے کے لیئے دکاندار کئی گھنٹے لگا کر اپنی دکان کا زیادہ تر سامان وہاں سے اٹھا لے، کہیں کچھ فٹ پاتھ پڑا مل بھی گیا تو وہاں اِتنے فقیر پڑے ملیں گے کہ اگر سب کو دینے میں لگ گئے تو آخر میں خود بھی وہیں بیٹھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ گویا اوّل تو چلنے کی جگہ ہی نہیں ملے گی لیکن مل بھی گئی تو کئی پتھاروں کو پامال کرجائیں گے اور نتیجتاً کسی پتھاریدار کے ہاتھوں خود بھی روندے جائیں گے۔ دوسرے یہ بھی پلے باندھ لیجئے کہ چلتے ہوئے اِدھر اُدھر

دیکھنے کے بجائے نگاہ نیچی رکھ کر چلئے، یوں کسی کھلے گٹر میں غرقابی سے بھی بچیں گے اور اہلِ تقویٰ میں الگ گنے جائیں گے، اگر کسی سے کوئی پتا پوچھنا ہو تو برابر کا امکان ہے کہ اپنا پتا بھی کھو بیٹھیں، ویسے یہاں کے زیادہ تر باسیوں سے پتا پوچھنے میں کامیابی بھی معمولی بات نہیں، اگر عین شان پلازہ کے نیچے کسی بندے سے شان پلازہ کی بابت پوچھیں گے تو پورا امکان یہ ہے کہ وہ پورے اعتماد سے آپ کو گلی کے آخری سرے پہ دور کھڑے کسی باخبر آدمی کی طرف بھیج دے گا کہ اِس سے پوچھ لیں اور خاصا امکان ہے کہ وہ ''باخبر'' بھی شان پلازہ کا نام سنتے ہی بہت حیران سا دکھائی دے گا کہ آخر یہ بلڈنگ کب بنی۔

یہ بات جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ کراچی پلازوں کا شہر ہے اور یہاں خلوص اور مروت بھی کنکریٹ کے تلے دبے رہتے ہیں۔ کسی سے بے وجہ یونہی ملنے چلے جائیں تو وہ خوش ہونے کی خود سے کوئی کوشش نہیں کرے گا، بس اندھا دھند سٹپٹا جائے گا کیونکہ یہی ایک کام کرنے میں اِس شہر کے لوگوں کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ یہاں مہمان کی آمد پر کئی میزبان گھر سے باہر جانے لگتے ہیں۔ مہمان کے آنے پہ بتیسی دکھانے پھرتی کراکری دکھانے کو آدابِ مہمانداری کا لازمی حصہ گردانا جاتا ہے۔ بار بار دستی گھڑی دیکھنا بھی انہی آداب کا حصہ ہے۔ مہمان پھر بھی نہ سمجھے تو شہر میں اچانک حالات کی خرابی کی کسی افواہ کا ذکر بہت مجرب خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے موقع پہ چہرے پہ تھوڑی سی ہوائیاں نمودار کرنا اور لہجے میں مہمان کی واپسی کے حوالے سے سلامتی سے متعلق تشویش کا مناسب مقدار میں اظہار کرنا، ان تشویشی رسومات کا ناگزیر حصہ ہے اور فوری طور پہ مطلوبہ عملی نتائج مرتب کرتا ہے۔

اگر آپ کھانے کا ذوق رکھتے ہیں تو کراچی آپ ہی کے لئے ہے کیونکہ کھانے کے لئے یہاں دھکے اور غم کے علاوہ بھی کافی کچھ ہے۔ جہاں تک ڈکار انگیز کھانے کی بات ہے تو یہاں وہ بھی وافر طور پہ ہر وقت میسر رہتا ہے۔ یہ ایک وقت کے کھانے کے لئے کہیں ۵۰ روپے بھی زیادہ ہیں تو کہیں ۵ ہزار روپے بھی کم ہیں۔

یہ الگ بات کہ ۵۰ روپے میں آپ عوامی صحتمند کھانا کھائیں گے جبکہ ۵۰۰۰ میں ابلا ہوا روکھا پھیکا سا ''وی آئی پی'' سا 'زیرِ علاج' طعام نگلیں گے۔ یہاں کے خاص کھانے متعدد ہیں لیکن کراچی کی خاص ڈش ''نہاری'' ہے، ہر دوسرے ہوٹل پہ لکھا ملتا ہے ''دلی کی خاص نہاری'' لیکن انہیں کھا کر جی چاہتا ہے کہ ''دلی کی عام نہاری'' کو ڈھونڈا جائے۔ کہیں یہ پانی میں نہا رہی ہوتی ہے تو کہیں مرچوں میں، اِس کا لیس عموماً ہوٹل کی سوکھی روٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے، یوں یہ واحد ڈش ہے کہ جس میں روٹی اور سالن ایک ہی پلیٹ میں یکجان دستیاب ہوتے ہیں۔ اِس کو کھاتے ہوئے ناک اور منہ سے بہت شوں شوں ہوتا ہے اس لئے پلیٹ ناک کی سیدھ میں نہیں رکھنی چاہیئے ورنہ نہاری ختم ہوتے بہت دیر لگتی ہے۔ کراچی کے ہوٹلوں کی ایک خاص بات یہاں کی گریبی ہے۔ یہ مزید اضافی سالن کی اس مقدار کو کہتے ہیں جو روٹی ختم کرنے کے لئے مفت میں عندالطلب ملتی ہے اور رش والے ہوٹلوں میں بار بار ملتی ہے، بس۔۔۔ ہر بار نئے بیرے سے التماس کرنا پڑتا ہے، لہٰذا اگر تین چار دوست ایک ساتھ ایسے مصروف ہوٹل میں جائیں تو ایک پلیٹ سالن منگوانا ہی کافی رہتی ہے، باقی بھوجن تو نصف درجن گریبیاں ہی سہار لیتی ہیں۔ نہاری ویسے تو اپنے نام کی طرح صبح کھانے کی ڈش ہے لیکن چونکہ بڑے شہروں میں اب ''صبح'' شام سے ذرا پہلے ہی اترتی ہے، چنانچہ نہاری وقت کی قید سے کب کی آزاد ہو چلی۔ اگر اب کوئی صبح نہاری کھانے کسی ہوٹل میں جائے گا تو کسی خاکروب کے ساتھ فرش پہ بیٹھ کر اِس کا رات کا سالن شیئر کرتا پایا جائے گا۔

کراچی کی دوسری مشہور ڈش یہاں کا حلیم ہے۔ اِس کی خاص بات اِس کا ریشہ ہے، گویا طبعاً بزرگانہ سی ڈش ہے۔ دوکانوں پہ ملنے والی حلیم کا ریشہ اکثر روئی کی ریشہ دوانی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کسی کے گھر میں اگر چند پرانے گدے اور لحاف ہیں تو وہ بخوبی اس کاروبار کی ابتداء کر سکتا ہے۔ کراچی میں اسے گلی محلے میں مل جل کر پکانے اور لڑ لڑ کر بانٹنے کی روایت بہت مستحکم ہے۔ عموماً لڑائی چند ''مخصوص'' گھروں پہ ہوتی ہے کہ وہاں حلیم دینے کون

جائے گا۔ حلیم عموماً چندے سے پکایا جاتا ہے جو کبھی پورا پڑتے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ جادوئی فارمولے کے تحت جو جتنا کم چندہ دیتا ہے، بوقت تقسیم وہی گھر کا سب سے بڑا یعنی نہانے کا پتیلا مانجھ کر اٹھائے حاضر ہوجاتا ہے۔ حلیم کی عمدہ پکائی کا انحصار اس کی گھٹائی پہ ہے جو عموماً اس کے گھوٹنے والے آلے "گھٹنا" کی مدد سے کی جاتی ہے اور یہ کام کرنے والے زیادہ تر وہ لڑکے بالے ہوتے ہیں جو اس گھٹنے کے ہی سائز کے ہوتے ہیں اور اسے گھوٹتے ہوئے لٹک لٹک جاتے ہیں۔ گھر میں ہل کر خود پانی بھی نہ پینے والے لاڈلے اینٹوں سے بنے چولہوں میں آگ سلگانے کے لئے جب بے تحاشا پھونکیں مارتے اور آنکھیں لال کرتے ہیں تو اقبال یاد آتے ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

حلیم پکانے کے لئے درکار سامان میں دالیں، گندم، گوشت اور گھی تیل کے علاوہ تاش کی گڈی، لوڈو، میوزک پلیئر اور پان، گٹکے ماوا و مین پوری کی کئی درجن پڑیاں شامل ہیں۔ خواہ دال، گندم گوشت یا گھی تیل کم رہ جائے لیکن باقی دیگر میں کمی نہ ہونے کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ چونکہ حلیم کی تیاری کے دوران بہت لڑائیاں ہوتی ہیں اس لئے حلیم پک جانے کے بعد اگر اس میں گوشت وافر معلوم ہو تو احتیاطاً اسے گھوٹنے والے لڑکوں کو پھر سے گن لیا جاتا ہے۔

کراچی ایک جہانِ حیرت ہے۔ بہت لمبا چوڑا شہر ہے۔ اب تک اس کی حدود کا یقینی و مستند تعین صرف اسی سبب نہیں ہوسکا ہے کیونکہ جیسے ہی اس کی نپائی مکمل ہو کر نقشہ چھپنے کو جاتا ہے، یہ شہر اس سے کئی میل اور آگے کو سرک جاتا ہے۔ اس قدر طویل ہے کہ ایک سرے سے چلنے والا دوسرے سرے تک پہنچنے سے پہلے کئی بار اپنی منزل بھول بھول جاتا ہے اور بسا اوقات اہلِ خانہ سے فون کر کے مدد لیتا ہے۔ بعضے تو یہ تک کہتے سنے گئے ہیں کہ اس کے ایک کنارے اور دوسرے کنارے والوں کے سحر و افطار کے اوقات یکساں ہونا بہت مشکوک معاملہ ہے اور احتیاطاً دو سے تین منٹ کی تاخیر کر لی جائے تو یہ احتیاط عین قرین تقویٰ ہوگی۔ کراچی کے

باربی
(ایک لڑک)

اُس کو کوہِ قاف سے بھٹکی پری سمجھا تھا میں
اور اُس کی سب بہاریں سرمدی سمجھا تھا میں
کل کو خوبانی تھی جو
آج خربوزہ ہے وہ
اب ہنسی آتی ہے کس کو باربی سمجھا تھا میں

نوید ظفر کیانی

اکثر علاقے اس جہانِ حیرت کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں، لالوکھیت میں نہ ہی لالو ہے نہ کوئی کھیت، ڈاکخانہ اسٹاپ پہ ڈاکخانہ لاپتا ہے۔ نیوکراچی کا مشہور سندھی ہوٹل مرحوم ہوئے عرصہ گزرا اور ناظم آباد پیٹرول پمپ کے پچپن سے ساٹھ سال پرانے اسٹاپ پر پیٹرول پمپ ندارد ہوئے زمانہ بیتا۔ اہل رنچھوڑ لائن جب باافراط کنگلے تھے تب وہاں اک لکھ پتی ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں کنگلے کم اور لکھ پتی زیادہ ہیں، لیکن لکھ پتی ہوٹل غائب ہے۔ اس کا نام اب بس اسٹاپ کی صورت ہی زندہ ہے لہٰذا اتنے وافر مغالطوں کی موجودگی میں بھی اگر آپ غرباء کو نیاز بانٹنے غریب آباد جا رہے ہیں یا شرفاء سے ملاقات کے لئے شریف آباد کا رخ کیا ہے تو بہتر ہے کہ اپنے ارادے پہ نظرِ ثانی فرمالیں۔ کبھی یہاں ایک بازارِ حسن بھی ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کی بوسیدہ بالکنیوں میں دھری جھریوں سے اَٹی بوڑھی فاختائیں دیکھ کر سویا ہوا تقویٰ جاگ اٹھتا ہے۔ یہاں کا جوڑیا بازار غلے کی خریداری کا سب سے بڑا مرکز ہے کہ جہاں آج بھی انسان اور جانور باربرداری کے لئے برابر سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسی مساوات کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اس کے تنگ اور پر پیچ راستوں میں سے گزرتے ہوئے کسی سامان بردار گدھے کو دیکھیں تو آپ اسے اپنے سے زیادہ ہوشیار پائیں گے۔ ایک چور بازار بھی ہے، لیکن یہاں اس کے نام کی وجہ، چوری کی اشیاء کی فروخت کم اور خریدار کے جیب سے مال کی چوری کرنا زیادہ ہے۔ یہاں کے اکثر دکاندار بھی بازار کے نام کی مانند جید مشکوک معلوم ہوتے ہیں۔

کراچی کی پاکستان میں زیادہ اہمیت اس کے سمندر کی وجہ سے ہے ورنہ تعلیم وتہذیب سے تو کبھی کی جان چھوٹ چکی۔ اس فیاض سمندر نے بڑے بڑے معاشقوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ یہاں پہ آنے والے اکثر پریمی بار بار یہاں آتے ہیں اور اکثر جوڑوں میں دونوں میں سے ایک پرانے والا نہیں ہوتا۔ لڑکے لڑکی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اُفق کے پار جانے کا پیاں باندھتے ہیں لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہاں دو الگ الگ اونٹوں پہ بیٹھے اجنبی سے بنے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑوں کے لئے نکاح نامہ ساتھ رکھنا اور بنا شادی شدہ جوڑوں کے لئے بٹوہ ساتھ رکھنا یہاں کے سمندری قوانین کا حصہ ہے۔ ادھر پولیس آنے جانے والوں کے منہ باقاعدگی سے سونگھتی رہتی ہے۔ منہ سے جس مشروب کی بو آئے، اُسی کی قیمت کا تاوان بھرنا لازم ہے۔ جو لوگ صرف پانی پی کر اپنا منہ سنگھانے آجاتے ہیں، پولیس انہیں پانی پانی کر دیتی ہے۔ عالمی ماہرین یہاں کے سمندری ساحلوں میں بڑھتی ہوئی آلودگی پہ اکثر بہت تشویش کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اس آلودگی کی وجہ محض سی ویو اور ہاکس بے پہ ہونے والی آلودہ سرگرمیاں ہی نہیں ہیں بلکہ شہر کے بہت سے لوگ بھی ماہانہ و سالانہ صرف یہیں آکر نہانے پہ بضد رہتے ہیں۔

جہاں تک بات کراچی کی اہمیت کی ہے یہ پہلے معاشی حب کہلاتا تھا اب بدمعاشی کا حب ہے، جو اس حققت کے آگے سر نہ جھکائے، اُس کی منزل حب ڈیم ہے۔ یہاں بدمعاشی کرنیوالے عام طور پہ تیس سے چالیس کلو سے زیادہ کے نہیں ہوتے اور پستول کو ایک ہاتھ سے تھام کر چلانے میں اُن کی کلائی اتر اتر جاتی ہے۔ بات اگر کلاشکوف کی ہو تو کم از کم دو لڑکے درکار ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا لڑکا مددگار ہوتا ہے اور کلاشنکوف چلانے والے کی کلائی اور پتلون تھامنے میں مدد کرتا ہے۔ ایسے لوگ جب کہیں بھتہ مانگنے جاتے ہیں تو پستول نہ دکھانے پہ بھی اُن کی صحت دیکھ کر خدا ترس لوگ پہلے سے ہی الگ کر کے رکھی ہوئی کچھ خیرات زکوٰۃ اور صدقات اُن کے سپرد کر دیتے ہیں، تاہم اب خدا خوفی کی جگہ اسلحہ خوفی نے لے لی ہے لہٰذا پستول کی نمائش کے نتائج نہایت تسلی بخش نکلتے ہیں ورنہ جس طرح کے موٹے تازے تھل تھلاتے تاجروں سے یہ بھتہ مانگا جاتا ہے اگر اسلحہ نہ ہو تو وہ ایسے نصف درجن کو لٹا کر ان پہ بیٹھ رہیں تو ان کی کبھی پسلیاں سنک لیں۔ کوئی اور صنعت تو اس شہر خراباں میں عرصے سے ترقی کا منہ نہ دیکھ سکی، بس موبائل اور بوری کی صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ واپس زندہ گھر پہنچ جانا ہی اب اس شہر کی سب سے بڑی عیاشی ہے۔

نادر خان سرگروہ

ہوشیار باش!

بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ یہ 'نیا' دور ہے۔ ہم سے پہلے کے لوگ بھی اپنے دور کو 'نیا' کہتے تھے۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ موجودہ دور کے نئے پن کے لیے، لفظ 'نیا' کی جگہ کوئی اور 'نیا' لفظ تلاش کرنا ہوگا، کیوں کہ جتنی ترقی اِس دور میں ہوئی ہے، اِس سے پہلے کسی بھی دور میں نہیں ہوئی۔

نئے دور کی ایجادات کی اُفادیت کے ساتھ ساتھ اُن کے نقصانات اور اُن کا غلط استعمال بھی ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اِن ایجادات میں سے ایک کیمرا (Camera) ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیت کو نکھارتا آ رہا ہے۔ اور جُوں جُوں اِس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے، اِس کی جسامت بھی چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ چالاک ہو گیا ہے۔

اِس ایک آنکھ والی بَلا سے ہمیشہ ہوشیار رہیے۔ نہ جانے کب اور کہاں یہ آپ کی پوشیدہ حرکتوں کو اپنے ذہن میں قید کر لے اور اُس منظر کو اُن بے شمار آنکھوں تک پہنچا دے جو اُس وقت وہاں نہیں تھیں۔ موبائل فون کے علاوہ یہ

کیمرے نہ معلوم کن کن شکلوں میں آپ کی تاک میں رہتے ہیں۔ گھڑی کے ڈائل، قلم، سگریٹ لائٹر اور عجب نہیں کہ کانٹیکٹ لینس (Contact-lense) میں بھی!

ہوشیار رہیے!!! ریڈی میڈ کپڑوں کی دکانوں کے چینجنگ رومز میں۔ ہوٹلوں کے کمروں میں، جہاں ٹیوب لائٹ کے ساتھ یہ کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اعلیٰ کارکردگی کے حامل کیمرے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے بھی چھپائے جاتے ہیں، جو آئینے کو چیر کر وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جسے دیکھنے کی اجازت چشمِ فلک کو بھی نہیں! چینجنگ رومز میں اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے پیچھے سے ایک عام سا کیمرا بھی آپ کی سُن گُن لے سکتا ہے۔ وہ اِس طرح کہ آئینے کی پچھلی سطح پر لگائی گئی ریڈ آکسائیڈ (Red Oxide) کی پرت کو ذرا سا کھرچ دیا جائے تو وہ حصہ ایک شفاف شیشے کی طرح ہوجاتا ہے۔ جس کے پار بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہوشیار رہیے!!! اپنے ہوسٹل میں اور اُس کے طہارت خانوں میں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کا کوئی دوست ہی آپ کو اِس جال میں پھانس لے۔ ہوشیار!!! خواتین کے لیے مخصوص سوئمنگ پُولز میں، جہاں زُوم لینز کیمرے، پانی کی چادر سے ڈھکے نیم عریاں جسموں کی حرکات وسکنات کو ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

بیوٹی پارلرز یوں تو بُری جگہ نہیں ہوتی، لیکن کچھ بیوٹی پارلرز 'فریب خانے' ہوتے ہیں، جو ایسے ہی منفی مقاصد کے لیے چلائے جاتے ہیں۔ خواتین وہاں احتیاط اختیار کریں، خصوصاً ایک لباس سے دوسرے لباس میں منتقل ہوتے وقت۔ بے قبائی کے وہ لمحات کہیں رُسوائی کا سبب نہ بن جائیں۔

کچھ عرصہ قبل ایک ایسا ہی معاملہ سامنے آیا کہ ایک شخص نے اپنی عمارت کا ایک فلیٹ چند لڑکیوں کو کرایے پر دے رکھا تھا۔ وہاں اُس نے ایک چھوٹا سا کیمرا ٹیوب لائٹ کے چوک کے ساتھ چھپا کر ایک تار کے ذریعے اپنے کمپیوٹر سے جوڑ دیا تھا۔ بے خبر لڑکیاں یہ سمجھتی رہیں کہ اُنہوں نے کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر کے خود کو چار دیواری میں چھپا لیا ہے۔ اِس قسم کے خفیہ

جوش ملیح آبادی کے صاحبزادے سجّاد کی شادی کی خوشی میں ایک بے تکلف محفل منعقد ہوئی جس میں جوش صاحب کے دیگر دوستوں کے ساتھ ساتھ اُن کے جگری دوست ابن الحسن فکر بھی موجود تھے۔ ایک طوائف نے جب بڑے سُریلے انداز میں جوش صاحب کی ہی ایک غزل گانی شروع کی تو فکر صاحب بولے "اب غزل تو یہ گائیں گی اور جب داد ملے گی تو سلام جوش صاحب کریں گے۔"

کیمرے اکثر تیز روشنی والے ٹیوب لائٹس یا بلب کے پیچھے چھپائے جاتے ہیں، تاکہ انسانی آنکھ اِن سے آنکھ نہ مِلا سکے۔ اور یہ 'بدنیّت' کیمرے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کیمرے صرف اُجالے میں ہی اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ بلکہ کچھ 'اُلّو صفت' کیمرے تو اندھیرے میں بھی اپنا کام کر جاتے ہیں۔

وقتی طور پر ایسے کیمروں کی آنکھ پر پردہ ڈالنے کا ایک آسان ذریعہ 'چیونگ گم' (Chewing Gum) ہے۔ اُسے اچھی طرح چبا کر کیمرے کی 'بے حیا' آنکھ پر چپکا دیا جائے۔ اور اگر آپ کے پاس فرصت ہے تو قانونی چارہ جوئی کیجیے۔ جو خود کسی چیونگ گم سے کم نہیں۔ چباتے رہیے! چباتے رہیے! ختم ہی نہیں ہوتی۔

اب خود ہی اندازہ لگائیے کہ کہاں کہاں ایسے کیمرے آپ کا پیچھا کر سکتے ہیں۔ جہاں آپ پڑھتے ہیں اور جہاں کام کرتے ہیں۔ سوئمنگ پُولز میں اور وہاں کے شاور رُومز میں۔ ہیلتھ کلب میں اور وقتی طور پر لیے گئے کرایے کے مکانات میں۔ نہ جانے کہاں کہاں ایسے کیمرے آپ کو نظر آسکتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نہ جانے کہاں کہاں ایسے کیمروں کو۔۔۔ آپ۔۔۔ نظر آسکتے ہیں اور بلیک میل ہوسکتے ہیں۔

تو۔۔۔ اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھیے، ورنہ یہ ایک آنکھ۔۔۔۔

قبلۂ اُردو

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

پروفیسر فرحان متھانی کی فل رفتار موٹر سائکل سندھ لیکچررز کے لاپروا مستقبل کی طرح برق رفتاری سے ڈرگ روڈ کی جانب رواں دواں تھی، ہم نے بار ہا موٹر سائکل رُکوا کر سانس لیا اور بعد ازاں کلمہ شہادت کو دوہراتے، تھراتے خود کو فرحان اور اُن کے فلسفوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

بارے خدا خدا کر کے پروفیسر فرحان پاکستانی فلسفے کی حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ قبلہ چیخے "ارے فرحان! یہ تو شمع سینما آگیا اور اس کی بغل میں سنگم سینما تھا، ایک کوئی اور تھا، ہم اُس کا نام بھول رہے ہیں!"

"اوہو! سر یہاں شو کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟ لیکن یہ تو کوئی شمع شاپنگ سینٹر لکھا ہوا ہے بلڈنگ پر!"

قبلۂ اردو تو از سرِ نو زلزلوں کی لپیٹ میں آگئے، بولے "چالیس سال پہلے تو تین بجے فلم شروع ہوتی تھی ، اب کا پتا نہیں!"

پروفیسر فرحان متھانی کو بتایا کہ آج کل کراچی میں زلزلے بہت آرہے ہیں، اب دیکھو، کالج سے چلے تھے کہ یہاں ڈرگ روڈ پر زلزلہ آیا ہوا ہے۔"

فرحان "سر زلزلہ نہیں آیا، یہ آپ اپنی کم ہوتی شوگر یا بلڈ پریشر کے علاوہ دائمی بھوک کی وجہ سے کانپ رہے ہیں، ہوسکتا ہے یہ جاہ وجلال کا سبب بھی ہو، لیکن وجہ اس کی واجد ہے، خدا معلوم کہاں بھاگ گیا واجد، کھانے کی دعوت دے کر؟"

قبلہ کو یاد آیا کہ وہ تو ڈاکٹر واجد الدین کی دعوت پر پشاوری کباب کھانے، ڈرگ روڈ آئے تھے۔

اُنہوں نے پوچھا "باقی سب کہاں ہیں؟"

فرحان متھانی "واجد سے کوئی رابطہ ہو تو پتا چلے، آپ ملایئے واجد کا نمبر۔"

قبلہ نے بہت نمبر ملایا لیکن کوئی جواب نہیں۔

"فرحان صاحب، واجد کہاں رہتے ہیں؟"

پروفیسر فرحان متھانی نے ایک خوبصورت کوچے کی جانب اشارہ کیا کہ یہاں۔

"افوہ! واجد روزانہ حیدرآباد کا سفر طے کرکے اُس کالج میں آتے ہیں جہاں پچھلے تین سال سے بھوتوں کو بسیرا ہے؟" ڈائریکٹ فزکس کے پروفیسر پر چوٹ

کی۔

فرحان مسکرائے اور بولے ''سر وہ بھوت بھی آیا ہوا ہے لنچ پر، آپ خاموش رہئے گا ورنہ کھانے کی بجائے لوگ تجہیز و تکفین کے تردد میں لگ جائیں گے۔''

قبلہ نے فرحان کو مشورہ دیا کہ اس عجیب قوم سے پوچھتے ہیں، جس کے دو دانے قریب کھڑے ہیں۔ قبلہ نے انتہائی حقارت سے نزدیک کھڑے دو لونڈوں کو نزدیک بلایا۔

پہلا بولا ''کیا بات ہے بڑے میاں، سکون نہیں! اس عمر میں موٹر سائکل پہ اُڑتے پھرتے ہو؟''

قبلہ نے جوابی نا قابلِ اشاعت جملہ کہا اور پوچھا ''اے بے دن کی پیدائش، یہ بتا کہ یہاں کوئی کبابوں کا بہت بڑا ہوٹل ہے؟ جہاں کے کباب انتہائی مشہور ہیں۔''

یہ سُن کے دوسرا لُمڈا بے قرار ہوگیا اور جھپاک سے بولا ''بابا جی، یوں جائیں، پھر یوں مڑ جائیں، پھر ایسے آئیں، پھر دائیں، پھر بائیں، پھر آگے، پھر پیچھے سامنے وہ ہوٹل ہوگا۔۔۔''

پروفیسر فرحان متھانی معصومیت سے بولے ''سر یہ ہوٹل کا پتا بتا رہا ہے؟؟''

ایسے مواقع پر دل کی بات بتانے کے لئے قبلہ اپنے ہم عصر و عمر پروفیسر مطالعہٗ پاکستان کی کمی شدت سے محسوس کرتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے، اب جوان اولاد برابر فرحان متھانی کو کیا بتاتے کہ وہ اس رستے پر عمل کر کے بارہا ٹمپر روڈ سے شاداں و فرحاں لوٹے اور طبیعت بھی ہلکی ہو جاتی تھی۔

قبلہ خاموشی سے بولے ''فرحان، آپ سنگم پکچر ہاؤس کی جانب چلیں، اس کے دائیں بائیں کچھ ہوٹل تھے، جہاں ۲۰۰۳ عیسوی میں ہم نے اور مرحوم پروفیسر اقبال احمد انصاری نے بارہا اُدھار کھانا کھایا تھا اور بعد میں ہوٹل کے مالک نے وہ رقم یہ کہہ کر معاف کردی تھی کہ باباجی دعا کرنا، پیسے کی فکر مت کرو، ماشااللہ یہ ہوٹل میرا بیواؤں، یتیموں اور پروفیسروں کی دعاؤں ہی سے شاندار طریقے سے چل رہا ہے۔''

چار قدم آگے سنگم سینما تھا، آگے کوئی پُرانا ہوٹل تھا ڈرگ روڈ کا، جسے خوانین نے توڑ تاڑ کر عظیم الشان بلڈنگ بنادی تھی، قبلہ اپنے ''ڈرگ روڈ'' کو تلاشتے اندر جا کر بیٹھ گئے، دو بجے دن کا وقت اور بھوکے عوام کا رش۔

بات یہ تھی کہ پروفیسر مطالعہٗ پاکستان کے عہدِ پرنسپلی میں دن رات نت نئے فتنے جنم لے رہے تھے، ابھی ایک مسئلہ حل نہ ہو پاتا کہ دوسرا کھڑا ہو جاتا۔

سابق پرنسپل صیب دس سالہ حکومت کے بعد بارے خدا خدا کر کے اگلی دکان سِدھارے تھے لیکن جیسے اور دور گزر جاتے ہیں، اُن کا دس سالہ دور بھی گزر گیا، لیکن کچھ لوگ ایسے خوف زدہ اور چڑھتے سورج کی پرستش کے اِتنے عادی ہوگئے تھے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی سجدے میں پڑے رہے کہ نجانے پھر کب اور کِدھر سے نکل آئے۔ کبھی کسی نے کولی بھر کے زبردستی کھڑا کرنا چاہا بھی تو معلوم ہوا کہ کھڑے نہیں ہو سکتے، جوڑ بند سب اکڑ کر رہ گئے ہیں اور اب وہ اپنے تمام معمولات اور فرائضِ منصبی و غیر منصبی حالتِ سجودہی میں ادا کرنے کے عادی و خوگر ہو چکے ہیں۔

بقول میر انیسؔ (خدائے سخن)

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ارجنٹائن، الجزائر، ترکی، بنگلہ دیش، عراق، مصر، شام، اور تھرڈ ورلڈ کے تقریباً ہر ملک میں یہی ڈراما رچایا جاتا ہے۔ سیٹ، مکالمے اور ماسک کی وقتی اور مقامی تبدیلیوں کے ساتھ۔

ہاں تو ہم بتا رہے تھے کہ واجد صاحب کے آرڈر کی رُو سے گرما گرم کباب اور دیگر مزے دار کھانے آئے اور تمام غیر خوانین نے، خوانین ڈشوں سے بھرپور انصاف کیا، بعدازاں ملائی مار کے دودھ پتّی پی گئی۔ قبلہ نے اپنی شوگر کو بہتیرا سمجھایا کہ بی بی ابھی تم کم سن ہو، گرم جلیبی ہم تو دو کلو کھالیں گے لیکن تم تاب نہیں لا پاؤ گی، ناگاہ اُنہیں یاد آیا کہ یہ تو ان کا وقتِ طعام ہے، جب جیلر نما بیگم انہیں ایک روٹی سامنے پٹخ کر جاتی ہے اور ساتھ ایک دو طعنہ جات کہ ''اگر کچھ کھا کر نہ آئے ہوں تو کھالیں اگر پسند آئے!''

قبلہ حیرت و افسوس سے خاتونِ تھانہ کی جانب دیکھتے اور والدین کے بہیمانہ تشدد پر اللہ کا شکر ادا کر کے انجان راہوں پر چلنے

والے سالن کو زہر مار کرنا شروع کر دیتے۔
خاتون، خود ورزش کے لئے سات پردوں میں لپٹنا شروع کر دیتیں کہ باپردہ جمنازیم میں ورزش فرماتیں۔ مغرب بعد کھانا کھاتے اور عشا بعد دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتے۔
اگلی صبح کا اگلا دن، اگلے مسائل۔۔۔۔
قبلہ نے کچھ مزے دار کھانا پارسل کروالیا۔
گھر آ کر شاپرز رکھے تو ٹنڈے اور بھنڈیاں گویا اُن کی جوانی اور شادی کو یاد کر کر کے بین کر رہے تھے جبکہ قبلہ پشاوری کبابوں کی اختتامی ڈکاریں لے رہے تھے۔
فوراً خاتون کا منھ بند کیا "بھئی آج تو گھر میں انتہائی لذیذ خوشبوئیں آ رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کسی معالج کے سوئم کی بریانی آئی ہوئی ہے؟"
"جی نہیں، یہ جو آپ کے ہاتھ میں مسجد کے تھیلے ہیں، یہ خوشبوئیں ان ہی میں سے آ رہی ہیں، پھر آ گئے کہیں سے اپنے حسنِ سماعت وخطبات کی داد پا کر۔ کھانا کھا کر آتے ہیں تو ایک ایس ایم ایس ہی کر دیا کریں کہ آج پھر کسی نے نذر نیاز کھلا دی ہے۔"
اب تو قبلہ غصے سے کانپنے لگے، بولے "معاف کیجئے گا، یہ ہم ہیں، آپ کے عظیم خانوادے کے بزرگ نہیں کہ مسجدِ اہلِ اسلام کے زنجیری گلاس میں مسجد کی دال روٹی کھا کر پانی پیتے اور پھر اسی ٹین کے گلاس سے استنجا کر کے سڑکوں پر سُکھاتے پھرتے، بعد ازاں ظہر کی قضا ادا کر کے دوسری مسجد میں عصرانہ اور تیسری میں عشائیہ کھانے کو نکل جاتے۔"
صاحب، باورچی خانے میں زلزلہ سا آ گیا، دو چار طشتریاں جادوئی زور سے اُڑتی ہوئی قبلہ کی جانب آئیں اور وہ "بریانی کھا لینا" کہتے ہوئے اندر بھاگے۔
بس، بریانی ہو اور خوب ہو، بیگمات کا بس نہیں چلتا کہ دن بریانی اور رات وہی دن کی باقی ماندہ بریانی ہو، ڈائٹنگ، واک، جمنازیم، سب کو یکسر فراموش فرما کر بریانی کو نکالا گیا، اس عرصے میں قبلہ نے پرنسپل صاحب کی پالیسی کی داد دینا شروع کر دی کہ ہر سازش کا تجزیاتی حل نکال کر دور دراز ایسی جگہوں پر ظہرانے اور عشائیوں کا انتظام کرتے ہیں کہ سازشی عناصر اپنی سازش بھول بھال کر کھانے کی لذتوں میں محو ہو جاتے ہیں۔
مثلاً ایک بار صاحب فزکس اور اُردو لیکچرر میں سر پھٹول کی نوبت آ گئی تو پرنسپل صاحب نے حیدرآباد سندھ کی کڑاہیوں کی دعوت دے ڈالی، اب آدھا سازشی گروہ تو حیدرآباد پہنچتے ہی باعثِ بواسیر بادی وخونی وڈاؤن شوگر اپنی سازش بھول کر روٹی مانگنے لگا اور باقی آدھا نت نئی گالم گلوچ میں مصروف ہو گیا کہ خدا قسم اللہ میاں کے پچھواڑے کڑاہی کس نے پرنسپل صاحب کو کھلائی تھی کراچی سے لا کر۔
خیر کھاتے کھاتے ۹۰ فیصدی تو وہیں تختوں پہ سو رہے کہ بھوک صرف انگریزوں میں شائستگی، رواداری اور بُردباری قائم رکھتی

کولہے سے کولھا

اسّی کی دہائی کا ذکر ہے۔ نیشنل سینٹر حیدرآباد میں ایک مذاکرہ ہو رہا تھا جس کا موضوع تھا "قومی ترقی میں خواتین کا کردار۔" اس مذاکرے کے مہمانِ خصوصی ایک سندھی دانشور تھے۔ مذاکرہ چونکہ اردو میں تھا اس لئے مہمانِ خصوصی نے بھی اپنی صدارتی تقریر اردو ہی میں کی۔ بہت ہی پر جوش اور دھواں دھار تقریر تھی۔ بول تو وہ ٹھیک ہی بول رہے تھے لیکن جہاں جہاں اردو میں اٹکتے وہاں حسبِ ضرورت انگریزی یا سندھی لفظ کا پیوند لگا دیتے تھے۔ سندھی میں کندھے یا شانے کو کُلھا کہتے ہیں۔ کُلھا کا تلفظ اردو لفظ کولھا کے بہت ہی قریب سمجھئے۔ بس ذرا سا واؤ کو دبا دیجئے تو کلھا ہو جائے گا۔ چنانچہ ایک مقام پر جب انہیں اردو لفظ کندھا بروقت یاد نہ آیا تو اسی سندھی لفظ سے کام لیا اور فرمایا۔ "ہماری قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ ہمارے مرد اور عورتیں کولھے سے کولھا ملا کر نہیں چلیں گے۔"
آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سن کر سامعین کے چہروں پر مسکراہٹوں کا گراف کس بلندی تک گیا ہوگا۔

ہے، مسلمان کھانا کھا کر مذہب، سیاست اور سیکس پر گفتگو کرتے ہوئے غفلت کی نیند سو جاتے ہیں، دن چڑھے اُٹھتے ہیں تو ''پتا پڑتا'' ہے موجودہ حکومت اب چلی کہ تب چلی۔

پرنسپل صاحب بھی کم کھا کر خدا کا زیادہ شکر ادا کرتے ہیں کہ آج کا دن بھی خیر سے گزرا، اب دیکھو سورج چڑھے کیا ہو؟

اسٹاف روم میں پہنچتے ہی سب کو یاد آتا کہ کس پر کون سا الزام لگایا گیا تھا۔

اب گفتگو کا آغاز ہوتا۔

پروفیسر فزکس: ''صاحبو! جب ہم پیاچھڈی کرنے (پی ایچ ڈی کرنے) لندن گئے تو ہماری انگریزوں نے وہ آؤ بھگت کی کہ۔۔۔

اُردو لیکچرر: ''۔۔کہ ہم ان کی خوش اخلاقی کے گیت گانے چلتی کار سے زیبرا کراسنگ پر کھڑے ہو کر اپنی توقیر بے وقت کی بے تحاشا داد انگریزوں کو زیبرا کراسنگ پر کھڑے ہو کر جھک جھک کر فرداً فرداً کورنش بجا بجا کر ادا کرتے، پھر کسی اسٹریچر پر وہی انگریز ہمیں مغلظات سناتے لِطال کر سڑک کراس کراتے، مختصر یہ کہ پیاچھڈی کا طویل ترین عرصہ کنج فرنگ میں اچھا گزرا۔ انگریز کسی طرح اپنی تعلیم کی بے توقیری پر رضامند نہ تھا، فرنگی وزیر تعلیم نے یہاں تک شرط لگا دی تھی ہم زیرِ جامہ اُتار کر پی ایچ ڈی کا وائیوا دیں گے کیونکہ وہ غریب حیران تھا کہ پاکستانی قوم نقل کس ذریعے سے کہاں نقلی مواد رکھ کر کرتی ہے۔''

صاحب فزکس: ''معاف کیجئے گا یہ کوٹھے کی کسی زبان پر پی ایچ ڈی نہیں تھی کہ بادشاہ اپنے لونڈوں کو اُردو سکھانے طوائفوں کے چکلوں پر بھیجا کرتے تھے، کچھ سیکھے نہ سیکھے، اُردو بازی سیکھ جائے گا۔''

اُردو لیکچرر: ''خوب کہی، اس کی ظاہری وجہ سے بھی آپ لاعلم ہیں، از بس ضروری ہے کہ اُردو میں بھی ''پیاچھڈی'' کا انتظام کریں، شاہ زادوں کو طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ معصوم آپ جیسے بزرگوں کی صحبت سے محفوظ رہیں۔ آپ برطانیہ میں اُگنے والے سودرختوں میں سے ایک کا نام بھی نہیں بتا سکے تھے، نتیجتاً انگریز ممتحن نے آپ کو یتیم خانے میں الطاف حسین حالی کا شہرۂ آفاق نغمۂ یتامیٰ:

خدا کے لئے کچھ کرم کیجئے
یتیموں کی فریاد سُن لیجئے
ہمارے بھی اِک روز ماں باپ تھے
محل تھے، مکاں تھے و باغات تھے

بس پہ وہ گھمسان کا رن پڑتا کہ پروفیسر مطالعۂ پاکستان اپنے آفس کے باتھ روم میں جا کر مغلظات ارشاد فرما کر اللہ سے باہر نکل کر دعا کرتے ''الٰہی، آج کے لنچ میں ان چار میں سے دو تو کو اپنے پاس بلا لے پروردگار، یہ سارے جہاں کے موالی، اسی کالج کے نصیب میں لکھے تھے الٰہی!''

پھر ''نئے'' لنچ کا پروگرام بنتا۔

پروفیسر زولوجی مشورہ دیتے ''سر آج ان درندوں کو حسن زئی ہوٹل کی کڑاہی کھلا دیں۔''

پرنسپل صاحب: ''وہ اُردو والے کی بیوی اس کے دائیں بائیں کیمرہ لگائے اسے آتے جاتے دیکھتی ہے کہ کس کے ساتھ آتا جاتا ہے؟ وہاں سے یہ اردو والے کے فلیٹ پر جانے کی ضد کرتے اور اُس ہیڈ ماسٹرنی کو مزید پاگل کرتے ہیں، کہیں اور کی سوچئے۔

ادھر جنگ بڑھنے کو ہوتی کہ ڈرگ روڈ کے ''بار بی کیو ہوٹل'' کا فیصلہ ہو جاتا۔

کھانے کے دوران پرنسپل صاحب کوشش کرتے کہ خونی ازلی دشمن ایک دوسرے کے سامنے نہ بیٹھ پائیں، لہٰذا وہ صف بندی میں مخالفین اور موافقین کو آمنے سامنے بٹھا دیتے اور کھانا شروع ہو جاتا۔

''ابے اب اس اداکار کو اپنی شوگر یاد نہیں آ رہی؟ کباب تو لگتا ہے کھاتے ہوئے بھول گیا ہے!''

''لوگوں کا رزق پورا ہو چکا بھائی تو ہماری کیا خطاء، ابھی تو ہم سندھ حکومت میں تولد ہوئے ہیں، کوئی۔۔۔''

''۔۔یہی کوئی پینسٹھ کا سن ہوگا کہ سندھ حکومت تو بہتر پچھتر سال تک سیوا کرے گی، ویسے بھی سائبر کرائم۔۔۔''

''ابے لے، سائبر کرائم!'' پرنسپل صاحب کو اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوا، آہستہ سے صاحبِ فزکس کی منت کرتے، حضرت آپ سائبر کرائم کو چھوڑیں، فی الحال یہ کباب تو اور لیں''۔

''اجی آپ چنے کی دال کا تو پوچھیں جو یہ اردو والا پانچویں پلیٹ اپنی شوگر کو کھلا کھلا کر پال رہا ہے، کیا غلہ پاکستان میں اسی کی شوگر کا لقمۂ اجل بننے کے لئے اُگتا ہے؟''

''اوہو، آپ بھی کھایئے چنے کی دال۔''

''سر! بل دے دوں'' واجد بول پڑے۔

پرنسپل صاحب نے ایک خشمگیں نظر واجد پر ڈالی اور غرّا کر بولے ''ابھی دال تو کھا لینے دو، بعد ازاں کولڈ ڈرنک منگوا کر بل بھرنا۔۔۔''

واجد مطمئن ہو کر اپنے فوجداری مقدمہ پر غور کرنے لگتے، قرائن کہتے تھے سزا ہو جائے گی لیکن کئی مرتبہ وہ کراچی پولیس کو اُلٹا، ہتھکڑی پہنا کر پورا شہر گھما چکے تھے کہ ابے تُو نے ایک پروفیسر کو پکڑنے کی ہمت کیسے کی، وہ بھی حالتِ الیکشن میں؟ اب نوبت یہ آن پہنچی تھی کہ پولیس کی ہر موبائل پروفیسر الیکشن کو سلامی دیتی گزرتی اور یہ مزید لیڈیز سگریٹ سلگا کر گہرے کش لگاتے اور پروفیسر اسلامیات کو نجی گالیوں میں شامل کرتے رہتے کہ بروقت دل کا دورہ ڈال کر وہ تو ایک جانب ہو گیا تھا اور اُنہیں پھنسا گیا تھا، سردیوں میں جیل کی دال روٹی پر گزارا کیے، ایک روز اردو والے نے پوچھا ''واجد کی تھکن ابھی تک نہیں اُتری، ہفتہ بھر سے چھٹیوں پر ہے؟؟''

پرنسپل صاحب بولے ''آپ کو نہیں پتا؟'' اس کے بعد انہوں نے پُورا واقعہ گوش گزار کیا۔

اب تو قبلہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، پولیس کو اُن ہی کی رقم نکال کر رشوت دی اور راتوں رات چھڑا لائے، تب سے وہ نیفے میں دو ہزار روپے زائد رکھنے لگے کہ کیا پتا کس وقت واجد خرچہ کرا دے؟ زندگی کا اور واجد کے کارناموں کا بھروسہ نہیں، سچ ہے، لیکچرر کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو جائے، اُس کے بال و پر کالے ہی رہتے ہیں، فرماتے ''میں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ جان کر کیا۔''

دس سال بعد جب ان کا سیٹھ اردو پرنسپل دُکان بڑھا کر کہیں اور چلا گیا تو قبلہ ہر ایک کو مہینوں دھمکی دیتے رہے کہ اگر مجھے کچھ کہا تو پرانے پرنسپل کو ابھی بلا لوں گا، ہیبت کا یہ عالم تھا کہ اشارہ تو بہت بعد کی بات ہے، جس لیکچرر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے، اُسے کوئی دوسرا اپنی محفل میں نہیں بلاتا تھا۔

پھر یکا یک پروفیسر فزکس کے آتے ہی ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ پروفیسر مطالعۂ پاکستان پرنسپل بن گئے، انہیں کسی نے نہیں پوچھا۔ انہوں نے اپنے نعروں کو بے دم ہوتا محسوس کیا تو شیر ہو گئے اور وہی پروفیسرز جن سے وہ تمام عمر لڑتے جھگڑتے رہے، ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے یا مرحوم ہوتے چلے گئے تو ان پر ایک جھٹکے کے ساتھ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان نفرتوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر جب وہ چار رہ گئے اور میاں مسرت علی بھی ٹرانسفر ہوئے تو انہوں نے اپنے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں اور ''اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے'' کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اُنہوں نے ساری عمر شیش محل میں اپنی مور پنکھ انا کا ناچ دیکھا تھا، اب پرانے ساتھیوں کے ذور ہوتے ہی بجھتے چلے گئے۔

عمر بھی بڑھ رہی تھی۔

نئی فصل سرسبز زمین میں لہرا رہی تھی اور قبلۂ اُردو اپنے کراچی کو تلاش رہے تھے۔ اسی دوران انھوں نے ''سپلا'' کی نئی ٹیم جوائن کر لی اور پریس میں اپنے جوشیلے بیانات پیش کرنا شروع کیے، سیکریٹری تعلیم نے بارہا اُن کو بلایا اور خالی چائے پلا کر سمجھایا کہ ''بابا، ابی ام آپ کو کیا ترقی دیں؟ آپ پروفیسر، ڈاکٹر ہیں۔ چور مین (چیئر مین) انٹر بورڈ کا شارٹ لسٹ دو مرتبہ جیت چکے ہیں، لیکن کیمروں میں آپ دھڑلے سے خود کو جونئر موسٹ لیکچرر کہہ کر ہمارے محکمہ تعلیم کی بے عزتی خراب کرتے ہیں، ابھی ام آپ کو کیا ترقی دیں؟؟''

قبلہ نے نکاحِ ثالث کی فرمائش کر دی کہ تیسرے نکاح سے دل قوی ہو گا تو دوسری شادی کا سوچوں گا۔

اس پر سیکریٹری تعلیم نے انھیں باعزت نکال باہر کیا کہ

''بڈھے ہم نے تجھے حل پوچھنے بلایا تھا، اپنے کو کمپلکس میں مبتلا کرنے نہیں کہ جو کام ہم نہ کر سکے وہ تجھے کرادیں کہ اس عمر میں جب فرشتے آتے ہیں، تُو رشتے آنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔''

تس پہ قبلہ نے ایک بڑے چینل کے اپنے شاگرد کو بیان دیا۔

''میاں! کراچی کا سیکریٹری تعلیم کسی نمرودی مچھر سے نہیں بلکہ صابری برادران کی تالیوں سے مرتا ہے، افسوس دونوں قوال بھائی مرحوم ہوئے، یہاں تو چپڑاسی کو پٹے والا کہتے ہیں تو ترقی خاک ہوگی؟؟ بولے، میں نے سیٹھ پرنسپل کو پٹے والے کو بلاتے سنا، پہلی بار تو میں سمجھا کہ اپنے کُتے کو بلا رہا ہے سالا۔ معلوم ہوا پٹے والے کو بلا رہا تھا۔''

غرض یہ کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی پھڈا، لفڑا ہوتا، ٹوکو تو کہتے ''اُردو کسی بیوی یا رنڈی نے پڑھائی ہوگی، کیونکہ میرا امن پُوری باغ و بہار میں بیوی کے لئے لفظ ''رنڈی'' لکھ گئے ہیں، کیا خوب قیافہ شناس ادیب تھے مرحوم، ویسے بھی اردو ادب کا دامن مرحومین ادیبوں سے پُر و معمور ہے، حالی مرحوم، شبلی مرحوم، ڈپٹی نذیر دہلوی مرحوم، عبدالحق مرحوم، مرحوم پطرس، گویا، زندوں کے بس کا اُردو ادب نہیں، قبرستان میں پنپ رہا ہے۔''

پروفیسر مطالعۂ پاکستان نے قبلۂ اُردو کو اپنے آفس میں بلایا اور پیار سے کہا ''آپ'' صاحب فزکس'' سے اپنا دل صاف کرلیجئے، وہ نعتیں بھی تو لکھتا ہے جو آپ کو مرغوب ہیں۔''

تڑپ کر بولے ''اکثر بے اُستادے شاعروں کے مصرعوں میں ''الف'' گر جاتا ہے لیکن اس بدمعاش کے مصرعوں میں تو ''الف'' سے ''ے'' تک، تمام حروف تہجی ایک دوسرے کی کمر پر، عیدگاہ کے نمازیوں کی طرح سجدہ ریز رہتے ہیں اور رہی بات نعت نویسی کی تو میں نے خود اپنی گناہ گار موتیا زدہ آنکھوں سے جن کے آپریشن کا مشورہ ہر ماہر چشم گزشتہ ۲۰ برسوں سے دے رہا ہے، اُس ملعون کو کلیاتِ نظیر کے فحش الفاظ جسے منشی نولکشور پریس نے بتقاضائے تہذیب اور تعزیراتِ ہند خالی و نامکمل چھوڑ دیا تھا ''بھرتے'' دیکھا ہے، اُس منگل کو ظہر بعد مولوی عبدالحق کے ایک افسانے میں لفظ ''ب وس ہ'' کے اوپر جلی حروف میں ''بوسہ'' لکھ کر اُسے مصور کر رہا تھا، جب اس پہ بھی جی نہ بھرا تو کتاب کے آخری ورق پر خاندانی منصوبہ بندی کی دھجیاں اُڑاتی تصاویر بنائیں اور دل میں پیوست تیر بنا بنا کر اپنے پر غسل فرض کرتا رہا، آپ کہتے ہیں نعت لکھتا ہے، استغفراللہ!!!''

پروفیسر مطالعۂ پاکستان نے بتایا ''بات یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے زمانے میں لفظ ''بوسہ'' ناقابلِ اشاعت تھا لہٰذا اُس کی ہجے ''ب وس ہ'' لکھی جاتی، یہی حال کلیاتِ نظیر کی تراکیب کا تھا۔''

بولے ''ب وس ہ'' لکھ کر تو مولانا اُردو بابا نے نہ صرف بوسے کی طوالت بلکہ لذت میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔''

سپلا (سندھ پروفیسرز لیکچررز ایسوسی ایشن) کے ایک تازہ احتجاج کے بعد وزیرِ تعلیم کے کمرے میں جا پہنچے اور برملا اُس سے ہاتھ ملا کر بولے ''سائیں! آپ کے ہاں لُوطی کو کیا کہتے ہیں؟''

وزیر بولا ''کچھ بھی نھیں کہتے سر!''

قبلۂ اُردو قہقہے لگاتے نیچے اُترے اور پروفیسروں کو بتایا کہ ترقی پکّی کر آیا ہوں۔ ان کے جانے کے بعد جب سندھی زبان وزیر نے ''کچھ نھیں کہتے'' کے دوسرے پہلو پر غور کیا تو دیر تک کھڑکی سے گردن نکال کر انہیں ناقابلِ اشاعت سناتا رہا اور یہ پولیس کے اپنے شاگردوں کو بیان دیتے رہے کہ بیٹا میں نے اُس عسکری کالج میں فلاں فوجی جرنیل کو پیٹا، فلاں کی پھینٹی لگائی، سابق صدرِ پاکستان کو مرغا بنادیا کیونکہ وہ مُرغی بننے پر تیار نہیں تھا۔

چینل کے بچّے خوشی خوشی اُن کا انٹرویو ریکارڈ کرتے رہے۔ ایک بچہ بولا ''سر ابھی آپ کا گریڈ کیا ہے؟''

قبلۂ اُردو نے اُس غریب کو یوں گھورا کہ منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن سرتاپا مجسم ''گالی'' بن گئے، بولے ''میاں، گریڈ تو حجاموں اور بینکروں کا کام ہے، ہم تو کام کو ترجیح دیتے ہیں، اب میں نے لالوکھیت، بہار کالونی، چاکیواڑہ اور گولی مار کا چپہ چپہ اے گریڈ میں چھان مارا تھا، آج ۲۰ گریڈ کا افسر بھی جاوید نہاری پیدل چل کر نہیں لا سکتا کیونکہ سالے پہ گریڈ سوار ہے، معاف کیجئے گا آپ نے کبھی کتابوں اور عطریات کی دکان نہیں دیکھی، وہاں گریڈ کی کوئی قید نہیں ہوتی، خوشبو ہی اُن کا گریڈ ہے۔''

چینل والے بچے قبلہ کے دلائل پر عش عش کر اُٹھتے اور اخبارات میں انہیں نمایاں کوریج دیتے۔
بدایوں شریف کو اپنے بزرگوں کا وطن مالوف کہتے اور فرماتے ''کراچی میں جب ہم ایک بار پیدا ہوئے تو پتا چلا کہ یہاں موتیا'' آنکھوں میں ہی اُترتا ہے، خود ڈاکٹر مجھے ۲۰ برسوں سے موتیے کے آپریشن کا مشورہ دے رہا ہے، خدا قسم میں نہ اہل حدیث ہوں، نہ بریلوی، نہ کسی مسلک کا لیکن ختنہ سب کے جیسا کرایا ہے، خدا کا شکر ہے کہ تمام مسالک کے مولوی ختنے کے خدوخال پر متفق ہیں ورنہ صورت حال یہ ہوتی کہ کہیں چوکور، کہیں مخروطی، کہیں گول اور کہیں بیضوی سروں کی بہار ہوتی''۔
اس بیان پر آس پاس والے توبہ توبہ کرتے اُٹھ جاتے مگر پریس کے لونڈے انھیں گھیرے رہتے ''سر آپ کی کلی، پھول بنتی ہے اب؟''
فرماتے ''سالے، تُو نے ہمیں کیا اپاہج سمجھ رکھا ہے؟ ساٹھ سالہ مرد اور وکٹوریہ کے دس گھوڑے ایک طاقت کے حامل ہوتے ہیں، کیا سمجھا؟؟ ابے بُرادے کی انگیٹھی پہ پکنے والا کھانا صرف دوزخی مُردوں کی فاتحہ خوانی کے لئے ہوتا ہے کہ مُردہ کھڑا ہو جائے کھانا سونگھتے ہی، تُو کیا کھڑے بیٹھنے کی بات کرتا ہے؟؟؟''
آٹھویں جماعت میں پہلی بار قبلہ نے اپنے دوست کو بتایا کہ ''ابے میں جوان ہو گیا ہوں! تو وہ گالی دے کر بولا ''اب تُو منھ پر ڈھاٹا باندھ کے پھرا کر کیونکہ تیرا باوا تو تیری شادی ابھی سے کرنے سے رہا، ہاہاہاہا۔۔۔''
پھر جذبات سے رُندھے لہجے میں اپنے روحانی شعری استاد جوش ملیح آبادی کا شعر کثیف پڑھتے:

شبیر حسن خاں کا اِک عضوِ منُغّہ ہے
شکوے تو گنڈیری ہے تن جائے تو گنّا ہے

''میاں ہمارے وقتوں میں رنڈیاں بھی تہجد گزار ہوا کرتی تھیں، بزرگ طبیعت ہلکی کرنے اُن کے کوٹھوں پہ جاتے تو مناجاتِ بیوہ سُنا کر بھیج دیا کرتیں کہ میاں اپنی ''بیوہ'' کے پاس جایئے، اس گناہ سے دُور رہیے، مال کے گندے انڈے کو کیوں کھاتے ہیں صاحب؟ اپنی جُرواکو حق مہر اور ہمارا سلام دیجئے گا۔''
اکثر بتاتے: میں کڑاکے کا جوان ہوا تو نیر سلطانہ فلموں پہ چھائی ہوئی تھی، خدا قسم قتالہ مسرت نذیر کے رقص کئی کئی شو لُوٹ لیتے، گھر آتے ہی قبلہ والد صاحب مُتّے جان کر اُسی حیوان کی موافق دھلائی فرماتے اور اپنے کو گالیاں دیتے جاتے ''ابے مُتّے کی نسل، اوگدھے کی اولاد، ابے سور کے جنے، منھ کالا کر آیا؟؟؟
قبلہ حیران کہ منھ تو وہی گوراچٹا ہی ہے۔
ادھر یہ حال کہ شادی کی رات منکوحہ سے بھولپن سے پوچھا ''اب کیا کرنا ہے؟''
وہ جھنجلتی بولی ''اللہ کی قدرت کا انتظار کیجئے کہ کب بچہ ہو۔''
دس سال معجزۂ الوہی کے منتظر رہے، گیارہویں سال ایک بے تکلف بازاری دوست بولا ''یار تم دونوں ابھی تک بہن بھائی بنے ہوئے ہو یا زوجین ڈائیورٹ ہو گئے؟؟''
''کیا مطلب؟'' قبلہ نے حیرت سے پوچھا۔
تو اُس پلید نے بچہ پیدا کرنے کا پرچۂ ترکیب استعمال پیش کیا۔ قبلہ تو بھونچکارہ گئے، بیوی کو بتایا تو وہ غریب بولی ''اللہ معاف کرنے والا ہے، ہم سے تو یہ شیطانی چکر نہ چل سکے گا، کوئی بچہ پال لیجئے!''
تس پہ قبلہ منھ اندھیرے فجر پڑھ کر ''ایدھی ہوم'' گئے اور دو عدد خاندانی یتامیٰ، چھانٹ کر، لے آئے، دونوں کو پڑھایا لکھایا، دونوں کی شادیاں کیں اور اشاروں کنایوں میں ''ترکیب استعمال'' کا پرچہ بھی اپنے ''تجربہ کار'' دوست کے لونڈوں کے ہاتھوں اُن کو پکڑا دیا۔ پھر اُن کی اولادوں کو اُسی حیوان موافق دھویا جس طریقہ پر عمل کر کے اُن کے قبلہ نے انہیں ملذذ و ملخص کیا تھا۔
پرنسپل کو ''قاضی الحاجات'' کہا کرتے، اکثر اپنے فلیٹوں میں میلاد کرنے کے لئے پرنسپل سے موٹی رقموں کو مطالبہ کرتے اور نہ ملنے پر اگلے ربیع الاول تک گالم گلوچ اور الزامات کا سلسلہ جاری رکھتے۔
آئندہ برس بھی یُوں ہی گزر جاتا، تو از سر نو نئے سال کے چندہ ساز میلاد کا اہتمام کرتے۔ اب تو میلاد پڑھنے والوں اور

نعت خوانوں نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ "لاکھ روپے تنخواہ ملنے پر بھی بڈھا اپنے مرنے کا ہی میلاد کرے گا اور وہ بھی پرنسپل سے چندہ لے کر، ہاہاہا!!" نعت خواں قہقہے لگاتے۔

قبلہ رُپیا خرچنے کے معاملے میں محتاط تھے، مفت دعوتوں پر خوش ہوتے، اکثر نئے آنے والے لیکچرروں کو دھمکاتے "ابے سینئرز کی، اگر دعوت نہیں کرے گا تو سیکریٹری سے کہہ کر تجھے "پروبیشن پیریڈ" کے عرصے میں نکلوا دوں گا، بچّے ڈر جاتے، مہنگی مہنگی دعوتیں کرتے تو قبلہ کھانے میں کیڑے نکالتے، کھانا صرف بیوی کے ہاتھ کا نمک و ذلت بھرا کھاتے، کہتے، بڑھیا کی گالیوں نے ۴۰ سالہ ہاضمے کے چورن کا کام کیا ہے، دعوتوں میں اپنا کھانا بیوی کو باندھ کر لے جاتے اور اُس بدزبان کیا لزامات سنتے "مچھلی کھالی اکیلے آپ نے؟؟ لے کر نہیں آئے۔۔۔"

"تیرے باوا کا چالیسواں تھا، بنگالی مسجد میں، جو مچھلی بٹتی؟"

آخری وقتوں میں خوراک بہت کم ہوگئی تھی، اکثر اپنی روٹھی جوانی، بیوی اور شوگر کو مناتے، واک کرتے، لطیفے سنتے سناتے، یا پھر دشمن پروفیسروں کے جنازوں کو کندھا دینے نکلتے، فخریہ بتاتے "سالے نے بیس سال عمر کم لکھوائی تھی، ۸۰ میں بارے خدا خدا کر کے ٹلا ہے، کہتے، اللہ کا شکر ہے کہ آج کا پروفیسر مخیّر ہے، وہ ایسے کہ اگر ۳۰ روٹیوں کو ۲۰۰ ننگے بھوکوں اور ۳ لحافوں کو ۲۰ ہزار مستحقین پر تقسیم کیا جائے تو حاصلِ تقسیم میں مخیّر بزرگ پروفیسر کے تن پر ایک دھجّی بھی باقی نہ رہے گی،

اکثر پریس کے لونڈوں کو بیان دیتے "ہمارے پردادا کے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ ننگِ خلائق، ننگِ وطن، ننگ اسلاف، ننگے سر، ننگے پیر، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہمالیہ کے پہاڑ کی ننگی چوٹیاں پھلانگتا ہندوستان وارد ہوا تو قوم ننگ سے لبریز جہالت کے برہنہ گڑھوں میں پڑی تھی!"

اِتنے میں ایک چینل کا بچہ قبلہ کی بات کاٹ کر بولا "سر جی، اس بیان کی روشنی میں تو محسوس ہوتا ہے کہ ننگ دھڑنگ بزرگوار کی ستر پوشی محض ننگے گھوڑے نے اپنی ننگی دُم سے کر رکھی تھی!" تس پہ قبلہ اُسے کونے میں لے جا کر ٹھنڈا کر دیتے اور بعد ازاں برسوں وہ معافیاں مانگا کرتا، معاف کر دیتے اور ساتھ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے "میاں، یہ بات بالی عمریا، کنواری لونڈیا اور ٹھگی ڈاڑھی میں ہی دیکھی کہ جتّا ہاتھ پھیرو وتّی ہی چمکے ہے!" اِس پہ جوان لونڈے خوب قہقہے لگاتے اور ونس مور کا شور مچاتے۔

حلقۂ یاراں میں خوش گفتاری پر آتے تو ڈمپل اُن کے رخساروں ہی میں نہیں، فقروں میں بھی پڑتے۔ واجد کو پسند کرتے کہ مجھے اس کے حُمق سے پیار ہے۔ ایسا زندہ احمق میں نے رُوئے زمین پر اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں نہیں دیکھا کہ شعبۂ نباتیات میں ساٹھ لونڈیوں کے بیچ پڑھ کر جامعۂ کراچی سے فارغ ہوا اور ایک لونڈیا بھی فارغ نہ کر سکا، کسی باپ کا بوجھ تو کم کر دیتا۔ واجد اپنے انڈے پراٹھوں، کبابوں، نہاریوں کا بتاتے تو خوب خوش ہوتے کہ مردوں کو کھاتے پیتے رہنا چاہیے۔ شوگر ہونے کے بعد دو سال تک رات کو فل کریم آئسکریم پاؤ بھر کھاتے کہ بلڈ پریشر کی آگ کو ٹھنڈا کر کے نیند لاتی ہے، چنانچہ ۵ سال بعد وزن کا عالم ۱۴۰ کلوگرام اور کمرے ۴۷ کے پھیر کا کمرہ تھی، معالجین نے بیوی کو جواب دے دیا، قبلہ باز نہ آئے، بولے "ڈاکٹر ایک نمبر کا نطفۂ نا تحقیق ہے، مجھے بھوکا مارنا چاہتا ہے" اس کے بعد انہوں نے اپنے معالجین کو اپنے ۴۰۰ گز کے بنگلے میں بلانا اور برنس روڈ کی نہاریاں، تافتان، کلیجے، کباب، شیرمال، قورمہ کھلانا شروع کئے، ربڑی کھلاتے، کھیر پکواتے، غرض سالانہ ایک معالج کے قتلِ عمد میں ہاتھ رنگتے، لوگوں نے انہیں "معالج خور" کہنا شروع کر دیا تھا، کثرتِ وزن کے باعث غسل خانے میں پھسل جاتے اور مہینوں کالج سے چھٹیاں کرتے، بارے بیوی نے رو پیٹ کر وزن کم کرایا تو ۳۵ کمر پر آ گئے، وزن ۶۰ کلو کر لیا، لوگوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا، یکا یک ۳۶ سالہ چھورا بن گئے اور فٹنگ کے ملبوسات پہننے لگے، کار فروخت کر دی، ڈرائیور کو دبئی نوکری دلا دی، پیدل چلا کرتے، ڈرائیور خانہ خراب کالج کے پُل کے نیچے چرس بیچا کرتا اور سگریٹ پولیس والوں کو مفت پیش کرتا۔ جس کانسٹبل کو چرسی سگریٹ نہ ملتا وہ قبلہ سے ڈرائیور کی شکایت کرتا، تڑپ کر کہتے "وہ مجھ سے

جوش کا کلام

جوش ملیح آبادی ایک مشاعرے میں شریک تھے۔مشاعرے کے دوران ایک نوجوان شاعر نے جو کلام سنایا وہ کم و بیش جوش کے اشعار کا چربہ تھا۔ ان ہی کے مضامین، وہی ترکیبات ، وہی لفظیات۔یعنی معمولی سے ردوبدل کے ساتھ تقریباً پورے پورے مصرع جوش کے تھے۔مشاعرے میں موجود سینئر شعرا اور سخن فہم سامعین سر جھکائے خاموشی سے سنا کئے اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔کسی نے کچھ نہیں کہا۔مشاعرے کے اختتام پر جب جوش ملیح آبادی کے پڑھنے کی باری آئی تو اناؤنسر نے انہیں دعوت کلام دیتے ہوئے کہا۔"خواتین وحضرات!اب آپ جوش صاحب کا کلام خود ان کی زبانی سنیئے۔"

پوچھ کر ساجھے میں یہ مفید کاروبار نہیں کرتا، مجھے تو کوڑی کا فائدہ نہیں اس دھندے میں، اپنی تنخواہ میں گزارتا ہوں، دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"

محرم میں، یکا یک اپنے خاندان کو شیعہ کر لیتے اور ربیع الاول میں میلاد کرتے، فرماتے "دادا مرحوم نے ایک کٹر شیعہ دادی رکھ چھوڑی تھیں، اُن کی اولادیں شیعان اور دوسری کی سُنّی تھیں، باہم شادیاں ہوتیں، چنانچہ آدھا خاندان شیعہ اور باقی سُنّی ہے۔اب تو یاروں کا کوئی مذہب نہیں۔"

قبلہ کسی عسکری کالج میں قائم مقام پرنسپل بھی رہے تھے، ہوا یوں کہ کرنل ان پر خاص مہربان تھا یا ان کی حماقتوں کا واحد قدردان تھا، کچھ برس ملک سے باہر گیا تو قبلہ کے سفید بال دیکھ کر مرعوب ہوا اور انھیں انچارج پرنسپل بنا گیا، کیڈٹ کالج کا پرنسپل بنتے ہی انھوں نے "فوجی میس" (عسکری طعام خانے) کو واجد علی شاہ کا "پری خانہ" بنادیا، دن رات پائے، حلیم اور نہاریاں پکنے لگے، شیرمال اُترنے لگے، اللہ اللہ کر کے سات سال بعد وہ کرنل ریٹائر ہونے آیا تو ان کو باعثِ مٹاپا پہچاننے سے انکار کر دیا، سزا کے طور پر روزانہ انہیں میلوں پیدل چلواتا اور چوزے کی یخنی پلواتا، ساتھ وفاقی مشیر تعلیم کروا کر اسلام آباد ٹرانسفر کر دیا۔یہ زار زار روتے، مگر ایک لاکھ روپیا تنخواہ کہاں پاتے؟ پڑے رہے، خدا خدا کر کے آغا خان یونیورسٹی، کراچی نے انہیں پروفیسر بنا کر شہر بلایا تو گھر آ کر خوب سوئے، بیٹی کی شادی کر دی اور اُسے کینیڈا بھیج دیا، بیوی نے پرہیزی کھانوں کا سلسلہ شروع کر دیا، قبلہ کو دل کا پہلا دورہ پڑا تو پچاس کا سن تھا، اسی سال محکمہ تعلیم حکومت سندھ نے نوازا اور اُردو لیکچرر ہوگئے، کہتے ہیں کہ اُن کے میڈیکل کے دوران ایک ڈاکٹرنی جو سندھن تھی، قبلہ سے بولی کہ "بابا اس عمر میں شعبۂ تعلیم سندھ کو پسند کرنے کی وجہ؟" قبلہ اپنی غائب دماغی پر چکرائے کہ عجلت میں خضاب کرنا بھول گئے تھے، ٹپٹا گئے، بولے "بیٹی کیا کریں کہ اپنے دیس کی قدر وقتِ آخر ہوا کرتی ہے۔" ڈاکٹرنی نے یکا یک فِٹ قرار دے کر کام پر چڑھا دیا۔قبلہ، اُردو زبان کے ماہر تھے، جلد ہی سرکاری تقریبات کی ضرورت بن گئے۔سراج الدولہ کالج سے عشق کرتے، کہتے، یہیں کونے میں میری قبر بنانا، اگر بھولے سے پہلے مرجاؤں، اکثر جونیئرز کو اپنی موت کے مناظر سے ڈراتے، سراج الدولہ کالج میں دو چار دوست بتاتے اپنے، کہ ایک اقبال انصاری صاحب، پھر شاہد اقبال صاحب، ندیم صاحب، مسرت صاحب اور ظفر محمود سب سے پہلے ملے۔شاہد میں اپنا عکس جھلملایا۔باقی سب بھی خوب رہے، اب کہاں ہیں وہ شخصیات؟؟ میدان صاف ہے، جو چاہو آ جاؤ!! غلام محمد بھی آئے اور دل میں بسے۔کالج میں خوش رہا کرتے، تنہا گھر آتے اُداس ہوجاتے، گھنٹوں کالج تک، بلکہ اگلی صبح تک کالج والوں اور کالج کو یاد کرتے۔اتوار کو یاد نہیں کرتے، کیونکہ اتوار کو ایک روحانی اجتماعی دعائیہ محفل میں برسوں بیوی کے ساتھ جاتے اور ہر ایرے غیرے کی دعائیں منواتے رہے۔دعائیں منوانے میں قبلہ کا اپنا اسٹائل تھا، مسجد کا ویران گوشہ منتخب کر کے بیٹھ جاتے اور اللہ جانے کون کون سی اپنے دادا، پردادا کے وظائف پڑھتے اور اللہ سے باتیں کرتے اور روتے جاتے، لوگوں کی دعائیں دہراتے رہتے۔بتانے والے بتاتے کہ جو بزرگ اس محفل میں اجتماعی دعا برسوں سے کروا رہے تھے، وہ چپکے چپکے قبلہ کو دعا سے ایک دن پہلے فون کرتے کہ کل آپ ضرور

تشریف لائیں، کیونکہ سب کی دعائیں قبول ہوجاتی ہیں۔ سسرال میں یہ معجزات ہوئے تو بیوی نے حیرت سے پوچھا ''آپ کیسے دعا کرتے ہیں؟''

جل کر بولے ''اللہ کے پاس جا کر، سامنے بیٹھ جاتا ہوں، دودھ کا شربت پیتا جاتا اور شکر ادا کرتا جاتا ہوں، بعد میں اللہ بھی مسکرا کر پوچھتا ہے کہ کیسے آنا ہوگیا تمہارا؟ تو دعاؤں کی فہرست پکڑا دیتا ہوں، وہ دھڑا دھڑ فرشتے کو بلاتے اور لکھواتے جاتے ہیں، بھائی، اللہ تو اللہ ہے، مجھ سے بھی پہلی بار ''اللہ'' نے آسمان پر آ کر پوچھا تھا سرسید کالج کے اونچے درختوں کے اوپر آسمان پر کہ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' تو میں نے کہا تھا کہ میری بیوی اکیلی آرہی تھی برسوں سے، میں نے سوچا میں بھی چلا چلوں، اکیلے کیا کرے گی کمزور عورت ہے۔ تو اللہ نے کسی کو پکارا تھا کہ جبرئیل، مجھے قسم ہے اپنے غرور کی کہ آج کے بعد اس مسجد میں ہر اس دعا کو پورا کردوں گا جو میرے بندے کے حق میں ہوگی۔ فرشتہ بتا کر، انھیں سلام کرکے چلا گیا کہ آپ اپنی کوئی دعا بتادیں، انھوں نے معذرت کرلی کہ میں تو اللہ سے ملنے چلا آیا تھا کہ دیکھوں تو کون سی مسجد میں ہے اللہ؟ بتاتے، بچپن سے مجھے اللہ کو دیکھنے اور باتیں کرنے کا جنون ہے، مجھے حیرت ہے کہ اکیلے اللہ نے دنیا بنالی، کائنات سجالی اور محض اپنے عشق میں کہ محمد معشوق تھے، اُسی دن سے ''عشقِ مجازی'' سے تائب ہوکر اُردو شاعری کو بلکہ دنیا کی ہر شاعری کو ''عشقِ حقیقی'' پہ موڑ دیا۔ خوابوں میں حج عمرے کرتے اور صبح ٹھیک ٹھیک حالات بتادیا کرتے۔ لوگ، مکہ مدینہ میں تصدیق کرتے تو وہی نکلتا جو قبلہ بتاتے تھے۔

روحانیات پر مائل ہوئے تو عوام کو حیران کردیا، بزرگ خود ان سے اپنے مسائل کے حل کی دعائیں کراتے اور یہ تہجد پڑھتے اور اللہ سے اپنا بھرم قائم رکھنے کی دعائیں کرتے، اللہ بھی ان کا اصل جانتا تھا، ہنستا، ان کی کوئی دعا خالی نہ جانے دیتا اور یہ اعلان کردیتے کہ کالج کی مسجد میں کوئی پروفیسر نظر نہیں آتا، چنانچہ اپنے انگریزی کے دوست پروفیسر ندیم احمد کو ظہر اصرار کرکے پڑھواتے اور گھنٹوں دعائیں مانگا کرتے۔ ندیم کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی گئی، برسوں پہلے یکا یک فالج کی لپیٹ میں آگئے ندیم اور جوانی میں ہی معذوری دیکھ کر قبلہ گھنٹوں نالہ و فریاد کرتے لیکن جو ''رب'' کی رضا۔

دشمنوں نے یہاں تک اُڑایا کہ اُنھوں نے اپنے قبضے میں جنات و اُن کی بیگمات کر رکھی ہیں۔ کہتے ''میں خود کسی جن سے کم نہیں اور میری بیوی تو زندہ بھوتنی ہے، لہٰذا ہمارے فلیٹ میں کسی اور مخلوق کی رہائشی جگہ ہی نہیں۔'' موڈ میں ہوتے تو ساحلِ سمندر پر اپنے ٹی وی چینلز کے ڈراما نگار دوستوں کے ساتھ پکنک کرتے، ساحل پر دس دس روپے لے کر بچوں کو بٹھا کر چنگ چی رکشے چلاتے، اونٹوں کی ختنی چیک کیا کرتے اور مطمئن ہوکر بتاتے: خالص سیڈاونٹ ہے۔

کبھی خود پر تہمتیں لگاتے کہ فلاں بچّی کے ساتھ کچھ کرنے ہی والا تھا کہ عصر کی اذان شروع ہوگئی، ناچار نماز پڑھ کر آیا تو موڈ ہی بدل چکا تھا، نتیجتاً اُس عفیفہ کو ''مثنوی زہرِ عشق'' کی روحانی کیفیت پر مفت لیکچر دیا۔

ریٹائرمنٹ سے نزدیک، سال اوّل، سال دوم، بی اے اور بی ایس سی کے شاگردوں کو اُردو اشعار کی روحانی تشریح بتایا کرتے، فرماتے ''میاں اُردو شاعروں کے پاس روٹی کھانے کو پیسے نہیں تھے، زراب و کباب کہاں سے کرتے؟ یہ سب زبان کی لذتیں ہیں، اس شعر کی روحانی تشریح یُوں ہوگی۔'' بچّے اُن کی بتائی ہوئی تشریحات لکھتے اور نمایاں ترین نمبر پاتے۔ اخیر عمر میں شیشے کی مانند چمکنے لگے تھے۔ لوگ کہتے ''عجب نُورانی چہرہ ہوگیا ہے'' بیوی قسمیں کھاتیں کہ ''ان کا پُورا جسم نُورانی ہوگیا ہے، رات کو اکثر نیکر بنیان پہن کر سوتے ہیں تو اندھیرے میں چمکتے رہتے ہیں۔'' اکثر سوشل میڈیا پر نت نئی قبریں پوسٹ کرتے رہتے۔

اکثر جامعات میں اُردو لیکچرز کے لئے اعزازی بلائے جاتے تو ماسٹرز کی کلاس میں اپنا تعارف کراتے ''یہ غریب الدیار، عہد، نا آشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پروردہ ریش، خرابہ حسرت کہ موسوم ۔۔۔۔۔۔۔۔، مدعو بابائی یوسف ظفر ۱۹۵۷ء مطابق عشرہ محرم الحرام ۱۳۷۴ ہجری میں ہستی عدم سے اِس عدمِ ہستی میں وارد ہوا

اورتہمتِ حیات سے متہم!"

طرار پروفیسر کھسکھساتے "بھیا، اتنی تکلیف تو سیزرین میں نہیں ہوتی، اگر نارمل طریقے سے پیدائش ممکن نہ تھی!"

کان میں پڑ جاتی تو لنچ کھانے اور "موٹا لفافہ" مضبوطی سے پکڑنے کے بعد اچانک اُس پروفیسر کی بہن کو اپنے حبالہ عقد میں قید کرنے اور فی الفور وظیفۂ زوجیت کی ادائیگی کی لذت بھری خواہشات کا اظہار کرتے اور سرکاری کار میں بیٹھ کر واپس آتے اور لفافہ بیوی کو پکڑا دیا کرتے اور ایک خاص غرور سے کہتے "لو پکڑو! اپنے ذاتی گھر کی قسط!" وہ غریب اپنی تنخواہ سے بیسیاں ڈال ڈال کر کمیٹیوں سے ذاتی گھر کرے جا رہی تھی برسوں سے کہ بڑھاپے میں کہاں کرائے کے گھروں کو جھیل پائیں گے بڑے میاں، ہر مالک مکان کو غائن اور ڈاکو کہا کرتے۔ بجلی چُرانے کے شک کو سچ ثابت کر دیا کرتے اور نتیجتاً کرائے کا مکان چھوڑ کر نئے گھر کی تلاش میں نکل پڑتے۔ بھلا حلال تنخواہ میں جدید دور میں مکان ہوا ہے؟ غریب نے ذاتی فلیٹ کر لیا چھوٹا سا، اللہ کا شکر کہ قبلہ کی بدزبانیوں اور بیوی کی دعاؤں اور تہجد نمازوں نے پوش علاقے میں فلیٹ کروا دیا۔ گھنٹوں اللہ کا شکر ادا کیا کرتے کہ اس ماہ کرایہ نہیں دینا پڑے گا، تاہم بیوی تو جب تک زندہ رہے، کرایہ ماہ بہ ماہ ادا کرتی اور وہ کمیٹیاں ڈالتی اور دنیا بھر کے ضرورت مندوں کی مدد کرتی رہی۔ پورے محلّہ میں دونوں کی جوڑی مشہور ہو گئی کہ بڑے مال دار بڑے میاں اور بڑی بی ہیں، وہ غریب کیسے کیا کرتی؟ یہ کوئی جانتا۔

قبلہ کی محبت کی شادی نہیں تھی، والدہ کی ایک چچی زاد بہن تھیں، اُن کی مالک مکان خاتون نے یہ شادی لگائی تھی۔ بولیں "لڑکی ایک سرکاری اسکول میں پڑھاتی ہے بی بی اور بڑی ہی شریف بچّی ہے، نماز روزے کی پابند ہے جوانی میں۔" قبلہ نے فوٹو مانگا تو والدہ صاحبہ نے ایسا شاندار جواب دلوایا خالہ کے ذریعہ کہ اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ خالہ زاد بھائی سے کہلوا کر محترمہ کا شناختی کارڈ مانگا کہ اسی بہانے فوٹو بھی دیکھ لیں گے تو اُن محترمہ کے بڑے بھائی نے آ کر قبلہ کے والد صاحب سے بات کی کہ صاحب زادے "بے بی کا این آئی سی مانگ رہے ہیں اپنے کزن سے ذریعہ، تس پہ والد بزرگوار سے سامنے بُلوا کر جو کہا سو کہا، سالے صاحب کے جانے کے بعد لوگ بتاتے ہیں کہ قبلہ کی جو تواضع کی ہے مرحوم نے تو ایک ماہ تک خالہ ہی کے گھر اپنی مرہم پٹی کراتے رہے۔

بتاتے، عشق کیا تھا میں نے بھی، جامعہ کراچی سے بی ایس سی کے دوران جامعہ کی بس میں آتے جاتے ایک برقعہ پوش حسینہ کو دل دیا تھا کہ اُس کے حسین ہاتھ، دورانِ سفر، سورۂ یاسین پڑھتے نظر آ گئے تھے اور ذرا سا چہرہ بھی جھلک گیا تھا۔ ان کے گھر سے نزدیک ایک پوش محلّہ کی باسی تھی۔ انھوں نے قریبی اکلوتے دوست (جو بعد میں دہلی یونیورسٹی انڈیا کے رجسٹرار بھی ہوئے تھے، ان کے کلاس فیلو تھے) جناب انوار الحق، اُن کے ذریعہ معشوقہ سے کیلکو لیٹر منگوایا کہ فزکس اور میتھ کی گتھیوں سے پریشان رہتے تھے، والد صاحب دلواتے نہ تھے کہ امتحان میں نقل کرو گے، کسی وہمی پروفیسر نے مسجد میں انہیں بتایا تھا کہ لونڈے کو کیلکو لیٹر کبھی مت دلوانا، نقل مارے گا پرچوں میں اور جاہل کا جاہل رہے گا۔ قبلہ نے گھر میں اخبار تک بند کر دیا، مبادا کوئی سائنسی جواب چھپ جائے اخبار میں امتحانات سے پہلے۔ ہاہاہا۔۔۔ بالآخر ایک سہانی شام معشوقہ کے گمنام والد صاحب کو ۳۳ صفحات کا خوشخط "خط" لکھا جن کی اُردو بازار میں دس دکانیں اور پریس تھا اور دوست کے ہاتھ معشوقہ کی سہیلی کو دلوا دیا کہ اِن سے کہیں گھر میں کسی کو دے دیں۔

"خط کیا تھا، میں نے اُس کم بخت میر تقی میر، ناصر کاظمی، عندلیب شادانی اور قابل اجمیری کے اشعار لکھ دیے تھے۔ معشوقہ کے گمنام والد بزرگوار کے دشمنوں کو گالیاں اور اُن کی تعریف لکھ دی تھی، مدعا میرا گستاخانہ لیکن لہجہ فدویانہ تھا، ابو کو خطوط زعفران سے لکھتے دیکھا تھا، لہٰذا القاب و آداب تو زعفران سے باقی روشنائی سے لکھ دیا تھا۔ خط میں والد کے حسنِ اخلاق، جرات، ہمت، مردانہ وجاہت، شفقت، خوش خلقی، خوش معاملگی، صلہ رحمی، نرم گفتاری، غرض ہر اُس خوبی کا اعتراف و اظہار کیا تھا جس کا بڑھے میں شائبہ

تک نہ تھا، ساتھ ساتھ اُن کے نامعلوم دشمنوں کی اندازے سے نام بنام ڈٹ کر بُرائی کر ڈالی تھی، ان سب کی تعداد اتنی تھی کہ ۳۳ صفحات فل اسکیپ بھر گئے، پھر ان تمام واقعات کو کھرل کر کے دوست کو پکڑا دیا کہ دے آیارا!

وہ دے آیا۔

کوئی ماہ بعد سہیلی نے آکر بتایا کہ اس کے والد نے آپ کو دکان پر بلایا ہے اُردو بازار۔ قبلہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ شام کو بن ٹھن کر پہنچے تو بزرگوار بہت محبت سے ملے گلیشئر تھا کہ پگھلا جاتا تھا، اپنے شاندار دفتر میں بٹھا کر بولے'' صاحب زادے، کمال ہے کہ تم سے پہلی بار مل رہا ہوں لیکن تم میرے بارے میں ختی کے اُن حرامیوں کی حرامزدگیوں تک کے بارے میں جانتے ہو؟ بارے ماہتاب عمر تمہارا ۲۲ کا ہوگا لیکن کمال معلومات ہیں۔ لیکن میاں، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اوصاف حمیدہ تو تم نے میرے بیان کئے تھے طویل ترین خط میں، جسے میں نے دو بار پڑھا اور پھر اُکتا کر اپنے منشی کو پکڑا دیا کہ تم شادی کس سے کرنا چاہتے ہو؟ میں تمہاری شادی کی اجازت کیوں اور کیسے دوں؟ منشی جی اور دوسرے ملازم بزرگ بھی چکرا گئے کہ تم کس سے شادی کرنا چاہتے ہو اور میں اجازت دینے والا کون ہوں؟''

ہکا بکا بزرگوار کو دیکھ کر قبلہ کو اپنی حماقت، عجلت اور بقول دوست، نحوست کا احساس ہوا کہ مارے خوف کہ لڑکی کا نام جو جانتے ہی نہ تھے، لکھنا یا اظہار کرنا یا اشارہ دینا تو بھول ہی گئے تھے کہ آپ کی بیٹی سے جو جامعہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ پیدائشی ''پروفیسر'' تھے، سر پیٹ کر رہ گئے۔ بزرگوار کی پاؤ پاؤ بھری کی آنکھیں دیکھ کر منہ در منہ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ غرض وہ بی بی مزید تعلیم پانے ''لندن'' سدھاریں اور قبلہ والدین کی رضا پر راضی ''ہو'' ''ہی'' گئے۔

تم میں ہمت ہے تو زمانے سے بغاوت کرلو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

بہر حال برسوں خاندان میں قبلہ کی بات کُھلنے پر کہ دوست نے کھولی تھی خالہ زاد سے کہہ کر، قبلہ کی جراتِ رندانہ کے چرچے رہے۔ رشتے دار حسبِ استطاعت گالیاں دیتے اور دل میں کہتے رہے'' ہماری لونڈیا مرگئی تھی؟'' لیکن قبلہ نہ مانے۔ دشمنی، قتل اور شادی کے خاندان سے باہر کرنے کے قائل تھے۔ کہتے'' خاندان کے رشتے بدل جاتے ہیں، شادی کرلو تو۔''

برسوں بعد ایک شان دار قبر پر، ایک ڈگری کالج کے دامن میں، جوان نسل سر جھکائے ایک مزار پر اُداس، نم دیدہ کھڑی، ہاتھوں میں گلاب، چمپا، چمبیلی، پھول پتیاں و چھڑیاں لئے کھڑی، کسی بزرگ کی باتیں، بوسیدہ کتابوں سے پڑھ پڑھ کر انہیں یاد کر رہی تھی۔

ایک لڑکا بولا'' کاش، سر! آپ ہمیں بھی اپنے تبحرِ علمی سے سرفراز فرماجاتے!''

عالم بالا سے قبلہ نیچے جھانک کر ہنسے اور بولے'' ابے'' تبحرِ علمی''، کتنے فاقوں کے بعد سیکھا یہ لفظ تو نے، چل، چل کر لائبریری میں فلاں کتاب کا فلاں صفحہ دیکھ، اُس کی فلاں سطر کا فلاں حاشیہ دیکھ، اُس میں سال ۱۹۵۶ عیسوی کا فرہنگ لکھا ہے میرے ہاتھ کا، اُس کو درست جان لے اور خبر دار، کتاب، اپنے گھر مت لے کر جائیو بیٹا، یہ غریب لڑکوں کا کالج ہے، جو کتاب نہیں خرید سکتا، اُسی کے لئے میں نے اپنی اور بیوی کی تنخواہوں اور پنشنوں کی رقم سے کتابیں ڈلوائی ہیں بیٹا، جو لاکھوں کی تعداد میں آپ ہی لوگوں کے لئے ہیں!!''

''کس سے باتیں کر رہا ہے دانی یار؟''

''ارے یار، بابائے سراج الدولہ کالج، قبلۂ اُردو سے!'' سر جھکائے کھڑا لڑکا، آنسو پونچھ ہنس پڑا۔ سال خوردہ قبر پر تازہ و باسی گلاب، گیندے، موتیے، السی، چمپا، چمبیلی جنس نرگس گل مینا، تارا، داؤدی، سوسن، بی بام ہرگا موٹ، بہشتی گلاب، قرمزی گلاب، ارغوائن، ٹیسو، گل صد برگ، مغیلاں، شقائق، گل خیرہ، گلنار، اشرفی، سورج مکھی، لالہ، نیلوفر، مریم، فنجانی، زیتون، مساحت، و دیگر پھول بکھرے پڑے تھے۔ دور کہیں قبلہ اپنی بیوی سے فرما رہے تھے'' لو دیکھ لو، ان لونڈوں کے کارناموں کو!''

ارسلان بلوچ ارسل

چھٹی سے شادی تک

ڈیوٹی پر تھا کہ اباجی کی کال آ گئی کہ میاں تمہارا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ چھٹی کی درخواست دے دو۔ تمہاری اور تمہاری سالی کی شادی ساتھ ساتھ کرنی ہے۔ جیسے ہی چھٹی کا کوئی چانس بنے تو بتا دینا کیونکہ شادی کی تاریخ پکی کرنی ہے۔

میں خوشی سے جھوم اٹھا اور اگلے ہی دن چھٹی کی درخواست جمع کروا دی۔ درخواست دے کے روم کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں دوست مل گیا۔ پوچھنے لگا ''سنا ہے تم چھٹی کی درخواست دینے گئے تھے۔ کیا بنا؟''

میں نے سارا ماجرا اسے بتایا اور روم کی طرف چل پڑا۔ راستے میں تین چار اور دوست ملے سب نے یہی سوال کیا اور سب کو تفصیل سے جواب دیا۔ پھر میں روز چھٹی کی خبر لینے ایڈمن آفس جاتا اور روز دس بارہ لوگ مجھ سے سوال کرتے ''کیا بنا''۔

ایک تو میں چھٹی نا ملنے کی وجہ سے پریشان تھا دوسرا اس سوال سے سخت تنگ تھا۔ خیر ایک دن غصے میں ایک پیپر پر اس سوال ''کیا بنا'' کا مکمل و مفصل جواب لکھا اور پچاس ساٹھ فوٹو کاپیاں کروا دیں۔ ایک اپنے روم کے دروازے پر، ایک آفس کے نوٹس بورڈ پر اور تین چار مختلف جگہوں پر چپکا دی اور باقی جو سوال کرنے آتا تو اسے تھما دیتا۔

چھٹی مل نہیں رہی تھی اور آخر میرے سسرال نے میری سالی کی شادی کی تاریخ طے کر دی۔ کچھ دن بعد جب سالی کی شادی تھی تو میں نے ہیڈ آفس کا رخ کیا۔

'' آج سالی کی بارات ہے، یار اگر مجھے چھٹی مل جاتی تو آج تیری جگہ تیری بھابھی بیٹھی ہوتی'' میں نے غمزدہ انداز میں دوست سے کہا۔

کہنے لگا ''اس حساب سے تو تم ہمیں کل ولیمہ کھلا رہے ہو۔''

میں نے کہا'' چلو تم میری دلہن لے آؤ تمہیں ولیمہ کی پارٹی مل جائے گی۔''

خیر اللہ اللہ کرکے چھٹی مل ہی گئی۔ پیشگی گھر اطلاع بھجوا دی

تا کہ کم از کم شادی کی تاریخ تو طے ہو جو فوراً طے ہوگئی اور میں گھر پہنچ گیا۔ شادی کی تیاریاں پورے زور و شور سے چل رہی تھی۔ میں سخت پریشان تھا۔ پہلی پہلی شادی جو تھی کوئی تجربہ وجربہ بھی نہیں تھا۔ اکیلے ڈر لگتا تھا اس لیے سوڈیڑھ سو لوگوں کے ساتھ بارات لے کے پہنچ گیا۔ وہ بھی پوری تیاری میں تھے، پرانے زمانے کی طرح جنگ سے پہلے خوب بینڈ باجا بجایا گیا۔

’’ابا جی اتنے لوگوں میں کیسے پہچانیں گے کہ میری ہونے والی بیوی کون سی ہے؟‘‘

’’بیٹا جہاں سب سے زیادہ خطرہ نظر آئے وہیں ہوگی۔‘‘

نظر دوڑائی تو ایک طرف لال جوڑے میں خطرناک حُسن و جمال کے اسلحے سے لیس ایک خاتون تشریف فرما تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی محترمہ ہیں جن کا میں نے بیت ہونا ہے۔۔۔ سوری جن سے میرا نکاح ہونا ہے۔

شادی ہوگئی پہلی رات تحفے میں گلاب کا پھول دیا تو محترمہ ناراض ہوگئیں کہ مجھے ہیرے کی انگوٹھی چاہیے۔

’’بیگم میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تمہاری جان کا۔ ہیرا تو زہر ہوتا ہے۔ کسی دن غصے میں چاٹ ہی نا لو۔ دوسرا اتنی مہنگی چیز چوری چکاری کے چکر میں تمہیں نقصان بھی ہوسکتا ہے۔‘‘

’’اچھا بابا کوئی سونے کی چیز ہی دے دو!‘‘

’’آں اچھا تو یہ بات ہے نیند آئی ہے یہ لو تکیا اور سو جاؤ۔‘‘

اگلی رات بیگم صاحبہ چھت پر کھڑی تھیں۔ چاند دیکھ کے کہنے لگیں ’’اے جی! دیکھیں چاند کتنا پیارا لگ رہا ہے۔‘‘

میں نے بیگم کی طرف دیکھا اور کہا ’’اس چاند سے زیادہ پیارا تو نہیں لگ رہا۔‘‘

بیگم حیرانگی سے بولی ’’ہائے میں مر جانواں۔‘‘

میں نے ہلکی سی آواز میں آمین کہا مگر بیگم نے سن لیا اور ناراض ہو کے نیچے چلی گئی اور میں ان کے پیچھے پیچھے نیچے آگیا بس وہ دن اور آج کا دن ان کے پیچھے پیچھے ہی گھوم رہا ہوں۔

ڈی کی الجس۔ نئی دہلوی

اوائلِ جوانی میں (لگاتار سگریٹ اور چاء نوشی سے) کافی بیزار رہے پھر آہستہ آہستہ عادت پڑگئی۔ ۶۰ کی دہائی میں ایک دن اچھے بھلے بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ یکا یک نقاد بن گئے۔ تب سے نقاد ہیں اور کافی ہاؤس یا چاء خانوں میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھار حجامت کے سلسلے میں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ ادبی رسائل کے شروع شروع کے پچیس تیس صفحات آپ کی تنقیدوں کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں۔ (جنہیں ایم اے اردو کے طلباء کو مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے)۔ ۶۷ء میں کسی نے کہا کہ اردو ادب پر ان کی تنقیدوں کے صفحات تلوائے جائیں اور پھر سارے ادب کا وزن کیا جائے تو تنقید یں کہیں بھاری نکلیں گی۔ آپ اسے شاباش سمجھ کر بہت خوش ہوئے اور رفتار دگنی کردی۔ یہ اردو نثر کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اسے زیادہ نہیں چھیڑتے۔ آپ کا بیشتر وقت اردو شاعری کی خبر لینے میں گزرتا ہے۔ ان دنوں پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ غالب کی شاعری پر رنگین کا اثر غالب ہے۔ رنگین نے بیشتر موضوع مصحفی سے اخذ کیے۔ مصحفی کی شاعری کا ماخذ میر کا تخیل ہے جنہوں نے بہت کچھ سراج دکنی سے لیا۔ سراج دکنی نے ولی دکنی سے اور ولی دکنی نے سب کچھ دکن سے چرایا۔ (چونکہ مقالہ رسائل کے لئے نہیں، یونیورسٹی کے لئے ہے، اس لئے آپ نے شعراء کو اتنا برا بھلا نہیں کہا جتنا کہ اکثر کہا کرتے ہیں)۔ اگر چاء اور سگرٹوں میں غذائیت ہوتی تو آپ بھی کے پہلوان بن چکے ہوتے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کی صحت کو دیکھ کر بڑی آسانی سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ دراصل آپ کے رویے (اور تنقید) کا دارومدار سگرٹوں اور چاء کی پیالیوں کی تعداد پر ہے۔ روزانہ پچاس سگرٹوں اور پچیس پیالیوں تک تو آپ شاعری کے گناہ معاف کرسکتے ہیں، لیکن اس کے بعد آزاد شاعری تک کو نہیں بخشتے۔ ۶۸ء میں آپ کو یونہی وہم سا ہوگیا تھا کہ آپ عوام میں مقبول نہیں ہیں لیکن چھان بین کرنے کے بعد ۶۹ء میں معلوم ہوا کہ وہم بے بنیاد تھا۔ فقط وہ جو انہیں اچھی طرح نہیں جانتے انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن جو جانتے ہیں وہ باقاعدہ ناپسند کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو (پتہ نہیں کیوں) مظلوم اور ستایا ہوا سمجھتے ہیں اور اکثر زندگی کی محرومیوں کی داستان (کافی ہاؤس میں) سنایا کرتے ہیں، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے ”پہلے ان کے خواب تمام ہوئے۔ پھر دانت تمام ہوئے۔ پھر دوست تمام ہوئے (کم از کم آپ کا یہی خیال تھا کہ وہ دوست تھے)۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ آپ کو بنی نوع انسان سے قطعاً نفرت نہیں۔ فقط انسان اچھے نہیں لگتے۔ کھیل کود کو اعلیٰ کوٹل پنے کا دشمن سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ لمبے لمبے سانس لینے سے بھی نفرت ہے۔ ۶۹ء میں وزن کرتے وقت مشین سے کارڈ نکلا جس پر وزن پونے اکتالیس سیر کے علاوہ یہ لکھا تھا ”ابھی کچھ امید باقی ہے۔ غیر صحت مند حرکتیں چھوڑ کر ورزش کیجئے۔ صحیح غذا اور اچھی صحبت کی عادت ڈالئے اور قدرت کو موقع دیجئے کہ آپ کی مدد کر سکے۔“ آپ نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا۔ حالانکہ اگر کسی مشین نے کبھی سچ بولا ہے تو اس وزن کی مشین نے ۶۹ء میں بولا تھا۔

ایک فرضی خاکہ از ڈاکٹر شفیق الرحمن

راشد حمزہ

کچھ گنج شریف کی تعریف میں

جب میں افغانستان ایک تفریحی دورے پر جا رہا تھا تو مجھے لنڈے کوتل کے مقام پر حجامت کرنے کی سخت ضرورت آن پڑی، وہاں پر مختصر قیام میں اپنا مقصد خاص پورا کرنے کیلئے ایک حجام کے پاس گیا تو اس نے حجامت کے ساتھ ساتھ سر منڈوانے کا بھی مشورہ دیا۔ پہلے پہل تو میں نے سختی سے انکار کیا لیکن اس نے جواب میں ایسی دلیل داغی کہ میرا سچ مچ سر منڈوانے کا بہت دل چاہا۔ یوں ہم سر منڈوائے افغانستان سدھار گئے۔

صوبہ ہلمند کافی خوبصورت علاقہ تھا مگر خوبصورتی میں ایک کمی رہ گئی ہے جو کہ قدرتی نہیں ہے مصنوعی ہے، وہ کمی مزار شریف میں پوری ہوسکتی ہے لیکن مزار شریف میں ہلمند کی کمی کا پورا ہونا ممکن نہیں رہتا۔ میرا قیام صوبہ ہلمند کے جس علاقے میں تھا وہاں خواتین کا گنجا طبقہ تو کیا سرے سے خواتین کا طبقہ ہی موجود ہی نہیں تھا، یا شاید موجود تو تھا لیکن مجموعی طور پر شٹل کاک برقعوں میں ملبوس تھا۔ افغانستان میں مزار شریف کافی جدید اور خوبصورت شہر مانا جاتا ہے۔ نوے کی دہائی میں جو واحد یونیورسٹی تھی وہ مزار شریف میں تھی۔ جنرل رشید دوستم کے زمانے میں مزار شریف میں خواتین کو خاصی آزادی حاصل رہی تھی۔ جب پورا افغانستان شورش کی زد میں تھا تو مزار شریف کے باسی قتل اور خون سے نابلد تھے۔ دوستم کی حکومت میں خواتین کا منی سکرٹ پہننا عام تھا، کہنے کا مطلب یہ کہ مزار شریف میں ہلمند کی نسبت خوبصورت خواتین کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ خواتین کی کثرت خواتین کی مجموعی زیادہ تعداد نہیں بلکہ مردوں سے زیادہ عام نظر آنے والی خواتین ہوتی ہیں۔ ہلمند میں جہاں خواتین نہیں تھیں وہاں بھی کسی خاتون نے میرے گنجے ہونے پر اعتراض نہیں کیا اور مزار شریف میں خواتین کی کثرت ہونے کے باوجود کسی خاتون نے میرے گنجے ہونے کو برا ماننے کی حد تک توجہ نہیں دی۔ یقین جانئے میری فارغ البالی کے اثراتِ بد دورے پر معمولی سے بھی پڑے محسوس نہیں ہو رہے تھے اور یہ کہ پورے دورے کے دوران میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا رہا۔ جب کبھی کوہ ہندوکش کی سمت سے یخ بستہ خنک

ہوائیں گنجے سر کے عین ماتھے سے ٹھکراتیں تو عجیب سی فرحت کی لہریں سر سے ہوتی ہوئی جسم میں پھیل جاتیں۔

ہلمند میں مجھے پہاڑی کے دامن میں ایک غار سے چند صفحے ملے جو اتفاق سے اس علاقے کے عظیم مفکر ''صفور زدران'' کے تحریر کردہ تھے۔ ایک صفحے پر مختصر سی پر اثر تحریر لکھی ہوئی تھی جس میں پتہ نہیں صفور زدران نے اپنی محبوبہ کی زلفوں کی شان میں کچھ تعریف و اریف لکھی تھی یا تنقید، یہ سمجھنے سے میں یکسر قاصر رہا۔ اس نے کچھ ایسا لکھا تھا:

''اے شاد اے میری محبوبہ میری جان!! میں تمہاری زلفوں کی خوبصورتی اور مدح میں شعری دیوان اور نثری دفتر لکھ سکتا ہوں لیکن پھر بھی اگر ان زلفوں سے ایک بھی بال سالن میں گر جائے تو میں اسے کھا نہیں سکتا، ہضم نہیں کر سکتا پھر یہ تمہاری گھنی زلفیں جوؤں کی آماجگاہ اور کمین گاہیں بھی تو ہیں۔''

میں وہ صفحہ اس خیال سے اپنے ساتھ لئے بغیر ہلمند کی مرکزی شہر میں موجود شاد کے مزار پر پہنچا کہ اگر اس نے کسی طرح اس تحریر کی بو محسوس کی تو قبر میں گنجی ہونے کی کوشش شروع کرے گی۔ میں بتانا بھول گیا کہ شاد ستر ہویں صدی میں ہلمند کی گورنر رہ چکی ہے جبکہ صفور زدران صاحب اُس پر بن دیکھے ہزار دل و جان سے عاشق ہو چکے تھے۔ وجہ صرف یہ تصور تھا کہ ایک خاتون ہلمند کی گورنر ہے اور وہ اس پورے علاقے کا انتظام چلاتی ہیں اور خاصے بہتر انداز سے چلاتی ہے۔

صفور کے لئے یہ نہایت انہونا واقعہ تھا، جس کی وجہ سے وہ شاد پر عاشق ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ حقیقت میں ہم سب گنجے ہی ہیں۔ یہ جو بال ہم رکھتے ہیں، ان سے ہم اپنے گنجے پن کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواتین کو گنجا پن خوبصورتی کی ضد لگتی ہے، اس لئے جیسے جیسے ان کے گیسو دراز اور گھنے ہوتے چلے جاتے ہیں، اُن کی خوشیاں اور مسرتیں بھی دوبالا ہوتی جاتی ہیں۔

یہ تصور کرنا کہ گنجا پن بدصورتی کی ایک صورت ہے، نہایت غیر معقول بلکہ صریحاً غلط ہے۔ میرا اپنی محبوبہ کے لئے خصوصی اور باقی ماندہ خواتین کیلئے عمومی مشورہ ہے کہ وہ سروں کو منڈوائیں اور بہت سارے گھمبیر مسائل سے نجات پائیں، پھر حسن صورتی میں کمی نہ آنے کی ضمانت بھی میں دے رہا ہوں۔

انسانوں کو شاید گنجا ہونا اتنا برا نہ لگتا اگر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے غیر ضروری طور پر محبوباؤں کی زلفوں کی شانِ اقدس میں پورے کے پورے دیوان اور کتابیں نہ لکھی ہوتیں۔ اتنا تذکرہ محبوباؤں کے ہونٹوں کا نہیں ملتا جتنا زلفوں کا کیا جا چکا ہے حالانکہ زلفیں جوؤں کی آماجگاہ کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی ہیں جبکہ ہونٹوں سے رنگ برنگ خوبصورت تتلیاں اور پیارے پیارے بھونرے رس پیتے ہیں۔ اب اگر خواتین اپنے مزاج میں تبدیلی لائیں اور سر منڈوائیں تو اُن کی زلفوں میں اسیر شدہ شاعروں سے بھی گلوخلاصی ممکن ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہماری آدھا جیب خرچ زلفوں کی نذر ہونے سے بھی بچ سکتا ہے۔ یہ کتنی نامعقول بات ہے کہ جسم کے اس حصے پر ہم آدھی جیب خرچ صرف کرتے ہیں جس پر اگر بلیڈ یا قینچی چلائی جائے تو درد بھی نہیں محسوس ہوتا اور رنگ بھی چوکھا چڑھتا ہے۔

آدھی دنیا بالوں کے گرنے سے پریشان ہے۔ اُن کی جملہ پریشانیوں کا سب سے آسان حل یہی ہے کہ اپنے اپنے سروں کو منڈوا لیں، بال گرنے کے مسائل منڈواتے ہی سو فیصد ختم ہو جائیں گے۔

جب ہم زندہ رہنے کے متشدد اور کٹھن زدہ تجربے سے خود کو گزار رہے ہیں تو مزید ایک عدد ننھا منا سا تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس تجربے کی بدولت ایک ایسی لامتناہی مسرت سے بہرہ مند ہو سکیں جو عدیم المثال ہو۔ مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں مثلاً بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ مشہور فاتح چنگیز خان جب پیدا ہوئے تو نہایت گنجے تھے پھر اس نے شادی بھی ایک ایسی خاتون سے کی تھی جو فارغ البال تھی۔ مشہور فلسفی افلاطون اور ارسطو بھی کسی وقت گنجے رہ چکے تھے۔ اُن کی قابلیت کی وجہ بھی اُن کا فارغ البال ہونا تھی وغیرہ وغیرہ۔

حنیف عابد

نگوڑے ترقیاتی منصوبے

ارے سنتی ہو! کہاں ہو شرافت بیگم جلدی آؤ، دیکھو میرے کپڑوں کا ستیا ناس ہو گیا ہے، آگ لگے ان نانجاروں کو موئی تمہاری گلی تو دلدل بنی ہوئی ہے۔"

چنی بیگم کی چیخ و پکار سُن کر شرافت بیگم دوڑتی ہوئی آئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ صحن میں چنی بیگم کھڑی ہیں، ان کے پیر کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں، ٹوپی دار برقعے کے کنارے بھی کیچڑ سے سنے ہوئے ہیں، چنی بیگم ایک ہاتھ سے اپنا ٹوپی دار برقع تھامے دوسرا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوسنے دینے میں لگی ہوئی ہیں۔ شرافت بیگم نے جو یہ صورتحال دیکھی تو لپک کر آگے بڑھیں، انہوں نے ایک ہاتھ میں مونڈھا پکڑا اور اُسے چنی بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں "ارے آپا آپ اس پر بیٹھو میں پانی لاتی ہوں"۔

چنی بیگم مونڈھا تھامتے ہوئے بولیں "اے بہن ٹھہرو یہ مُوا برقع تو کہیں ٹانگ دو یہ بھی بُری طرح سے لتھڑ گیا ہے"۔

شرافت بیگم نے برقع ہاتھ میں پکڑا اور اندر چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ہاتھ میں پانی کی بالٹی اور ایک ڈونگا لیے ہوئے نمودار ہوئیں۔ جلدی جلدی انہوں نے چنی بیگم کے پیر دُھلوائے اور اُن کی چپلیں بھی دُھلوائیں، چنی بیگم اس دوران جانے کیا کچھ کہے جارہی تھیں شرافت بیگم کے پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ اچھی طرح چنی بیگم کے ہاتھ پیر دُھلوانے کے بعد انہوں نے چنی بیگم کو صحن میں پڑے ہوئے تخت کی طرف چلنے کو کہا، اسی دوران اُن کی بیٹی خیر النسأ صحن میں آئی جسے دیکھتے ہی شرافت بیگم کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ اُنہوں نے خیر النسأ سے کہا کہ وہ چُنی خالہ کا برقع لے جائے اور غسل خانے میں جا کر اُسے اچھی طرح دھو کر صحن میں تنی ہوئی ڈوری پر ٹانگ دے۔

شرافت بیگم خود چنی بیگم کے ہمراہ تخت پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہی اُنہوں نے پاندان کھولا اور ایک گلوری لگا کر چنی بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں "خیر تو ہے؟ آپ آج کیسے راستہ بھٹک کر یہاں آ گئیں"۔

چنی بیگم کا پارا جواب کسی حد تک اُتر چکا تھا بولیں "اے ہے! راستہ بھٹکنے کی بھی تم نے خوب ہی کہی، لو کیا میں کوئی بلا ہوں جو بھٹکتی ہوئی تم تک پہنچی ہوں؟"

شرافت بیگم یہ سُنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں، انہوں نے کہا
''ارے آپ تو بُرا ہی مان گئیں میں تو محاورۃً بول رہی تھی، آپ کا
گھر ہے جب دل کرے آؤ''
چنی بیگم بولیں ''ناں بابا ناں! میری آتی ہے جوتی تمہاری گلی
تو دلدل بنی ہوئی ہے، مجھے اس دلدل سے تیر کر آنا منظور نہیں
ہے۔''
شرافت بیگم یہ سُن کر مسکرائیں، انہوں نے کہا ''آپا آج کل
ہماری حکومت کو ترقیاتی کام کرانے کا ہیضہ سا ہو گیا ہے، پچھلے ایک
مہینے سے گلی کھدی پڑی ہے، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے، کبھی
کہتے ہیں کہ سیوریج لائن ڈل رہی ہے، کبھی کہتے ہیں کہ سڑک نئی
بن رہی ہے، ایک ماہ ہو گیا ہے جب سے کھود کر گئے ہیں پلٹ کر
جھانکنے تک نہیں آئے، چار دن سے سیوریج کی لائن بند ہونے کی
وجہ سے گلی گندے پانی سے بھری ہوئی ہے، یونین کونسل والوں کو کئی
مرتبہ شکایت کروا چکے ہیں بس ایک ہی جواب ملتا ہے کہ ترقیاتی
کام ہو رہا ہے''۔
چنی بیگم یہ سُنتے ہی پھٹ پڑیں ''ارے یہ کون سا ترقیاتی کام
ہو رہا ہے جس نے گلی کو دلدل بنا دیا ہے؟ بھلا کوئی اِن لوگوں کو
پوچھنے والا ہے کہ نہیں؟ جگہ جگہ کھدائی کر رکھی ہے، لوگوں کا گھروں
سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے، بچے اسکول کیسے جائیں گے؟ گھر کے
مرد کام کاج کے لیے کیسے نکلیں گے؟ عورتیں گھر کا سودا سُلف کیسے
لائیں گی؟ خدانا خواستہ کسی کے گھر میں کوئی بیمار ہو جائے یا کسی کے
گھر فوتگی ہو جائے تو لوگ اسپتال کیسے جائیں گے؟ جنازے کیسے
اُٹھیں گے؟ بھاڑ میں جائیں ایسے نگوڑ مارے ترقیاتی منصوبے جو
زندگی کو عذاب بنا دیں''۔
چُنی بیگم کی جلی کٹی تقریر جاری تھی کہ اچانک خیر النسأ صحن میں
آئی اور چُنی بیگم کا جہازی سائز کا ٹوپی دار برقع صحن میں پھیلا دیا۔
چنی بیگم برقع دیکھتے ہیں بولیں ''ارے بٹیا! اچھی طرح صاف
کر دیا ہے یا نہیں''۔
چُنی بیگم کی بات سُن کر خیر النسأ بولی ''خالہ بے فکر رہیں، میں
نے اچھی طرح صاف کر دیا ہے''۔
''اے بیٹا اللہ تجھے خوش رکھے، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو''
چنی بیگم نے خیر النسأ کو بیٹھے بیٹھے ڈھیروں دُعائیں دے
ڈالیں۔ خیر النسأ مسکراتی ہوئی اندر جانے لگی تو شرافت بیگم نے
آواز دی ''ارے خیر النسأ! دیکھو چائے بن گئی ہوگی کچن سے لے
آؤ اور ساتھ ہی کچھ کھانے کو بھی لیتی آنا''۔
خیر النسأ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ چنی بیگم
نے خیر النسأ کی جانب گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا ''شرافت
بیگم اللہ نے تمہیں بہت ہی پیاری بٹی دی ہے، ماشا اللہ! اب تو
بڑی ہو گئی ہے، جس کے گھر جائے گی اُسے جنت بنا دے گی''۔
شرافت بیگم نے مُسکراتے ہوئے چنی بیگم کی طرف دیکھا اور
کہا ''آپا دُعا کرو، اللہ تعالیٰ کوئی نیک اور شریف رشتہ بھیجے تو میں
خیر النسأ کے ہاتھ پیلے کر کے اِس فرض سے بھی فارغ ہو جاؤں''۔
چنی بیگم بولیں ''ہاں ہاں، کیوں نہیں! میری نظر میں ایک دو
اچھے رشتے ہیں یہ موئی تمہاری گلی ٹھیک ہو جائے تو میں اُنہیں
بلاؤں گی تمہارے گھر، آج میں اسی سلسلے میں آئی تھی کہ تم سے پوچھ
لوں تو بات آگے بڑھاؤں''۔
شرافت بیگم بولیں ''لو جی یہ تو بہت اچھی بات ہے، نیکی اور
پوچھ پوچھ، آپا تم جب چاہو انہیں بلالو''۔
ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خیر النسأ صحن میں چائے کی
ٹرے اُٹھائے ہوئے داخل ہوئی۔ اُس نے ٹرے تخت کے نزدیک
پڑی ہوئی ایک میز پر رکھی اور گرم گرم سموسے پلیٹ میں رکھ کر چنی
بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی ''خالہ بی آپ یہ گرم گرم سموسے
کھائیں جب تک میں چائے نکال کر دیتی ہوں''۔
چنی بیگم نے سموسے کی پلیٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ''بیٹا تم
جاؤ ہم چائے خود لے لیں گے''۔
خیر النسأ سر جھکاتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ سموسے کھانے
اور چائے پینے کے بعد چنی بیگم نے چلنے کا ارادہ کیا تو اچانک وہ
پھر بیٹھ گئیں۔ شرافت بیگم نے سوالیہ نظروں سے اُن کی جانب
دیکھا تو وہ بولیں ''اے نوج! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تمہارے گھر
کے باہر تو دلدل ہے میں گھر کیسے جاؤں گی؟''
شرافت بیگم، مسکراتے ہوئے بولیں ''آپا تم فکر نہ کرو میں سلیم
کو بول دیتی ہوں وہ تمہیں موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جائے گا''۔

یہ کہتے ہوئے شرافت بیگم نے آواز دی "بیٹا سلیم! جاؤ ذرا اپنی چنی خالہ کو اُن کے گھر تک چھوڑ آؤ"۔

چنی بیگم بولیں "اے بہن یہ موئے ترقیاتی منصوبے پتہ نہیں کب مکمل ہوں گے؟ ہمارے یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے، میں اب نہیں آنے کی، جب تمہاری گلی ٹھیک ہو جائے تو مجھے اطلاع کروا دینا"۔

چنی بیگم کی بات سُن کر شرافت بیگم سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں، جیسے اُوپر والے سے پوچھ رہی ہوں کہ یا اللہ آپ ہی بتائیں یہ ترقیاتی منصوبے کب مکمل ہوں گے؟ کب ہماری زندگی میں سکون آئے گا؟ کب تک ہم کو یہ اذیت مزید برداشت کرنی ہو گی؟ ہمارے دکھوں کا مداوا کون کرے گا؟ لیکن اوپر سے کوئی جواب نہیں آیا، دور دور تک سکوت کا عالم طاری تھا۔

حمید پائپ سلگا رہا تھا کہ وہی کرنل کمرے میں داخل ہوئے۔ حمید نے عہدے کے لحاظ سے احتراماً اپنا پائپ چھپانا چاہا۔

"اوہ۔۔۔ نو نو ڈیئر۔۔۔ کیری آن اسموکنگ۔ میرا نام اے ایچ عشقی ہے"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا "میں ساجد حمید ہوں جناب!"

۔"آئی نو۔۔۔ آئی نو۔ تعریف سن چکا ہوں تمہاری۔ بہت زندہ دل آدمی ہو، ادبی ذوق بھی رکھتے ہو"۔

حمید کی جان نکل گئی آخری جملے پر۔۔۔ نام ہی سے شاعر معلوم ہوئے تھے یہ حضرت۔ اب کیا ہوگا۔

"چلو کینٹین میں بیٹھیں"

"چلیے"۔ حمید اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کینٹین میں پہنچ کر کہیں بیاض نہ نکل آئے۔ کینٹین زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ چھوٹے سے ہال میں چند آدمی میزوں پر نظر آئے ہلکی آواز سے ریکارڈ بج رہا تھا:۔

گرمئی حسرت ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

دفعتاً کرنل صاحب نے قہقہہ لگایا اور حمید حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ذرا ملاحظہ ہو" کرنل صاحب نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم فوجی اس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کریں تو کسی حد تک درست ہو سکتا ہے لیکن یہ خالص قسم کے شاعر۔۔۔ ارے میاں! حسرت میں گرمی کہاں ہوتی ہے؟ حسرت تو بیچارگی کی پیداوار ہے اور وہ بھی حسرت ناکام یعنی یخ کا تودہ۔۔۔ اور شاعر صاحب ہیں کہ چراغ بن گئے، ہوئی نا میر صاحب سے آگے چھلانگ لگانے کی حسرت ناکام۔۔۔ ہونہہ۔ لاحول ولا۔۔۔"

"جی ہاں! واقعی۔" حمید نے بات ٹالنے کے لیے بیدلی سے ہنس کر کہا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ اپنا کوئی شعر نہ ٹھونک ماریں۔ کرنل صاحب نے اشارے سے ویٹر کو بلا کر کافی کا آڈر دیا اور حمید سے بولے: "شاعری جزویست از پیغمبری۔ اس کے لیے پیغمبرانہ شعور و ادراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں یار لوگ یہی نہیں جانتے کہ حسرت میں ٹھنڈک ہوتی ہے یا گرمی اور میاں میں تو علامتی شاعری کا قائل ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔" حمید خالی الذہنی کے عالم میں بولا۔

"ذرا ایک شعر سنو"

حمید نے ٹھنڈی سانس لی

انھوں نے شعر رسید کر دیا:۔

ان کا شیوہ نہیں چناغ چھنن
چھیڑ بیٹھے تھے ہم پناغ چھنن

حمید نے سنی ان سنی کر کے ستائشی انداز میں سر کو جنبش دی۔

"کیا سمجھے"

"بہت خوب۔ سبحان اللہ"

"میں پوچھ رہا ہوں کیا سمجھے"۔ کرنل صاحب نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا

"دراصل"

"تم قطعی نہیں سمجھے" کرنل صاحب کا موڈ خراب ہو گیا "سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہاں تو بس وہی پرانی لکیریں پیٹی جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں، بالکل"

"مثلاً"

"جی"

"کوئی مثال پیش کرو پرانی لکیر پیٹنے کی"

"وہ۔۔۔ کیا کہتے ہیں۔۔۔ لکیر کا فقیر"

"جی نہیں"۔۔۔ کرنل خشک لہجے میں بولے۔ "لکیر کا فقیر محاورہ ہے۔"

"محاورہ بھی تو پرانی لکیر ہے"

"لیکن وہ مجبوری ہے۔ محاورے بہر حال رائج رہیں گے"

"میں مجبوری کا قائل نہیں۔" حمید بھی برا سا منہ بنا کر بولا

"تو تم محاوروں کے بغیر بھی۔۔۔"

"جی ہاں، قطعی۔۔۔ محاورے بھی کوئی چیز ہوئے۔ لاحول ولا۔"

"تم پتا نہیں کیسی باتیں کر رہے ہو، میں تو تمہیں خوش ذوق آدمی سمجھ رہا تھا"

"مجھے جہنم میں جھونکیے، میں آپ کے شعر کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں"

"غالب کا وہ شعر سنا ہے کبھی"؛

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

"واہیات شعر ہے" حمید برا سا منہ بنا کر بولا

"ہے نا واہیات۔" کرنل صاحب چہکے۔ اس کے مقابلے میں میرا شعر ہے:

ان کا شیوہ نہیں چناغ چھنن
چھیڑ بیٹھے تھے ہم پناغ چھنن

حمید نے ناک بھوں پر زور دے کر یہ شعر دوبارہ سنا، اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کرنل صاحب بولے:

"دھول دھپے میں وہ بات کہاں جو چناغ چھنن میں ہے۔۔۔ یہ ہے علامتی شاعری۔۔۔ چناغ تھپڑ کی آواز اور چھنن چوڑیوں کی جھنکار۔"

"ایہام الصوت کہتے ہیں اسے، یہ علامتی شاعری کہاں سے ہوئی۔" حمید نے جی کڑا کر کے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو تم کچھ نہیں جانتے"

اتنے میں کافی آ گئی اور حمید نے کہا "قطعی شاعری کرنے والوں میں پیش دستی کی جرات ہی نہیں ہوتی، اس لیے وہ شاعری بھی علامتی کرتے ہیں۔ غالب کا پیشہ سپاہ گری تھا، وہ میری طرح آنریری کیپٹن نہیں تھے۔"

"تم مجھ پر چوٹ کر رہے ہو کیپٹن حمید"

"جی نہیں، میں خود بھی علامتی شاعری کرتا ہوں"

"اچھا تو سناؤ کچھ، میں بھی دیکھوں" کرنل صاحب غرائے

حمید نے کافی کے دو کپ تیار کیے اور ایک کرنل صاحب کی طرف بڑھاتا ہوا بولا:

دیکھو تو عجیب ماجرا ہے
فانوس پہ فالسہ دھرا ہے

"مطلب"

"مطلب کسی ماہر نفسیات سے پوچھیے۔ اگر یہاں سنسر نے شاعر کو اجازت دی ہوتی تو علامتی شاعری کیوں کرتے"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو"

"جی نہیں، بلکہ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی شاعری علامتی ہرگز نہیں، آپ محض اس وہم میں مبتلا ہیں کہ آپ کی شاعری علامتی ہے"

مہلک شناسائی از ابن صفی

خادم حسین مجاہدؔ

پوری گھر والی

یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عورتوں میں عقل نہیں ہوتی اور اگر بالفرض محال کسی ایک آدھ میں ہو بھی تو وہ اسے استعمال نہیں کرتی اس لئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر رہی ہے۔ بڑی خواہش تھی کہ ہماری گھر والی لاکھوں میں ایک بے شک نہ ہو مگر ان ہزاروں میں ایک ضرور ہو جو عقل رکھتی ہیں۔

مگر ہمارے ایسے تیز نصیب کہاں۔ تبادلہ خیالات کے بعد دعا کی کہ جو حماقت ہوگئی ہے اللہ اسے نبھانے کی توفیق عطا کرے کیونکہ اس سلسلے میں مزید کوئی تجربہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ نتیجہ پہلے جیسے نہیں نکلے گا۔

اس کو صفائی کا وہم ہے آندھی ہو یا طوفان، بارش ہو یا دھوپ ہو، گرمی ہو یا سردی، صحت ہو یا بیماری فرش ضرور دھلیں گے چاہے بجلی کا جتنا بل آجائے اور فرش دھلنے سے لے کر سوکھنے تک گھر میں کرفیو ہوتا ہے کوئی بچہ اور بڑا گھر میں نہیں آسکتا اور جو گھر میں ہیں وہ باہر نہیں جاسکتے۔ حالانکہ ہماری صفائی کرنا ہوتی یا گھر کی والدہ نے ہمیشہ جھاڑو استعمال کی نگران کی کمر دکھتی ہے اس میں بھی عجب اصول ہے کہ جو کمرے ذرا کم استعمال ہوتے ہیں ان کی مہینوں صفائی نہیں کرنی۔

اگر میں کبھی بیمار پڑ جاؤں تو ساتھ ہی بیمار پڑ جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہمارے درمیان کوئی لیلیٰ مجنوں والا عشق ہے بلکہ اس لئے کہ زیادہ دیکھ بھال نہ کرنی پڑے اور جو تھوڑی بہت خدمت کرتی ہے وہ بھی یہ جتا کر کہ ”دیکھو میری اپنی طبیعت خراب ہے پھر بھی آپ کی خدمت کر رہی ہوں خدمت میں بھی اس کی اپنی حدود ہیں سارے جسم کو دبانا ہے لیکن پیروں کو نہیں کہ اس سے ہاتھوں میں ہڈیاں چبھتی ہیں اور درد ہوتا ہے بام سے مالش کرنی ہے لیکن ونٹو جین یا آیوڈیکس سے نہیں کہ ان کی بُو ہے اب میں ان میں خوشبو ڈلوانے سے تو رہا تے کرنے کی اجازت نہیں کہ اسے دیکھ کر بیگم صاحبہ کو بھی تے آجاتی ہے اس لئے اگر کوئی ایسی ایمرجنسی پیش آجائے تو باتھ روم کی طرف دوڑ لگانی پڑتی ہے۔

خود بیگم صاحبہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے محض ۶۵ دن ہی کسی قدر صحت مند ہوتی ہیں یا ظاہر کرتی ہیں اس لئے ڈاکٹروں کے پاس حاضری روٹین کی بات ہے۔ جہاں تک دوا کا تعلق ہے تو دو تین خوراکیں کھا کر چھوڑ دیتی ہے کہ آرام نہیں آیا کیونکہ پرہیز جو

نہیں کرتی۔ایک بار ڈاکٹر نے چربی زائل کرنے کے لئے بڑی مہنگی دوا لکھی جو تنخواہ پر پتھر رکھ کے لے آیا۔صبح دیکھا کہ گھی سے تر بتر پراٹھا کھانے میں مصروف تھیں۔میں نے کہا"اگر پرہیز نہیں کرنا تو اتنی مہنگی دوا کھانے کی کیا ضرورت ہے؟" بولیں "آپ کہتے ہیں تو نہیں کھاتی (دوا) لیکن اگر میں پراٹھا نہ کھاؤں تو اٹھا نہیں جاتا اور اگر اٹھوں گی نہیں تو گھر کا کام کون کرے گا۔" کئی بار کہا ہے"مجھے دوسری شادی کرنے دو تمھیں بھی آرام مل جائے گا اور میری بھی خدمت وہی کرلے گی" مگر ان کو اپنی بے آرامی منظور ہے مگر مجھے سکون آجائے یہ برداشت نہیں ہوتا حالانکہ میں کم سے کم دو شادیوں کا قائل تھا بلکہ پہلی شادی ہی اس لئے کی تھی کہ دوسری کرسکوں مگر ان کی وجہ سے میرے نظریات پہلے جیسے نہیں رہے،سوچتا ہوں کہ دوسری بھی پہلی جیسی ہوئی جس کا کافی امکان ہے کیونکہ عورتوں کی اکثریت ایک جیسی ہوتی ہے چاہے مختلف بھی لگ رہی ہوں تو پھر کہاں جاؤں گا۔

اس کے مالیاتی اصول یہودیوں اور ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔میکے یا سسرال کے بڑوں سے موقع بموقع جو بھی نقدی

میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں۔ایک بہت بڑے گھر میں رہتا ہوں۔زندگی کے دن کاٹتا ہوں۔چونکہ سب سے چھوٹا ہوں اس لیے گھر میں سب میرے بزرگ کہلاتے ہیں۔یہ سب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔انھیں چاہے اپنی صحت کا خیال نہ رہے،میری صحت کا خیال ضرور ستاتا ہے۔داداجی کو ہی لیجیے۔یہ مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے کیونکہ باہر گرمی یا برف پڑ رہی ہے۔بارش ہورہی ہے یا درختوں کے پتے جھڑ رہے ہیں۔کیا معلوم کوئی پتہ میرے سر پر تڑاخ سے لگے اور میری کھوپڑی پھوٹ جائے۔ان کے خیال میں گھر اچھا خاصا قید خانہ ہونا چاہیے۔ان کا بس چلے تو ہر ایک گھر کو جس میں بچے ہوتے ہیں سنٹرل جیل میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔وہ فرماتے ہیں بچوں کو بزرگوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے وہ ہر وقت مجھ سے چلم بھرواتے یا پاؤں دبواتے رہتے ہیں۔

دادی جی بہت اچھی ہیں۔پوپلا منھ،چہرے پر بے شمار جھریاں اور خیالات بے حد پرانے۔ہر وقت مجھے بھوتوں جنوں اور چڑیلوں کی باتیں سناسنا کر ڈراتی رہتی ہیں۔"دیکھ بیٹا مندر کے پاس جو پیپل ہے اس کے نیچے مت کھیلنا۔اس کے اوپر ایک بھوت رہتا ہے۔آج سے پچاس سال پہلے جب میری شادی نہیں ہوئی تھی میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس پیپل کے نیچے کھیل رہی تھی کہ یک لخت میری سہیلی بے ہوش ہوگئی۔اس طرح وہ سات دفعہ ہوش میں آئی اور سات دفعہ بے ہوش ہوئی۔جب اسے ہوش آیا تو اس نے چیخ کر کہا"بھوت"!اور وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔اسے گھر پہنچایا گیا جہاں وہ سات دن کے بعد مرگئی اور وہاں،پرانی سرائے کے پاس جو کنواں ہے اس کے نزدیک مت پھٹکنا۔اس میں ایک چڑیل رہتی ہے۔وہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔اس چڑیل کی یہی خوراک ہے۔"

ماتاجی کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ پر ماتمانہ کرے مجھے کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے تالاب میں تیرنے کے لیے اس لیے نہیں جانے دیتیں کہ اگر میں ڈوب گیا تو؟ پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے اس لیے نہیں کھیلنے دیتیں کہ اگر کپڑوں میں آگ لگ گئی تو؟ پچھلے دنوں میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ماتاجی کو پتا لگ گیا۔کہنے لگیں،کرکٹ مت کھیلنا۔بڑا خطرناک کھیل ہے۔پرماتمانہ کرے اگر گیند آنکھ پر لگ گئی تو؟

بڑے بھائی صاحب کا خیال ہے جو چیز بڑوں کے لیے بے ضرر ہے چھوٹوں کیلیے سخت مضر ہے۔خود چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں لیکن اگر کبھی مجھے پان کھاتا دیکھ لیں فوراً ناک بھوں چڑھائیں گے۔پان نہیں کھانا چاہیے۔بہت گندی عادت ہے۔سینما دیکھنے کے بہت شوقین ہیں لیکن اگر میں اصرار کروں تو کہیں گے،چھوٹوں کو فلمیں نہیں دیکھنا چاہیے۔اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

بڑی بہن کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ان کی فرمائشیں اس قسم کی ہوتی ہیں"ہارمونیم پھر خراب ہوگیا ہے اسے ٹھیک کرالاؤ۔ستار کے دو تار ٹوٹ گئے ہیں اسے میوزیکل ہاؤس لے جاؤ۔طبلہ بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگا ہے اسے فلاں دکان پر چھوڑ آؤ۔" جب انھیں کوئی کام لینا ہو تو بڑی میٹھی بن جاتی ہیں۔کام نہ ہو تو کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔خاص کر جب ان کی سہیلیاں آتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فضول باتیں بناتی ہیں،اس وقت میں انھیں زہر لگنے لگتا ہوں۔

مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ از کنہیالال کپور

وصول ہوتی ہے بحق بیگم سرکار ضبط ہو جاتی ہے اور واپسی ان کو جو دینا ہوتا ہے وہ مجھے اپنی جیب سے دینا ہوتا ہے اگر کبھی حساب طلب کروں تو کہتی ہے کہ ان کے تو میں نے جوتے اور کپڑے لے لئے، آپ کی ہی بچت کی ہے، وہ نہ ہوتے تو آپ کو جیب سے دینا پڑتے حالانکہ ان کی ضرورت ہی کہاں تھی لیکن ان کی خواہش تو ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ جوتے اور کپڑے ہوں اور بہت ہوں اور اس بہت کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ ہر فنکشن کے لئے اس کو نئے کپڑے چاہئیں جب میں اس کی توجہ الماری میں موجود کچھ نئے جوڑوں کی طرف دلاتا ہوں تو کہتی ہے"وہ تو میں ایک بار پہن چکی ہوں اور وہ سب دیکھ چکے ہیں۔" حد تو یہ کہ صرف شادی یا تقاریب کے لئے ہی نہیں بلکہ تعزیت پر جانے کے لئے نیا جوڑا چاہیئے کیونکہ وہاں بھی لوگ نیا جوڑا پہن کے آتے ہیں اور اگر وہ نئے کپڑے پہن کر نہیں جائے گی تو میری ہی بے عزتی ہوگی کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

اکثر عورتوں کی طرح یہ بھی ادب دشمن ہے۔ قیمتی کتابیں، رسالے، دستاویزات اس کی نظر میں ردی ہیں، اس کا بس چلے تو سب کچھ ردی میں دے کر چار پیسے کھرے کرلے۔ فرمائش پر لکھی اور پسند کی جانے والی میری تحریریں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لئے کم ہی پڑھتی ہے اگر پڑھ لے تو ناراض ہو جاتی ہے کہ میں عورتوں کے خلاف کیوں لکھتا ہوں حالانکہ اس کی وجہ وہ خود ہی ہے۔

اس کا مزاج حاکمانہ ہے، جس کی وجہ سے بچے تو کیا بڑے بھی سہمے رہتے ہیں کیونکہ گھر میں کچھ بھی ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو طوفان آجاتا ہے، اس لئے امن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں ان کی اجازت لی جائے خصوصاً جس کا تعلق گھر کے معاملات سے ہو۔

عام عورتوں کی طرح انہوں نے نہایت نقطہ چیں قسم کی طبیعت پائی ہے خصوصاً ان کو میری ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے۔ اگر فون کروں تو اعتراض کہ وقت ضائع کرتا ہوں اگر فون آجائے تو کہتی ہیں کہ میرے دوستوں کو اور کوئی کام ہی نہیں۔ اگر گھر کے تالے وغیرہ کا خیال نہ رکھوں تو لاپرواہ اور اگر چیک کروں تو وہمی۔ گرمیوں میں میرے بار بار نہانے پر بھی اعتراض ہے حالانکہ گرمی کا اور کیا علاج اگر پانی زیادہ ٹھنڈا ہو تو کیا ہی بات اور گرم بھی ہو تو پسینہ تو صاف ہو ہی جاتا ہے، جراثیم بھی مر جاتے ہیں اور مساج بھی مفت میں ہو جاتا ہے۔ پھر جب گرم پانی سے نہا کر نکلیں تو باہر ٹھنڈ محسوس ہوتی ہے مگر اسے تو اعتراض کرنے کی عادت ہے۔ اسے کیا پتہ کہ انگریز سٹیم باتھ کیوں لیتے ہیں؟؟؟

میں طبعاً تیز مزاج اور تبدیلی پسند ہوں اس لئے کئی ملازمتیں اور کاروبار بدلے مگر بیوی آج تک ایک ہی رکھی ہوئی ہے۔ وہ بھی میری اس قربانی کی قدر نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ یہ تو "ہاتھ نہ پہنچے تھو کڑوی" والی بات ہے، حالانکہ یہ کوئی مشکل کام تھوڑا ہی ہے، لیکن میں اس کو سبق سکھانے کے لئے خود عبرت کا نشان بننا نہیں چاہتا اس لئے وہ شیرنی بنی پھرتی ہے۔

زندگی کے اندرونی و بیرونی مسائل ٹینشن پیدا کرتے ہیں، جس سے یادداشت متاثر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں، اس لئے گھر کی کوئی چیز لانا بھول جاؤں تو طوفان مچا دیتی ہے کہ باقی تو سب یاد رہتا ہے جو میں کہوں وہی بھول جاتا ہے، حالانکہ وہ باقی سب بھی اس کا آرڈر ہوتا ہے اور ٹینشن دے کر یادداشت متاثر کرنے میں دیگر عوامل کے ساتھ اس کا اپنا رول بھی نہایت اہم ہے مگر وہ مانتی کب ہے۔

وہ اپنے سارے کام خود کرتی ہے اور مجھ سے بھی یہی توقع رکھتی ہے حالانکہ بہت سے ایسے کام ہوتے ہیں جو کہ اس کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتے مگر اس کی مدد حاصل کرنا بھی ایک سائنس ہے، اس کے لئے صرف خوشامد درآمد ہی نہیں بلکہ کچھ عملی مدد بھی کرنا پڑتا ہے اس کے کاموں میں پھر ہی تعاون ملتا ہے۔ کوئی بھی کام ہو ایک بار "نہ" ضرور کرتی ہے، پھر چاہے کام کر بھی دے یعنی دودھ تو دیتی ہے مگر مینگنیاں ڈال کے۔ شادی سے قبل میرے عورتوں کے بارے میں بڑے اچھے جذبات تھے، میں شاعری بھی کیا کرتا تھا مگر اب نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے یا مجھے کوئی متبادل عطا کرے آمین۔

حافظ مظفر محسن

شرارت ہی ہو سکتی ہے!

فیصل آباد سے ہمیشہ مزاحیہ خبریں نمودار ہوتی ہیں اور پڑھنے والے سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم ہنس دیں، قہقہہ لگائیں یا زیادہ چٹنی ڈال کر سموسہ کھائیں یعنی بات کو ہوا میں اڑائیں اور ''انجوائے'' کریں۔

اکثر لطیفے فیصل آباد سے ہی ایجاد ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ فیصل آباد میں ''تھڑے'' پر ہونے والی گفتگو۔۔۔ باقی حلقوں میں ''لطیفہ'' کہلاتی ہے۔ مستانہ (مرحوم اداکار) سے کسی نے محبت سے پوچھا ''حضور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ لوگ آپ کو دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیں گے؟

ایک تو میری اور رنگیلا مرحوم کی شکل اور بات کرنے کا اسٹائل ایسا تھا کہ دیکھنے والا ضبط نہ پاتا اور ہنسی کا فوارہ چھوٹ جاتا اور سونے پر سہاگہ جب ہم وہ زبان Language بولتے جو ہم عام طور پر اپنے گھروں میں بولتے تھے تو لوگوں کو اُس مختلف زبان سے بھی ''لذت'' محسوس ہوتی۔

بہر حال فیصل آباد اور گوجرانوالہ دو ایسے شہر ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان شہروں نے بہت بڑے بڑے فنکار پیدا کیے گوجرانوالہ سے ہی مرحوم دلدار پرویز بھٹی جو کہ بنیادی طور پر انگلش کے پروفیسر تھے تیس سال تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کمپیئرنگ اور اداکاری کرتے رہے اور لوگ دلدار پرویز بھٹی کے ہر فقرے کو مزہ لے کر ہنستے خوش ہوتے اور دلدار پرویز بھٹی کے پروگراموں کا عوام کو انتظار رہتا ہے۔ سہیل احمد طنز و مزاح / اداکاری میں بہت بڑا نام ہے۔ سہیل احمد بھی ایم۔اے پاس اور ایک پولیس آفیسر کے بیٹے ہیں اور اپنے فن میں اپنی مثال آپ ہیں جبکہ دوسرے فنکاروں کی کھیپ فیصل آباد سے ہے!

آجکل اخبارات میں یہ خبریں چھپ رہی ہیں کہ یہاں ایک ہی محلے میں جب لوگ صبح اٹھتے ہیں تو اُن کے دروازے باہر سے بند ہوتے ہیں اور وہ بیچارے ''شریف شہری'' اپنے ہی گھروں میں مقید ہو جاتے ہیں آج کے اخبارات نے تو اس پر تھوڑا غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ بیں گھروں کے ایک ساتھ تالے لگ جانا یا تالوں میں ایلفی ڈال کر گھر والوں کو مقید کر

دینا۔۔۔مذاق ہے یا دہشت گردی؟

بہت عرصہ پہلے ہمیں محلّہ میں پتہ چلا کہ ۲۱۶ میں جو صاحب رہتے ہیں اُن میں غصہ کرنے کی حس موجود ہے۔ہم نے اپنے ہم عمروں میں یہ بات پھیلا دی کہ جو کوئی ان صاحب کو ۲۱۶ کا پوچھے وہ خوش ہوتے ہیں۔صبح سے شام تک اسکول کا جو بچہ گزرتا وہ اُن صاحب کو ادب سے سلام کرتا اور پھر محبت سے پوچھتا ''انکل آپ ۲۱۶ میں رہتے ہیں''؟

شروع شروع میں تو اُنہوں نے بچوں کو سمجھایا کہ ''میں ۲۱۶ میں نہیں رہتا، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے'' لیکن جب ''مرض'' حد سے بڑھ گیا تو اُن صاحب نے اینٹ اپنے دائیں ہاتھ میں رکھنا شروع کردی اور پھر جو بیچارے ''بھولے بچوں'' کی شامت آئی، مت پوچھیے۔

بات یہیں رک جاتی تو خیر تھی، معاملہ تو بہت آگے تک چلا گیا اور بچوں کو پتہ چل گیا کہ ۲۱۶ والے کی ایک اور بات بھی اُن کے لیے دردِ سر بن سکتی ہے وہ ہے لفظ ''خربوزہ''۔۔۔اب جو وہ صاحب گھر سے باہر نکلے تو کسی نے مارکر کے ساتھ اُن کے ''بڑے دروازے'' پر ''خربوزہ'' بنا ڈالا۔ہمارا روٹین میں گزر ہوا تو ۲۱۶ نے ہمیں روک کر ہمارے حسبِ توفیق بے عزتی کی اور ہمیں وارننگ بھی جاری کردی۔ہم نے معافی مانگی ''ہمارا ایسی سرگرمیوں سے کوئی بلکہ دور کا بھی تعلق نہیں لہٰذا آپ ہم پر شک نہ کریں''

اُنہوں نے ہمیں بھگا دیا لیکن ہم نے جاتے جاتے محبت سے پوچھا ''انکل یہ آپ کے دروازے پر بڑا سا ''خربوزے'' کا نشان دکھائی دیتا ہے، آپ خربوزوں کے تاجر ہیں؟''

مت پوچھیے۔۔۔اِس سوال کا جواب کس قدر مشکل اور ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ پریشان کن تھا۔وہ جو ہم کئی سال سے محترم عمران خان صاحب سے گذارش بلکہ عرض کرتے چلے آ رہے ہیں ''حضور معاملات الجھ جائیں گے، کوئی حل نکالنا ہے تو پلیز مذاکرات کی میز پر بیٹھ جائیں کیونکہ ایسے کام بگڑے گا اور عوام پریشان ہوں گے اور جگ ہنسائی بھی ہوگی؟''

یہ بات اہلِ محلّہ نے ''۲۱۶'' والے انکل ''خربوزہ'' کو بھی سمجھائی اور سب ''پارٹیاں'' 'مذاکرات پر راضی ہوگئیں۔جیسے آجکل سردی آتے ہی میاں نواز شریف حسبِ عادت مری ''برف باری'' انجوائے کرنے جا پہنچے ہیں۔نتھیا گلی کے ''خان'' کو بھی چاہیے وہ کسی اور صحت افزاء مقام پر جا کر پارٹی کا اجلاس بلائیں اور سبز مرچوں والی ''کڑاہی'' سے پارٹی ممبران کی تواضع کریں اور نمک منڈی کے ''چپل کباب'' سے لطف اُٹھائیں۔

محلّہ میں طے پایا کہ آج کے بعد کوئی انکل ''خربوزہ'' سے یہ نہیں پوچھے گا کہ آپ ۲۱۶ میں رہتے ہیں؟ اور اگر کوئی ناہنجار پوچھے گا تو وہ غصہ نہیں کریں گے بلکہ مسکرادیں گے؟

معاملہ رفع دفع ہوگیا۔۔۔لیکن افسوس ''مذاکرات کامیاب'' ہونے کے باوجود نہ ''وہ'' باز آئے نہ ''ہم'' نے اپنا رویہ بدلا لیکن ۔۔۔یہ سب مذاق مذاق میں چلتا رہا۔۔۔اس میں وہ شدت نہ رہی۔

میری اہلِ فیصل آباد سے گذارش ہے کہ وہ ایک عدد خفیہ کیمرے کا انتظام کریں، ''معصوم دہشت گرد'' پکڑا جائے گا لیکن ہمارے تجربہ سے فائدہ اٹھائیں ۔۔۔معاملے کو مذاق نہ بنائیں ۔۔۔محبت سے ایسے کاموں کا حل نکالا جاتا ہے۔۔۔اسی میں پورے فیصل آباد کی بہتری ہے۔

امریکی اسکول کی بہترین استانی نے اپنی کلاس کو بتایا ''لڑکیو! میں جب نوعمر تھی تو سوچا کرتی تھی کہ بہترین گانے والی بنوں گی چنانچہ میں اپنا زیادہ وقت پیانو کے پاس گزارتی اور رات دن گانے گاتی رہتی لیکن ایک دن میرے ڈیڈی نے پیانو چھین کر چھپا دیا اور میرے ہاتھ میں کتابیں تھما دیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے گانے کا ریاض ختم کرنا پڑا اور اپنی ساری توجہ تعلیم پر صرف کرنا پڑی ۔۔۔تم دیکھ رہی ہو کہ آج میں کیا ہوں؟''

لڑکیوں نے ہم آواز ہوکر کہا ''ہمارے اسکول کی سب سے بہترین استانی؟''۔۔۔''نہیں''۔۔۔''نہیں''...... استانی نے جواب دیا ''شہر کی سب سے خراب گانے والی!''

ذہین احمق آبادی

آج میں آپ کو اپنے بچپن کے کچھ واقعات بتاتا ہوں۔۔۔عنوان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ کس "سنہری حرکت" کی بات ہے اور کی تو شاید آپ نے بھی ہو مگر کسرِ نفسی میں شاید نہ پھوٹ سکیں۔۔۔خیر۔۔۔نہیں، تو نہ سہی!

چوری کرنے کے ٹوٹکوں میں ایک مجرب حربہ یہ بھی ہے کہ چوری یا تو وہاں کرو جہاں بہت زیادہ رش ہے یا وہاں پر 'جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔۔۔!

قصہ یہ ہے کہ میں اور میرے دو عم زاد ایک دوکان پر جاتے تھے۔ اس دوکاندار کے پاس بہت سی اشیاء ہوتی تھیں جن کو دیکھ کر بچوں کے گال لال اور ٹھوڑی بہ رال ہو جاتی تھی۔ وہ بندہ بہت مہنگی چیزیں بیچتا تھا ہمیں۔۔۔تو خیر۔۔۔کرتے ہم یہ تھے کہ میں اُدھر دوکان دار کو باتوں میں لگا تا تھا اور اِدھر وہ دونوں کارروائی ڈالتے تھے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میرا چھوٹا عم زاد ذرا چوک گیا اور دوکان دار کی کائیاں نظروں نے اسے تاڑ لیا۔ اس نے لعن طعن شروع کر دی مگر مجال ہے جو میں اور میرا بڑا عم زاد ذرہ برابر بھی گھبرائے ہوں، بلکہ ہماری زبانوں سے تو یہ نکلا کہ "اوئے۔۔۔تو چوری کرتا ہے۔ اگر کچھ چاہیے تھا تو ہم سے بول دیتا (ہم نے کون سا الگ کچھ کرنا تھا) گھر چل تیری ماما کو بتاتے ہیں۔۔۔!"

اسے کھینچتے دھکیلتے، سعادتمندی اور معصومیت سے انکل کو یقین دہانی کروائی اور اسے فق چہرے سمیت باہر لا کر موج اڑائی۔۔۔ وہ دراصل ہم میں سب سے چھوٹا تھا اور ذرا کچا تھا۔ ہاتھ میں صفائی نہیں آئی تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ کبھی انھوں نے "کارگزاری" میرے سامنے بھی پوری نہیں رکھی، ہمیشہ ڈنڈی مارتے تھے۔ پھر ایک دفعہ میں نے ان کے ساتھ اس سے بڑا ہاتھ کیا۔ کیا غبن کیا تھا۔۔۔آہا۔۔۔الامان والحفیظ۔۔۔میں عاجزی کے باعث وہ بتانے دہرانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔۔۔انا اللہ!

میں، واللہ، گن کر بتا سکتا ہوں ان چیزوں کی تعداد جو میں نے چوری کی ہیں۔۔۔ ٹھہریں۔۔۔ گننے دیں۔۔۔ ایک، دو۔۔۔اور ہاں وہ ٹیپ، تین۔۔۔عاشی کی دکان، چار۔۔۔پانچ چھ سات۔۔۔پونے دو سو۔۔۔ایک ہزار۔۔۔لاحول ولا۔۔۔ اب اتنی بھی نہیں۔۔۔دھت تیری کی۔۔۔آج کل کے بچوں کے پاس بتانے کو کیا ہوگا۔۔۔؟ نئی پود ذہین تو ہے، پر ہے بیوقوف۔۔۔ ان کی زندگی نری بورنگ ہوگی۔۔۔ فلانی گیم کھیلی۔۔۔پلے سٹیشن پر یہ کیا۔۔۔فلانی میک بک خریدی۔۔۔ یہ وہ۔۔۔ویسے میں خود بھی ان چیزوں میں ملوث رہا مگر ذرا ہٹ کے۔ خود ہی دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتائیں کہ کبھی وہ چوری کرتے

ہوئے پکڑے گئے۔۔۔؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔سنسنی سے عاری زندگی کا کیا کرنا۔۔۔ پکڑا تو ویسے میں بھی نہیں گیا آج تک۔۔۔ ہمیشہ ساتھیوں کے باعث پھنسا۔ اِس لیے اب میرا کوئی ساتھی ہی نہیں۔۔۔ کہہ سکتے ہیں کہ میں کافی حد تک 'stealing stainless' کرتا تھا۔۔۔ ویسے سنسنی خیزیت سے میری مراد چوری جیسا کوئی قبیح عمل نہیں۔۔۔ بس کسی بھی طرح کی سنسنی۔۔۔ کیونکہ آج کل کی پود گھر کی ہو کر رہ گئی ہے!

پھنسنے سے یاد آیا۔۔۔ اسی طرح ایک دفعہ بعد از حفظ، اسکول میں میرے اسی بڑے عم زاد نے مجھے ایک چاکلیٹ کا بتایا جو ساتھ والی گلی سے ملتی تھی اور میں رغبت سے کھاتا تھا۔ اس نے کہا کہ چھٹی کے بعد گھر سے کپڑے بدلتے ہوئے وہاں کی راہ لیں گے۔ میں نے بھی رضامندی ظاہر کردی۔ اب ہم وہاں پہنچے۔۔۔ چاکلیٹ تو نہ ملی مگر دوکان والے نے انڈوں کی پیٹی اپنی دوکان میں رکھنے کے بجائے چار پانچ گز دور تھڑے کے آخری سرے پر رکھی ہوئی تھی جس میں بھوسہ بھی بھرا ہوا تھا۔ ہمارے ذہن میں ایسی کوئی ''مذموم حرکت'' کی پرچھائیں بھی نہیں تھی مگر شرارت کا کیا کیجیے۔۔۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اپنا سامان بچاؤ، دوسرے کا ایمان بچاؤ جبکہ صنفِ نازک کیلئے بھی یہی۔۔۔ مگر ساخت میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ کہ ''اپنا سامان' بچاؤ، دوسرے کا ایمان بچاؤ''۔۔۔ خیر۔۔۔ ہم نے وہاں سے انڈے اٹھائے اور سرپٹ دوڑتے یہ جا وہ جا۔۔۔ آگے جا کر کھوپڑی میں آئی کہ آخر انکا کیجیے کیا۔۔۔ پس ہم نے ہاتھ سر سے بلند کر، انڈے زمین پر دے مارے۔۔۔ اب تو ہمیں مزہ آنے لگا، دل، شیر ہو گیا۔۔۔ ہم واپس آئے مزید اغوا کی واردات کو۔۔۔ مگر قسمت کا کیا کیجیے کہ اس دفعہ جیسے ہی اٹھا کر بھاگے ہیں تو سامنے والی دوکان والا بھی ہمارے ساتھ ہی بھاگا ہے۔ اب ہم تو ٹھہرے بچے، کتنا بھاگتے؟ اس نے میرے عم زاد کو آ لیا۔ میں بھاگا بھاگا گھر کو آ گیا۔ وہ بیوقوف دوکاندار کو گھر لے آیا۔۔۔ بس پھر کیا تھا، جو سماں بندھا تو عقل ٹھکانے آ گئی۔ میرے بابا (نوراللہ مرقدہ) تو رات گئے گھر آتے تھے، میری 'چھینٹی' ملتوی ہو گئی۔۔۔ گویا سولی ہی چڑھا دیا مجھے۔۔۔ جبکہ گھر والوں نے اس دوکاندار کو پیسے دے دلا کر رخصت کر دیا اور اس نے بھی ایک انڈے کے چار لگائے اور ہم ہونقوں کی مانند دیکھتے رہ گئے کہ آخر اس کا جھوٹ سامنے لائیں بھی تو کس مُنہ سے!

خیر۔۔۔ رات ہوئی اور میں بابا کی آمد سے پہلے ہی سو گیا۔ میں سمجھا رات گئی بات گئی مگر صبح ناشتے کے وقت بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر اسی جلال میں مجھے سمجھایا جسے دیکھ کر چھوٹے تو چھوٹے، بڑے بھی کونے میں دبک جاتے ہیں کہ چوری کرنے والے کا ہاتھ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔۔۔ لاؤ میں ہاتھ علیحدہ کروں۔۔۔ اور یہ کہتے ہوئے چھری میری کلائی پر رکھ کر بالکل ہلکا، معمولی سا دباؤ ڈالا۔ میں نے بابا کے چہرے کی طرف دیکھا کہ شاید مذاق کر رہے ہوں مگر وہاں ایسے آثار مفقود تھے۔ میرا ننھا سا دل اس وقت اتنی زور سے دھڑکا اور میں ایسا رویا گویا اصل میں ہاتھ کاٹ رہے ہوں۔ اصل میں کانپ کانپ گیا۔ اس وقت میں نے بابا سے اقرار کیا تھا کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا (دل چرانا الگ قصہ ہے) اور بابا نے بھی تسلی کرائی تھی کہ وہ چھوڑ رہے ہیں۔۔۔ باہر والوں کو ابھی نہیں پتا۔۔۔ اگر انھیں پتا چل گیا نا تو وہ ہاتھ کاٹ دیتے ہیں چور کا! بس تب سے تائب ہوا اور اب لوٹا نے کا خیال آیا۔۔۔ جگہیں ہی کتنی تھیں۔۔۔ ایک آدھ۔۔۔ اللہ معاف کرے۔۔۔ خیر۔۔۔ مار نہیں پڑی یہی کافی۔۔۔!

اب دس پندرہ سال بعد جب یہ ''ذکرِ شر'' چھڑا تو گھر والوں نے اس انوکھی چوری پر استفسار کیا کہ آخر کھوپڑیا میں سمائی کیا تھی جو ایسی چیز پار کی۔۔۔ اب کیا کہتے۔۔۔ حماقت؟ جبکہ اس وقت تو علامہ اقبال کا حدودِ اربعہ بھی نہیں معلوم تھا، وگرنہ سارا قصور اُن کی گردن پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو رہتے۔ خود بتایئے کہ حرف بہ حرف اُنھی کی نصیحت پر عمل نہیں کیا تھا؟ آخر انھی کا تو ہے یہ قول زرّیں (حالانکہ بیچاری زرّیں جانتی بھی نہ ہوگی کہ اس کے نام سے کیا کیا اقوال مروجہ ہیں)۔۔۔ نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے... اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں... جی، جی۔۔۔ حد ہے، اور بیحد ہے۔۔۔!

احمد سعید

یورپئن

پوہ ایک انتہائی خطرناک کُتا تھا۔ میں جب کام سے گھر کو لوٹتا تو اکثر راستہ روک کے کھڑا ہوتا۔ شاید میرے استقبال کے لئے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی مالکن ''آنا بیلا'' نے مجھے ایک دو مرتبہ بتایا کہ یہ کچھ نہیں کہتا۔ میں نے کہا: ،جب یہ کہتا ہی کچھ نہیں تو اتنا بڑا کتا رکھنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کوئی چھوٹا موٹا کُتا رکھ لیتی، وہ کچھ نہ کچھ کہہ بھی لیتا تو خیر تھی۔ اِسے تو دیکھ کے ہی خوف آتا ہے۔

ایک دن میں دور کھڑا دیکھ رہا تھا کہ گلی (آگ کا دریا) پار کروں یا نہ۔ وہ (کتا) گلی میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں گھر سے اسکی خوبرو مالکن نمودار ہوئی ۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تو میری بھی باچھیں ''کھل ''گئیں۔

کہنے لگی: اِدھر آؤ اس کے پاس، کچھ نہیں کہے گا۔

میں نے کہا: ،اِسے لے آؤ میرے پاس سے، میں اس کے پاس آؤں اِس کا ملازم ہوں کیا؟ یہ الفاظ زباں تک تو آئے، بیاں تک نہیں،۔ اتنی جرأت کہاں تھی کہ اُن دونوں کے سامنے یہ کہتا۔ خیر چل دیا اُن کی طرف۔

کہنے لگی: ''پرتگال'' کا تو بچہ بچہ کتوں سے کھیلتا ہے، آپ اتنا کیوں ڈرتے ہیں؟

میں نے دل میں ہی کہا: ،انگلینڈ کا بچہ بچہ انگلش بولتا ہے، ہم سے نہیں بولی جاتی تو کیا نہر میں چھلانگ لگا دیں؟

آخر کار بات چیت کے آخر میں دل نے یہ فیصلہ کیا کہ کتے کے ساتھ اِس کی ''ماڈل ٹائپ'' مالکن ہوگی تو گلی پار کیا کروں گا، ورنہ دوسرا المبا راستہ تو ہے ہی۔ یورپ میں مَیں کتوں سے ہی نہیں بلکہ دوسرے جانوروں سے کتوں سے بھی زیادہ ڈرتا تھا۔

''پرتگال'' میں بڑے بھائی عبدالصمد کیساتھ ایک مرتبہ Pet shop میں ایک Pet پہ ہماری Bet لگ گئی کہ یہ چوہا ہے یا نہیں ہے۔ بھائی کا موقف تھا کہ یہ ایک بڑا ''یورپین'' چوہا ہے۔

میں کہنے لگا: ، یہ بلی ہے نہ چوہا، بس یہ کچھ اور ہی ہے۔

بھائی کہنے لگے، یہ بلی کہاں سے آ گئی بیچ میں۔

میں نے کہا، بھائی جی! بلی، چوہے کا چولی دامن کا ساتھ جو ہوا۔

بحث جب لمبی ہوتی گئی تو ہمیں احساس ہوا کہ یہاں دکان

والی بھی موجود ہے۔اُس سے یہ فیصلہ باآسانی کروا سکتے ہیں۔ویسے سچ تو یہ ہے کہ ہمیں خود احساس نہیں ہوا تھا، یہ احساس اُس دکان والی نے ہی ہمیں دلایا تھا، کیونکہ بحث کے دوران چار پانچ مرتبہ اُس نے ہم سے پوچھا کہ میں آپ کی کوئی مدد کرسکتی ہوں؟ بقول اُس کے اِس جانور کا نام chinchilla تھا۔پھر اُس نے اِسے ہاتھ میں پکڑ کے دکھایا۔کہنے لگی، میں آپ کو چوہے پکڑاتی ہوں۔میں نے کہا کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردیں، (کیونکہ اُس نے جانے کونسے چوہے پکڑا دیئے تھے، اصلی یا بہت ہی اصلی)۔

پھر اُسنے ایک سانپ نکال کر دکھایا۔کہنے لگی، پکڑو گے؟

میں نے کہا، میں تو آپ سے پہلے ہی معافی مانگ چکا ہوں، اب کیا کان پکڑوائیں گی؟

بھائی کہنے لگے، مجھے پکڑائیں جی۔

میں نے کہا، کیا کان؟

کہنے لگے، نہیں سانپ۔

میں نے کہا، بھائی جی! "یورپین کُڑی سامنے اپنے وی پاگل نہیں ہوجائی دا"۔

کہنے لگی، کچھ نہیں کہے گا۔

میں نے سوچا، یہ کہاں آگئے، جہاں کتے کاٹتے نہیں، سانپ "ڈاستے" نہیں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی تو میں نے پوچھ ہی لیا کہ یہاں بیویاں بھی اپنے شوہروں کو کچھ کہتی ہیں یا وہ بھی کچھ نہیں؟ اور یہ سوال کرتے ہوئے میرے چہرے پہ جو بیچارگی تھی، وہ اس دوکان کے تمام جانوروں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھی۔

محمد اشفاق ایاز

کھُسرے

دنیا کے سارے مذاہب ، دانشور، مفکریں، مذہبی اور دنیوی علوم کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کی ابتداء تخلیق آدم سے ہوئی۔لیکن دنیا کے یہ سارے مذاہب، مفکرین، مذہبی اور دنیوی ماہرین کے علاوہ خود کھسرے اس بارے میں مکمل خاموش ہیں کہ دنیا میں پہلا کھسرا کب، کہاں اور کیونکر وجود میں آیا۔اس کی آمد سے پہلے دنیا کے حالات کیسے تھے اور اس کی آمد کے بعد دنیا کی سماجی، ثقافتی، اور عمرانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ تاہم بعض مذہبی مفکرین کی رائے ہے کہ کھسرے حضرت لوط علیہ السلام کے دور سے پہلے اپنی سرگرمیاں شروع کر چکے تھے۔اور ان پیغمبر کے دور میں کھسروں کا کاروبار عروج پر تھا۔اور یہی عروج ان کھسروں کے ساتھ ساتھ اس پوری قوم کو لے ڈوبا۔گزشتہ چند دھائیوں سے یورپ میں انہیں پھر عروج حاصل ہو رہا ہے۔اور وہاں انہیں آپس میں شادی کا قانونی تحفظ بھی حاصل ہو رہا ہے۔اب آہستہ آہستہ یہ حقوق دنیا میں موجود تمام کھسروں کو حاصل ہوتے جا رہے ہیں۔تاہم اس عالمی نقشے پر ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں کھسروں کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ اس ملک میں مارچ ۲۰۱۷ء کی ابتدا میں ایک مقام پر بڑی تعداد میں اکھٹا ہونے والے کھسروں کو پکڑ لیا گیا۔ اور باقی کھسروں کو سبق سکھانے کے لئے دو کھسروں کو بوریوں میں بند کر کے ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔اس سے پوری دنیا کے کھسروں میں خوف اور تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔

برصغیر پر کئی صدیاں حکمرانی کرنے والے مغل بادشاہوں کے

دور میں کھسروں کو بڑا عروج حاصل رہا۔ ان کی رسائی براہ راست حرم خانوں کے اندر تک تھی۔ ملکاؤں اور شہزادیوں کا دل بہلانے کے ساتھ ساتھ وہ بادشاہوں اور شہزادوں کے لئے بھی بڑی مفید چیز تھے۔ اور ''مشکل وقت'' میں ان کے کام آتے تھے۔ ظلِ الٰہی اور ملکاؤں اور شہزادیوں کے درمیان رابطے کا بڑا ذریعہ یہی کھسرے تھے۔ کسی رنگین مزاج شہزادے کی منظور نظر تک پیغام رسانی کے لئے یہی کھسرے کام آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اندرون خانہ کی جتنی معلومات ان کھسروں کو حاصل تھیں۔ اتنی خود اہل خانہ کو بھی حاصل نہ ہوتی تھیں۔ پھر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حرم خانے کے کھسروں نے اپنے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کا بدلہ اکیلے بے چارے بہادر شاہ ظفر کی شہزادیوں سے لیا۔ جب غدر مچا۔ محل سے شہزادے اور ملکائیں فرار ہونے لگے تو کھسروں نے 'معصوم'' شہزادیوں کو محفوظ پناہ گاہوں تک لے جانے کے بہانے، کہیں اور ہی لے گئے۔ بعد میں انہیں کوڑیوں سے بھی کم دام میں فروخت کر دیا۔

بعض ماہرین تبدیلی جنس کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے دنیا پر ایک ایسا بھی دور آیا ہو جب عورتوں کے مردوں پر مظالم حد سے بڑھ گئے ہوں۔ عورتوں کی مردوں سے عدم تعاون کی تحریکیں زور پکڑنے لگی ہوں۔ مردوں کے جائز حقوق بھی سلب کئے جانے لگے ہوں۔ انہیں صرف کماؤ مشینیں اور آمدنی کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہو۔ تب مردوں نے گڑگڑا کر خدا سے عورتوں کے خلاف شکایات کے انبار لگا دیئے تو خدا نے ان کی سن لی ہو اور ان کی تسلی، تشفی اور دل جوئی کے لئے دنیا میں کھسرا بھیج دیا ہو۔ یوں پہلی اور دوسری جنس کے عین درمیان ایک ایسی مخلوق کی تخلیق کی گئی جسے بعد میں تیسری دنیا کے نام سے بھی موسوم کر دیا گیا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس سب سے آخر میں آنے والی بظاہر بے ضرر مخلوق نے اس قدر ترقی کی کہ افادیت کے لحاظ سے اپنے سے پہلے آنے والی دونوں مخلوقات سے کہیں آگے نکل گئی۔

آج اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیے۔ آپ کو ایوان اقتدار
سے لے کر غلام گردشوں تک، جزوی یا مکمل کھسرے اپنی تمام تر
صلاحیتوں کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں شامل نظر آئیں گے۔
حتیٰ کہ دنیا کے نقشے پر بھی تیسری دنیا وجود میں آگئی جس کا کام
پہلی اور دوسری دنیا کے ہر کام پر واہ واہ کرنے کا کام سونپ دیا
گیا۔ اس کا کام اپنی بھوک پیاس، دکھ، غم، محرومیاں بھلا کر بس
پہلی اور دوسرے دنیا کے لئے راحت و شادمانی کے وسائل پیدا
کرنا، اپنی روٹی کا آخری نوالہ تک ان کے سامنے رکھ دینا اور ان
کی ترقی و سلامتی کے گیت گانا رہ گیا ہے۔ اگر تیسری دنیا کی مخلوق،
ان ذی وقار قوموں کو اپنی محرومی کی طرف ذرا سا بھی احساس
دلانے کی کوشش کرتی ہے تو اسے دہشت گرد کا خطاب دے کر
دنیا کے نقشے سے ہی غائب کر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کھسری
دنیا (تیسری دنیا) کے مقدر میں ایسے حکمران لکھ دیئے گئے ہیں
جو سہرے گانے میں ماہر اور شکووں شکایتوں سے دور ہوتے ہیں۔

اردو ادب کی ترقی میں جہاں کلاسیک ادیبوں، شاعروں اور
افسانہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا وہیں کھسروں نے بھی اردو
زبان میں کئی اصناف متعارف کرائی ہیں۔ اس دور میں جب
لکھنو نوابوں اور رئیسوں کا گڑھ تھا وہاں کھسرے بھی انہی کے
سائے تلے ایک پھوڑے کی طرح پل رہے تھے۔ جب اول اول
ڈرامے کا آغاز ہوا تو زنانہ کرداروں کے لئے عورتیں میسر نہ ہوتی
تھیں حتیٰ کہ طوائفیں بھی سرعام ناٹک پر رضامند نہ ہوتی تھیں یا ان
کے دام زیادہ تھے۔ تو اس وقت زنانہ کرداروں کی کمی پوری کرنے
اور اردو ادب کے اس مشکل دور میں کھسرے ہی کام آئے۔ اردو
ڈرامہ کھسروں کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتا۔

اردو شاعری میں ''ریختی'' یعنی مردوں کی زبان سے عورتیں
کی باتیں، کی ایجاد بھی خالص کھسروانہ ہے۔ مثلاً

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیا کا پروتی ہار بیٹھوں گی

قائداعظم کے تین اصولوں اتحاد، ایمان اور تنظیم کو باقی قوم
نے یاد رکھا ہو یا نہیں لیکن کھسروں نے اسے نہ صرف یاد رکھا بلکہ
ان کو اپنی عملی زندگیوں پر لاگو بھی کیا۔ آج جو اتحاد کھسروں میں نظر
آتا ہے وہ کوؤں میں بھی نہیں جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ
ایک کوے کو تکلیف پہنچے تو چند لمحوں میں سینکڑوں کوے کائیں
کائیں کرتے اکٹھے ہو کر حال چال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ہمارے شہر میں ایک مشہور سرکس آیا جس کے ساتھ
موت کا کنواں اور دوسری تفریحات کے علاوہ کھسروں کی خاصی
بڑی تعداد بھی تھی۔ جو سرکس اور موت کے کنوئیں کے باہر اپنے
جوہر دکھانے میں مصروف تھی۔ کچھ منچلوں نے، جن کی پہنچ سے یہ
کھسرے بہت دور تھے، انہوں نے انتقام لینے کے لیے محلے کی
مسجد کے امام سے فتویٰ حاصل کیا اور پہنچے تھانے۔ ان ''عوامی
شکایات'' پر فوری نوٹس لیتے ہوئے مقامی پولیس نے بطور نمونہ
چند ایک کو پکڑ لیا اور تھانے لے جانے لگی۔ لیکن ہوا یہ کہ مبینہ کھسرا
ملزمان اور پولیس کے تھانے پہنچنے سے قبل ہی کافی تعداد میں
کھسرے تھانے کے باہر اکٹھا ہو گئے اور ڈھولکی کی تھاپ پر تھانیدار
اور پولیس کی ہجو گانے لگے۔ تھانے والوں نے انہیں بھگانے کی
کوشش کی تو انہوں نے بھی اپنی گرفتار ''منہ بولی بہنوں'' کی
حمایت میں جیل بھرو تحریک شروع کرنے کی دھمکی دے دی۔
طویل مذاکرات کے بعد طے پایا کہ گرفتار کھسروں کے خلاف
پرچہ دینے کی بجائے انہیں چھترول کر کے فارغ کر دیا جائے۔
جب چھترول کے لئے ایک کھسرے کو لٹایا گیا۔ تو تھانے کے اندر
اور باہر کھسروں نے ڈھولکیوں کی تھاپ پر احتجاجی گیت اور پولیس
والوں کو کوسنے دینا شروع کر دئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ سر پر
جوتے لگالیں لیکن ''روزی والے اڈے'' کو نقصان نہ
پہنچائیں۔ تھانیدار اور پولیس والے آخر بال بچوں والے تھے۔ وہ
بھلا کسی کی روزی کیسے چھین سکتے تھے۔ وہ ان کے ''روزی والے
اڈے'' کو نقصان پہنچا کر اپنے لئے وبال اکھٹا نہیں کرنا چاہتے
تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے پانچ دس والے نوٹ نکالے، اپنے
سروں پر چکر لگوایا اور کھسروں کے حضور پیش کرتے ہوئے انہیں
جانے کی اجازت دے دی۔

شاہ محی الحق فاروقی

غالبؔ داورِ محشر کے حضور

صور کی مہیب آواز سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مُردوں کی دنیا میں ایک ہنگامہ سا بپا تھا۔ سب کے سب ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قیامت آگئی، قیامت آگئی کا روح فرسا شور دلوں میں دہشت پیدا کر رہا تھا۔ صدیوں پرانی اور ٹوٹی پھوٹی قبروں سے مُردے ایسی عجلت اور افراتفری کے عالم میں نکل رہے تھے جیسے زلزلہ کی خبر سن کر گاؤں والے گاؤں چھوڑ رہے ہوں۔ اس عالمِ وحشت میں میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک قبر کے پاس سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اُس کا مُردہ سکون اور اطمینان کے ساتھ سو رہا ہے۔

میں وہیں کھڑا یہ سوچنے لگا کہ یا خدا۔۔۔ یہ بے فکرا انسان کون ہے جسے اس عالم میں بھی نیند آ رہی ہے؟ میرے قریب سے دو عجیب الخلقت ہستیوں کا گزر ہوا۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اسدِ خستہ جاں یعنی مرزا غالبؔ کا نام سُن کر میں وہیں کھڑا ہو گیا اور اُن کے قبر سے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری

رشتے

خونی رشتے وہ ہوتے ہیں جو ایک ہی خون سے ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب کے خون کا گروپ بھی ایک ہی ہو۔ البتہ اکثر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو باقاعدگی سے خون پیتے ہیں کبھی اپنا تو کبھی دوسروں کا۔ ایک رشتے اور بھی ہوتے ہیں جو شادی سے بنتے ہیں انہیں قانونی رشتے کہا جاتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ لاقانونیت پھیلانے میں اکثر انہی کا ہاتھ پایا جاتا ہے مثلاً سسٹر اِن لا، برادر اِن لا، مدر اِن لا اور فادر اِن لا۔ یہ رشتے کروانے میں ماسیاں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انسان کا شمار یہ رشتے قائم ہونے کے بعد زندوں میں تو ہوتا ہے لیکن ہوتے تو مردہ ہی ہیں۔ شاید اسی لیے موت کو عرف عام میں خالہ کہا جاتا ہے۔ ان رشتوں کے درمیان ایک اور قسم کے رشتے ہوتے ہیں جنہیں سٹیپ رشتے کہتے ہیں۔ خونی رشتے خدا اور سٹیپ رشتے ماں باپ بناتے ہیں۔ صرف قانونی رشتے انسان اپنی مرضی سے بنا سکتا ہے۔

سید ممتاز علی بخاری

تھی کہ اُس لاش میں حرکت ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ہو بہو غالب شکل اختیار کر لی۔ غالب جھنجھلائے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی چتون سے سخت غصہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جلے بھنے انداز میں انہوں نے کہا۔

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

تھوڑی دیر بعد انہوں نے نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو نہ صرف مجھے بلکہ مجھ جیسے اور کئی بے فکروں کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور پھر اوپر نظر اٹھا کر ایک اپنائیت بھرے لہجے میں کہنے لگے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ابھی ہم لوگ اس نظارے میں مشغول تھے کہ یک بیک کہیں سے آواز آئی ”میدانِ حشر میں چلو اور بارگاہِ ایزدی سے اپنے فیصلے حاصل کرو۔“ میں بھی لپک کر پہنچا۔ وہاں طرح طرح کے انسانوں کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ تمام لوگ اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے مختلف قطاروں میں کھڑے تھے اور اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی میں مشغول تھے۔

چند ناموں کے بعد آواز آئی، اسداللہ خان غالب ولد مرزا عبداللہ بیگ خان، حاضر؟

غالب آگے بڑھے اور سجدہ کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

آواز آئی، اس شخص کا نامہ اعمال سناؤ۔

ایک فرشتے نے آگے بڑھ کر سجدہ کیا اور کہنا شروع کیا ”اے ہمارے رب! اس شخص پر الزامات تو بے شمار ہیں اگر ہم ان کی تفصیل میں جائیں تو وقت ختم ہو جائے مگر بیان ختم نہ ہو۔ اے معبودِ حقیقی اس شخص نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو راہِ مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس وقت تیری اجازت سے میں اس شخص کے صرف اُن اشعار کو پیش کرتا ہوں جن میں اس نے طرح طرح سے جنت کا مذاق اڑایا اور اپنی ان حرکتوں سے لطف اندوز بھی ہوتا رہا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اے معبودِ حقیقی! اُسی زمانے میں اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ اول تو اسے جنت کی کوئی پرواہ نہیں ہے اور اگر کبھی وہاں جانے کی خواہش ہوتی بھی ہے تو صرف شراب کے لیے۔ اس نے کہا۔

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے؟

ابھی فرشتہ کچھ کہنے والا تھا کہ ندا آئی۔

ندا: غالب

غالب: پروردگار غالب

ندا: غالب کیا تمہیں اس بیان کی صداقت پر کوئی اعتراض ہے؟

عربی بولنا کیا مشکل ہے

جن لوگوں کو عربی نہ آتی ہو اُن پر اپنی عربی دانی کا رعب بٹھانا کیا مشکل ہے۔ پنجاب کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بنگالی ہندو تھے۔ اُنہوں نے ایک دن دو مسلمان طالبِ علموں سے پوچھا ''کیا تم لوگوں کو عربی بچپن میں ہی سکھا دی جاتی ہے؟''

لڑکوں نے جواب دیا ''جی ہاں!''

ہیڈ ماسٹر صاحب کہنے لگے ''اچھا! ذرا عربی میں باتیں کر کے دکھاؤ!''

ایک لڑکا بولا ''الحمد للہ رب العالمین۔''

دوسرے نے کہا ''الرحمن الرحیم۔''

اور اس طرح دونوں نے سورۂ فاتحہ ختم کر دی۔

حرف و حکایت از چراغ حسن حسرت

غالب: معبودِ حقیقی ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ندا: غالب! یہ نہ بھولو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔ یہ ہمارا انتظام تھا۔ اس انتظام میں دخل دے کر یا اس پر اعتراض کر کے سرکش اور باغیوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرو۔

غالب: اے رحیم و کریم! میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

ندا: ہاں اُس میں بھی ہماری مصلحت تھی اور اِس میں بھی ہماری مصلحت ہے۔ تمہیں ایک بار پھر حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے دائرے میں رہو اور ہمارے انتظامات پر اعتراض نہ کرو۔ فی الحال تم ہمارے چند سوالات کا جواب دو۔

غالب: ارشاد یا رب العزت!

ندا: قسم کھاؤ کہ تم جو کچھ کہو گے سچ کہو گے

غالب: ۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ندا: کیا تمہیں ہماری وحدانیت پر ایمان تھا؟

غالب: بے شک اے ذاتِ واحد، میرا یہ ایمان تھا کہ ۔

ہم مؤحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
مِلتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ندا: کیا دنیا میں تم ہمارے پیارے نبی ﷺ کی رسالت کے قائل تھے؟

غالب: ہاں اے معبودِ برحق! میں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ۔

اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

ندا: اچھا پھر یہ بتاؤ کہ ایسے قابلِ اعتراض اشعار تم نے کیوں لکھے؟

غالب: اے رحیم و کریم! ۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

ندا: کیا تمہیں کچھ یاد ہے کہ دنیا میں تم نے کتنے گناہ کیے؟

غالب: ۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ندا: کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟

غالب: پروردگار میرا حال تو دنیا میں یہ تھا کہ ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن اے امیدوں کے برلانے والے! اگر میں بیان کروں تو کیا میری خواہش پوری ہو جائے گی؟

ندا: بیان کرو!

غالب: ۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

فہد خان

چشمہ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

آج تذکرہ ہے اس شے کا کہ جب آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے تو ہر شے نکھری نکھری، پاکیزہ پاکیزہ سی نظر آنے لگتی ہے۔ عرصے سے جن چیزوں میں کوئی چاشنی نہ چھکتی تھی، یک سر رس بھری ہو جاتی ہیں۔ جیسے کسی بلیک اینڈ وائٹ فلم کو رنگین کر دیا گیا ہو۔ جیسے صحرا میں ہولے سے بادِ نسیم چلنے لگی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے رنگ واپس لوٹ آئے ہوں۔ جیسے کوئی مان گیا ہو! جیسے کوئی مان سلامت رہ گیا ہو۔ جیسے کوئی ہمیں دیکھ کر ہولے سے مسکرایا ہو۔ یا کسی نے نگاہیں ملا کر جھکا لی ہوں۔ ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے جب آپ چشمہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں۔

یہ غالباً آٹھویں جماعت کی بات ہے، جب ہماری نگاہوں اور دنیا کے درمیان ایک شیشے کی دیوار حائل ہوئی۔ مگر اس سے ہمیں کوئی غم نہ ہوا تھا۔ وفورِ خوشی اور بس۔ مگر جانتے نہ تھے کہ چشمہ لگ جانے کے بعد نئی آزمائشیں شروع ہو جائیں گی۔ چشمہ لگنے سے قبل کسی قسم کی روک ٹوک ہمیں روکنے نہ پاتی تھی۔ راہ میں سمندر حائل ہوتا، یا فلک بوس پہاڑ یا پھر کوئی آوارہ کتا، ہم سینہ تانے چلتے بنتے تھے، کیوں کہ یہ نظر ہی نہ آتے تھے۔ اب معاملہ دوجا تھا۔ ساتھ والوں کے گھر کا کتا بھی سدِ سکندری لگتا تھا۔ ہم یہ سب برداشت کر رہے تھے، کیوں کہ جانتے تھے کہ اگر دنیا دیکھنی ہے، تو مشکلات تو آئیں گی ہی۔ ا شرع شرع میں تو لوگوں نے بہت تنگ کیا۔ اتنا تنگ تو پڑوس والی چھیماں کو بھی نہیں کیا جاتا۔ ایک دن وہ ناس ماری چھیماں بھی مجھے رشک سے دیکھ رہی تھی کہ اب سارے محلے والے اس کی بجائے میرے در پے تھے۔ محلے میں نکلتے ہی ایک طوفان سا مچ جاتا۔ چشمش۔۔ چشمش کے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر میں کونسلر کے انتخاب میں کھڑا ہو جاؤں اور عینک اپنا انتخابی نشان بنالوں تو میں جیت بھی سکتا ہوں۔ محلے میں بے تکلف لڑکے چشمے کی ''ونڈ سکرین'' کے سامنے انگلیاں لہرا کر دریافت کرتے کہ انہوں نے کتنی انگلیاں کھول اور کتنی داب رکھی ہیں۔ کوئی مجھے ڈم لائٹ بھی کہ دیتا تھا اور کوئی کوئی چار آنکھوں والا بھی کہتا تھا۔

علامہ تاجور نجیب آبادی بڑے تن و توش کے بزرگ تھے۔ ایک دن اُنہوں نے دیال سنگھ کالج سے نکلتے ہوئے خالی تانگہ والے کو آواز دی اور کوچوان سے پوچھا ''انار کلی تک جانے کے کتنے پیسے لو گے؟''

''سالم تانگا ہوگا جناب؟'' اُس نے جواباً پوچھا۔

''ہاں ہاں، میں کرایہ پوچھ رہا ہوں۔''

''ایک روپیہ حضور!''

تاجور صاحب نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''نہیں، بارہ آنے، یہی ہم روزانہ دیتے ہیں!''

کوچوان نے سواری کے موٹے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''چلئے یہی سہی مہربان! لیکن ذرا گھوڑے کی نظر بچا کر پچھلی طرف سے اگلی سیٹ پر آ جایئے، اس بے زبان کو کہیں اعتراض نہ ہو۔''

چشمہ پہننے کے لیے ایک باقاعدہ تربیت درکار ہوتی ہے، جس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ ہم سمجھے کہ چشمہ کیا بنوایا، بینائی کا سر چشمہ اونے پونے داموں خرید کر گھر کو آئے، مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ پہلا پورا ہفتہ تو ہم نے یہ جاننے میں لگایا کہ چشمے کے ساتھ اور چشمے کے بغیر دنیا میں کیا فرق ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہوا تھا۔ ہم اپنا چشمہ ''زیب تن'' کرتے، اور پھر آنکھیں ٹیڑھی کر کے کونے کھدروں سے چشمے سے باہر کی دنیا دیکھتے اور پھر نگاہیں سیدھی کر کے چشمے کے ساتھ مشاہدہ فرماتے۔ ایک دن یہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی بلا نے آلیا۔ کسی نے زور سے پکڑ کر ہمیں زمین کے ساتھ لگا دیا۔ ہم نے چھڑوانے کی کوشش کی تو دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے گئے، اور ہماری کمر کی سواری ہوگئی شروع۔ ہم نے بمشکل گردن موڑ کر پیچھے دیکھنا چاہا ہی تھا کہ ایک عدد جوتی ہماری ناک کے سامنے لہرائی گئی۔۔۔ اُفف! یہ جوتی تو بڑے بھیا کی ہے۔ موصوف بے روزگار ہیں اور آج کل کنز الجربات کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ انہوں نے ہمیں تب تک نہ چھوڑا جب تک ہماری چیخیں سن کر امی جان نہ آ گئیں۔ بھائی جان نے ہمیں چھوڑ تو دیا مگر جاتے جاتے کہہ گئے کہ دوبارہ مرگی کا دورہ پڑا تو وہ یہی علاج کریں گے۔

اس دن کے بعد تجربہ کرنا تو نہیں چھوڑا احتیاطاً کمرے کی کنڈی لگا لیتے ہیں۔

اِن ہی دنوں کی بات ہے، ہمارے دوست خان صاحب تشریف لائے۔ ملتے ہی کمر کو اس مضبوطی سے تھاما کہ پھر اس کے درد نے تھمنے کا نام نہیں لیا۔ خود سے علیحدہ کرتے ہوئے انہوں نے چہرے پر دو نئی آنکھیں اگنے کی مبارک باد دی۔ ان کے استفسار پر چشمے کی قیمت بتائی۔

۱۲۰۰ روپے؟؟؟ غضب خدا کا! وہ بولے۔۔ میں تمہیں یہ چشمہ ۳۵۹ روپے میں دلوا سکتا ہوں۔''

ان کی اس بات سے میں نے اتفاق کیا۔ پچھلی عید پر ایک عدد لوفر انہوں نے مجھے ۵۰۰ میں لا دیے تھے، اور عید نماز کے بعد ایک شخص اپنے بھائی سے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کوئی سوال بھی کر رہا تھا! ہم نے چشمہ اتارا، تہہ کیا اور سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ارے! کیا غضب کرتے ہو؟'' وہ بولے۔ چشمہ بھی بھلا کوئی یوں رکھتا ہے؟''

''ارے بھائی اور کیسے رکھتے ہیں۔''

''ایسے۔۔'' انہوں نے شیشے اوپر کیا اور کمانیاں نیچے۔'' پتا نہیں کہاں سے پینڈو آ جاتے ہیں۔۔۔ آئندہ شیشے اوپر رکھنا۔''

''مگر کیوں؟'' سوال بنتا تھا۔

''وہ اس لیے، تاکہ تمہارے شیشے سلامت رہیں۔''

''لیکن شیشے سلامت رہیں اور کمانیاں ٹوٹ جائیں تو میں عینک کو کیا کروں گا۔''

''ارے پگلے! پھر عینک کے کونوں پر شلوار والا لاسٹک لگا کے عینک سر پر چڑھا لینا۔۔۔ تمہارے بھائی کے پاس ہر چیز کا علاج ہے۔'' اگلا مالٹا چھیلتے ہوئے انہوں نے کہا۔

تربیت کا اگلا مرحلہ مسجد میں طے ہوا۔ وضو کرنے کے دوران ہم نے عینک سامنے جیب میں رکھ لی۔ ساتھ بیٹھے احمد علی صاحب بولے ''یوں کریں اسے گریبان میں لٹکا لیں، ورنہ جب آپ منہ دھوئیں گے تو پانی چشمے کو داغ دار کر دے گا۔'' ان کی بات بجا تھی،

سوعینک گریبان میں ڈال لی۔ ایک دن بعد حاجی اکرم صاحب نے بتایا کہ کس طرح ان کی عینک وضو کے دوران پاؤں دھوتے ہوئے سامنے گر گئی تھی اور پھر اس کا مزاج بلغمی ہوگیا تھا۔ اب کے میں نے عینک پیچھے کالر میں لٹکانی شروع کردی۔ اب اعتراض کی باری مولانا ٹنگ ٹاٹلکی تھی۔ مولانا کا نامنگ ٹانگ کیوں تھا، پتا نہیں۔ انہوں نے آتے ہی فرمایا: "اویدے تسی دبنگ! یہ مسجد ہے۔ سلمان خان بننا ہے تو باہر تھڑے پر بیٹھو۔" اب یوں ہے کہ مسجد جانے سے قبل ہی میں موبائل فون اور عینک گھر رکھ کر ٹامک ٹوئیاں مارتا مسجد جاتا ہوں۔ ایک دو بدتمیز بچے مجھے اندھا بھینسا بھی پکارنے لگے ہیں۔

اس طرح ہماری تربیت کا مرحلہ طے ہوا ہے۔

ہم تو چشمہ بس دیکھنے کے لئے پہنتے ہیں، پچھلے دنوں ایک چائنیز فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں ہیروئن اپنے محبوب کو بچانے کے لئے اپنی عینک کے چشمے سے ولن کا نرخرہ کاٹتی ہے۔ یہ فلم دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ یہ عینک کتنی کارآمد شے ہے۔ اباجان کو بھی ہم نے مشورہ دیا کہ اب یہ پستول ساتھ رکھنا چھوڑیں اور ایک عینک لگوالیں۔ اس پر انہوں نے ہمیں ایک گھوری سے نوازا۔

صبح کاذب کے وقت نماز کے لیے جارہا تھا کہ گلی میں دو نوجوان لڑکوں نے ٹیٹی دکھا کر روکا اور پیسے طلب کیے۔ ہم نے ایک دم عینک اتاری، اس کا شیشہ نکالا اور اس سے ان پر وار کیا۔ دونوں نے گھبرا کر بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ ہم بھی خوش خوش واپس آئے کہ اماں کو روداد سنائیں کہ ان کا بیٹا شادی کے قابل ہوگیا ہے۔ لیکن اباجی کاری ایکشن شاک میں ڈالنے والا تھا۔ انہوں نے نہ صرف ایک فصیح و بلیغ خطبے میں ہمیں ہماری کوتاہیوں سے آشنا کیا، بلکہ چشمہ توڑنے اور اس کے بعد اس کے نقصان کو انجان ڈاکوؤں پر ڈالنے کی منصوبہ بندی کا مجرم بھی ٹھہرا ڈالا۔ اور سزا یہ تجویز کی گئی کہ یہ چند دن موبائل سے دور رہیں گے۔

دنیا ہے تیری منتظر اے روزِ مکافات!

خیر اس واقعے کے بعد نیا چشمہ مل گیا، لیکن پھر ایک دن ہمیں معلوم ہوا کہ چشمہ کے بنیادی ماڈل میں ہی ایک ڈیفیکٹ ہے۔ اس کا انکشاف یوں ہوا جب ہم موٹر سائیکل ڈرائیو کرتے ہوئے کھیل کے میدان سے آرہے تھے اور راستے میں بارش شروع ہوگئی۔

چچ ۔۔۔ چچ ۔۔۔ چوہا!

''اے بارِ خدا! یہ کیا؟'' ہمیں لگنے لگا جیسے ہماری بینائی ہی چلی گئی ہو۔ چیزیں ایک ایک کرکے ہمارے سامنے دھندلاتی جارہی تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے ہماری نگاہوں کا نور چھن رہا ہو۔ وہیں سڑک کنارے ہم نے موٹر سائیکل روکی اور بھرے بازار بیچ سڑک خدا کے حضور سجدہ کرکے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے۔ چند منٹ بعد کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھا، ہم نے سجدے سے سر اٹھایا، اور چشمہ پھسل کر زمین پر آرہا۔ اب سب کچھ صاف دکھ رہا تھا۔ لوگ حیرانی سے ہمارے اردگرد جمع تھے، ہمارا کاندھا تھپتھپانے والا ریسکیو ۱۱۲۲ کا جوان تھا۔ ہماری ایک نہ سنی گئی۔ موٹر سائیکل ساتھ والے بندے کو دے کر ہمارے گھر روانہ کردیا گیا اور ہمیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ۳ عدد انجیکشن لگائے گئے، اور روزانہ کھانے کو گولیاں دی گئیں۔ ادھر اہلِ خاندان پہنچ گئے تھے۔ کچھ نہ پوچھئے کیا عالم ہوا تھا۔ اماں دھاڑیں مار رہی تھیں کہ اے مردود تو کیوں سیب کا مربہ نہیں کھاتا، آخر کمزوری کی بنا پر گر گیا ناں۔ ابا اس کی وجہ گاجر نہ کھانا بتا رہے تھے۔ اور جوان کزن دھیرے دھیرے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ اب میں انہیں کیا بتا سکتا تھا؟؟؟

اس سب معاملے میں یہ ہوا کہ ہمیں چشمے کے ماڈل میں خرابی کا پتا چلا۔ اور اب آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ میں نے ایک نیا چشمہ بنالیا ہے۔ اس چشمے میں ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بچنے کے لیے شیشوں پر دو ننھے منے وائپرز لگائے گئے ہیں جو ایک بیٹری سے چلتے ہیں۔ بیٹری کمانی کے اندر فکس ہوگی۔ میں آج ہی یہ منصوبہ ابا کے سامنے رکھنے والا ہوں۔ مجھے امید ہے ابا اس پر مجھے داد ضرور دیں گے۔ آپ دعا کریں کہ اس مرتبہ کا نوبیل پرائز ہمارا ہی ہو!

آپ نے رنجیت سنگھ کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا تھا، دوسری تھی ہی نہیں۔ اس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے جتنی دنیا نظر آتی تھی، اس پر ظلم کا بازار گرم کیے رکھا۔ واقعی اللہ کے کاموں میں مصلحت ہوتی ہے۔ اکثر کھانا کھاتے ہوئے وہ دائیں طرف کی ساری ڈشیں کھاتے اور بائیں طرف کی چیزیں ویسے پڑی رہتیں۔ اس لئے ان کا باورچی بھی جس چیز میں کسر رہ جاتی ان کی بائیں طرف رکھ دیتا تھا۔ کاش کہ اس وقت چشمے ایجاد ہوگئے ہوتے تو رنجیت سنگھ بھی رے بین کا کالا چشمہ اوڑھے آرام سے سلطنت چلاتا اور کسی کو پتا نہ چلتا۔

یاد رہے، چشمہ زمین سے ابلنے والے پانی کو بھی کہتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ایبٹ آباد جارہے تھے۔ راستے میں ایک دادا ابو نما شخص بیٹھے تھے اور اپنے پرانے چشمے کو آنکھوں سے لگائے گاڑی کے باہر کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ رنگین مزاج تھے۔ گاہے بگاہے رنگین آنچلوں کی طرف بھی توجہ فرما لیتے تھے۔ ہمیں ایک شرارت سوجھی۔ باآوازِ بلند اپنے کزن کو کہا ''آج چل کر دیکھتے ہیں، سنا ہے ایبٹ آباد میں چشمے پھوٹتے ہیں۔''

وہ حضرت زوجہ کی طرف دیکھ رہے تھے (کسی اور کی) ہم نے چشمے کے پیچھے انہیں بدکتے دیکھا۔ ہم نے انہیں ہی مخاطب کرکے پوچھا ''کیوں حضرت، ایبٹ آباد میں چشمے پھوڑے جاتے ہیں۔''

اُنہوں نے برا سا منہ بنایا اور باہر دیکھنے لگے۔ اس کے بعد جب بھی وہ کوئی نظارہ دیکھنے کے بعد ''منظر'' دیکھنے لگتے ہم دوست کے کان میں کچھ بھی کہتے، وہ مسکراتا اور حضرت تلملاتے رہتے۔ بس سے اتر کر انہوں نے اتنا کہا ''سخت نامعقول ہیں آپ۔''

ہم نے ہنس کر پوچھا۔ ''جناب معذرت۔ مگر یہ تو بتاتے جائیں کیا وہاں چشمے پھوٹتے ہیں؟''

اور وہ بکتے جھکتے وہاں سے چل دیے۔

چشمے کے نظر بہتر کرنے کے علاوہ بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ہم چشمے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے کانوں کا میل بھی صاف کرسکتے ہیں۔ گھبرایئے نہیں۔ حالتِ اضطرار میں سب جائز ہے۔ کچھ لوگ تو ناک کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ آندھی کے وقت اگر آپ اہلِ چشمہ ہیں تو بائیک دوڑاتے ہوئے آپ آندھی سے اور دوسرے ٹکر سے محفوظ رہیں گے۔

چشمے کا لائسنس ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر عابد علی

چمچہ گیری

خوشامد خوشامد ایک مہلک بیماری اور ایسا ناسور ہے جو باقی تمام صفات کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ نالائق اور نااہل افراد کے دلوں میں فضول شوق پیدا کرتی ہے۔ خوشامد کرتے وقت تیسرے درجے کے کنجوس، مکھی چوس کو بھی آپ حاتم طائی کہہ کر پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

جلسے جلوسوں میں نعرے لگانا بھی خوشامد کے زمرے میں آتا ہے۔ موقع کی سیاست سے فی البدیہہ نعرے گھڑنے کے فن کے ماہر کالاؤ؟ ڈ اسپیکر پر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا، مصروف چوراہوں پر، نمایاں عمارتوں پر، دیواروں پر چاکنگ اور بینرلگانا، افواہ سازی، بے پر کی اڑانا، رائی کا پہاڑ بنانا، کرپٹ سیاستدانوں کو پارسا ثابت کرنا، حادثات، گرفتاریاں، بدکاریاں اور اموات کی افواہیں پھیلانا بھی اسی کی کڑی ہے۔ بعض اوقات خوشامد بنا بنایا کام بھی بگاڑ دیتی ہے اس لئے سوچ سمجھ کر خوشامد کرنی چاہئے۔ ایک خوشامدی لکھتا ہے کہ یہ ایک ایسا تیر ہے جو سیدھا کبھی نہیں جاتا، ہمیشہ گھوم پھر کر اپنے ہدف پر پہنچتا ہے۔ خوشامد ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بقول شاعر مشکور حسین یاد ؎

جیسے ہی بندھی سونے کی زنجیر گدھوں سے
ہونے لگا ہر شخص بغلگیر گدھوں سے
مت پوچھئے کیا کیف کا عالم ہوا طاری
وابستہ ہوئی اپنی جو توقیر گدھوں سے

چاپلوس انسان اپنی زبان سے ایک وقت میں 2 کام لیتا ہے یعنی تلوار کا بھی اور ڈھال کا بھی۔ جو معرکے بندوق سے نہیں ہو پاتے وہ چاپلوسی سے انجام دے لیتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں قصیدہ گو اپنے ممدوح کی شاعری کو شجاعت اور بہادری ظاہر کرنے پر بہادر الملک کا خطاب اور نشاط پور کی سپہ سالاری حاصل کرتے تھے۔ خوشامد ایک مہلک میٹھا زہر ہے جس کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ چپکے چپکے اپنا اثر دکھاتی ہے۔ بقول شاعر ؎

خوشامد بڑے کام کی چیز ہے
زمانے میں آرام کی چیز ہے
خوشامد پہ کچھ خرچ آتا نہیں
"خوشامد کے سودے میں گھاٹا نہیں"

اب آیئے چمچہ گیری پر، ویسے تو چمچے کا لفظی معانی ڈوئی، کفچہ یا کفگیر کے ہیں اگر یہ چھوٹی جسامت کا ہو تو چمچی کہلاتا ہے۔ چمچہ گیری کسی آرٹ سے کم ہرگز نہیں، بقول شاعر ؎

زندگی میں اس قدر بے چارگی اچھی نہیں
ہر قدم پر چارۂ تدبیر ہونا چاہئے
صاحبِ توقیر ہونے سے تو کچھ ملتا نہیں
آدمی کو صرف چمچہ گیر ہونا چاہئے

چمچے کے بارے میں شاعر کے خیالات پیش ہیں ؎

بہت مجھ کو لگتا ہے پیارا کہ جب جب
مرے سامنے دم ہلاتا ہے چمچہ
اسی کے سبب سے ہے نفرت دلوں میں
کہ آپس میں ہر دم لڑاتا ہے چمچہ
زمانے کی پھٹکار اس میں ہو پھر بھی
سرِ انجمن دندناتا ہے چمچہ

گوہر رحمان گہر مردانوی

پاپی پیٹ کے کرتب

بھئی واہ! سبزی منڈی کی بھی کیا دنیا ہے۔ بھانت بھانت کے کمیشن ایجنٹس نہار منہ بغیر منہ دھوئے اُٹھ کر نہ جانے کہاں کہاں سے آئی ہوئی مختلف النوع سبزیوں اور پھلوں کے بھاؤ تاؤ میں لگ جاتے ہیں اور اذان سے پہلے یہ مرغے بانگیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مستزاد اس پر یہ کہ ان کی نعرہ مارکہ بولیاں بھی عجیب سا ماحول بنا دیتی ہیں۔ ایک جگہ سے آواز آتی ہے "آم کے سو فی پیٹی" اور بولی لگانے والا خراب ٹیپ ریکارڈر کی طرح "آم کے سو، آم کے دو سو، آم تین سو" رٹنا شروع کر دیتا ہے۔ مشرق سے آواز ابھرتی ہے "سیب کے تین سو، فی پیٹی" مغرب سے سرسراتی آواز آتی ہے "تین سو پچاس" پچھواڑے سے کوئی اور صاحب ہاتھ بلند ہو کر صدا لگاتے ہیں "چار سو" دوسرا ساتھ میں کھڑا اسے گھور کر غراتا ہے "پانچ سو" اور آڑھتی حضرات پھر نعرۂ روزگار بلند کرتے ہیں "پانچ سو، پانچ سو پانچ" اس طرح آخری بولی پر سودا طے کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرچون والے، اف توبہ! ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہزاروں کوّے ایک ساتھ کائیں کائیں کر رہے ہوں۔ سو اس طرح سویرے سویرے سخت سردی میں سبزی منڈی کا ماحول گرم رہتا ہے۔ کچھ تو اتنے گرم مزاج ہوتے ہیں کہ کوڑیوں کے مول بکنے والے شلجم کی بوری بھی "سات آٹھ سو" میں خرید لیتے ہیں اس دوران ان لوگوں سے نماز فجر تک قضا ہو جاتی ہے مگر پاپی پیٹ کے ہزار نخرے، کیا کیا جائے۔

اب آپ قارئین حضرات سوچ رہے ہوں گے کہ بھئی اس

میں مزاح کا کونسا پہلو نکلتا ہے تو سنیے حضرات ابھی آتے ہیں آپ کے پھیپھڑوں کے آپریشن کی طرف۔

ہوا یوں کہ صبح ڈیوٹی پر جاتے وقت ہمارا گزر سبزی منڈی سے ہوا کرتا تھا تو ریڑیوں، کیبنوں، ہتھ گاڑیوں اور ڈھابوں کے جھنڈ دیکھ کر ہمیں ہول اٹھتے تھے کہ مبادا گاڑی سے کسی کو ٹکر نہ ماردیں، نہیں تو استقبال ٹماٹروں، ٹینڈوں، آلوؤں بلکہ جہازی ساز کے کدوؤں سے ہوتا تھا، اس لئے مجال ہے کہ سرکنے کے علاوہ رفتار میں موہوم سا بھی اضافہ کر سکے۔ اور تو اور، کشادہ سڑک اتنی تنگ نظر آتی تھی کہ گاڑی تو کیا، انسان بھی ترچھا چلے اور چھکڑے بان تو کبھی گدھا گاڑی سے بال بال بچے۔ اگر ناجائز تجاوزات کا ریکارڈ یافتہ نمونہ دیکھنا ہو تو مردان سبزی منڈی سڑک کا پھیرا لگا کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ لشکارے مارتی گاڑی سے گدھا گاڑی ٹکرائی ہوئی ہوتی ہے تو نو دولتیے ان بچاروں سے تاوان وصول کیے بغیر چھوڑتے ہی نہیں۔

ایک دفعہ ہم واپسی پر سبزی خریدنے رک گئے جبکہ پیسے جیب میں اتنے تھے کہ جتنی ایک سرکاری ملازم بلکہ معلم کی اوقات ہوتی ہے۔ اب کار والے گاہک پہ نظر پڑی تو ہتھ گاڑی والا الگ آوازیں دے رہا ہے، ڈھابے والا الگ کہہ رہا تھا "کیا چاہیے صاب؟" فروٹ فروش کہہ رہا ہے، "کتنے کلو ڈالوں سر جی" اور یہ سر جی بچارا کان لپیٹے کسی سستی سبزی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ مبادا بھرم نہ کھل جائے کہ کار والا اور وہ بھی قلاش۔۔۔ مہینے کے آخری عشرے کے آخری دن تھے اور ہم ٹھہرے معصوم ومظلوم ملازم۔۔۔ اردگرد عجیب عجیب سریلے و بھدے لاؤڈ سپیکر جتنی تیز آوازیں۔۔۔ "سو کا مال چالیس، دو سو کا پچاس میں۔" ایک طرم خان یوں چیخ رہا تھا "سستے لے لو ٹینڈے لے کدو لے بھنڈی مرچ لے لو پیاز لے لو یہ دیکھو سوات کے تازہ ٹماٹر" ایک نے تو حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر سارندہ شروع کر دیا تھا "مفت لے لو مفتے لے لو مٹر تازے خستے لے لو" ہمیں مٹر بھائے اور خریدنے لگے مگر اُف جیب میں تھے دو سو اور وہ مفت کے مانگ رہا تھا تین سو۔۔۔ طوعاً و کرہاً ساتھ بیٹھے ہوئے اشفاق سے رقم لینی پڑی۔

میری دیکھا دیکھی اشفاق کو بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی سوجھی اور وہ اُن فروٹ کو خریدنے کے لئے گاڑی سے اُترا، جو شائد دور کے ڈھول سہانے کے مصداق اُسے اچھے لگے تھے۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ اس کے ساتھ بھی کئی فروٹ فروش کھینچا کھینچی کھیل رہے ہیں۔

"بھائی صاحب دو سو کے ڈال دوں؟ بالکل تازہ آم۔"

دوسرا اس سے بھی تیز طرار نکلا "بھائی جی یہ دیکھیں، چکھ لیں بیشک" اشفاق کو ایک دانہ تھماتے ہوئے ایک خرانٹ پھل فروش بولا۔

اشفاق بے چارا بھی دو بھینسوں کے درمیان مرتا کیا نہ کرتا، اُسے دانہ تھمانے والے سے آم خریدنے ہی پڑے کیونکہ مروت بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے اگر چہ یہ چیز غربت کے مارے ہوئے ان لوگوں کے پاس رتی برابر بھی نہیں رہنے پاتی۔ پاپی پیٹ کے نخرے انہیں وہ کچھ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ توبہ بھلی۔ انہیں ہر صورت پیٹ پوجا کی پڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اشفاق جیسے بامروت گاہک ملیں تو جو تھوڑی بہت عزت ہوتی ہے، وہ بچی رہتی ہے ورنہ طعن و تشنیع سُن کر ہی سہی لیکن اُنہیں گاہک کو مال تو بہر حال بیچنا ہی پڑتا ہے۔ وہ عزت و خودداری جسے حضرت اقبال "خودی" کے نام

ایک علاقے کے چند کھاتے پیتے، تعلیم یافتہ نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ الیکشن کے موقع پر کسی قسم کے جھرلو کے دام میں نہیں آئیں گے بلکہ رائے عامہ کو آزاد اور بیباکانہ طور پر اثر انداز کرنے کا جہاد کریں گے۔ اس علاقہ کے مستقل اور سند یافتہ عزت مآب وزیر نے یہ خبر سُن کر بہت واہ واہ کی۔ تعلیمی ترقی اور جمہوری آزادی کے عنوان پر بڑے خوشگوار قصیدے گائے اور ان نوجوانوں کے نیک ارادوں پر حکومتِ وقت کی خیر سگالی کا اسٹیکر چپکانے کے لئے وزیر صاحب نے اُن سب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو فرمایا۔ پُرتکلف دعوت اُڑی۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں اور جب وہ نوجوان کافی کی پیالیاں لے کر آرام سے صوفوں پر بیٹھ گئے تو کیا یک کمرہ بند کرکے باہر سے قفل لگا دیا گیا۔ ایک یا دو روز بعد جب الیکشنوں کی مہم اچھی طرح سر ہوگئی تو یہ بلند ہمت نوجوان بھی رہائی پا کر خیر سے بدھو گھر کو لوٹے۔

شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب

سے موسوم کرتے چلے آئے ہیں، وہ گھر میں ہی چھوڑ کر آتے ہیں۔ اگر چہ محنت مزدوری باعزت طریقے سے بھی ممکن ہے مگر سبزی منڈی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ کوئی بھی گاہک خالی ہاتھ نہ لوٹنے پائے، سب کو ڈز لگاؤ اور ایسا ہاتھ دکھاؤ کہ مدتوں یاد رکھیں۔ اس کے لئے طعن و تشنیع سننا کوئی اچھنبے کی بات کہاں۔

اگر آپ کو کبھی اخلاق حسین کو سننے کا اتفاق نہیں ہوا تو دور مت جایئے 'سبزی منڈی تشریف لے آیئے۔۔۔ فروش پھل فروش اور سبزی بیچنے والے اِتنی سریلی آواز میں ''آلوٹینڈے لے لو، پیاز لے لو، گوبھی لے لو'' پکار رہے ہوتے ہیں کہ اُمید واثق ہے کہ قبر میں اخلاق حسین کی روح بھی تڑپ تڑپ اُٹھتی ہوگی کہ موسیقی کو تو میں فلم نگری چھوڑ کر آیا تھا، یہ سبزی منڈی میں کیا کرتی پھر رہی ہے جبکہ اسے معلوم نہیں ہوگا کہ فلمیں شلمیں تو اب ایک انگلی کی مار ہیں۔۔۔ بھلا سنیما جا کر کسی نے مرنا ہے۔ کیا معلوم کس کو نے میں کون خودکش حملہ آور بیٹھا ہوا ہو اور ہمیں ہمیشہ کے لئے عالمِ بالا کی سیر پر روانہ کردے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ سبزی منڈی کے دھانے پر ہی موسیقی سے لطف اندوز ہو لیا جائے۔

اگر خدانخواستہ کوئی ٹریفک پولیس والا آجائے تو سب چوہوں کی طرح کونوں کھدروں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں کہ ظالم کہیں ناجائز تجاوزات کا پرچہ ہی نہ کاٹ لے۔

جیسے تیسے میری اور اشفاق کی جان چھوٹی۔ رینگتے رینگتے سبزی منڈی چوک کو پار کیا اور گھر کی راہ لی۔

رات کو اکثر اشفاق سے فون پر رابطہ رہتا ہے۔ اس بار جب میں نے فون کیا تو اس نے جھٹ سے ریسیور اٹھا لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے فون کے انتظار ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے پھل فروش کی شان میں ایسی قصیدہ خوانی کی کہ الامان والحفیظ۔ اس دوران جب وہ ذرا سانس لینے کے لئے رُکا تو میں نے استفسار کیا کہ بھئی کیا ہوا ہے؟ کس نے دُم پر پاؤں رکھ دیا ہے؟؟ اس پر اُس نے پھر اس پھل فروش کی شان میں ایسی موٹی موٹی گالیاں نکالیں کہ اگر احاطۂ تحریر میں لائی جائیں تو ہمیں منٹو کی کیٹیگری میں با آسانی جگہ مل سکتی ہے۔ اُس نے وضاحت شروع کر دی کہ اس۔۔۔ (خالی جگہ کو آپ اپنے ظرف اور اشفاق کے پٹھانی خون کے لاوے کا قیاس کر کے از خود پُر کر لیں) پھل فروش نے آنکھوں میں سلائیاں پھر کر رکھ دی تھیں اور کمال مہارت سے آم کے نام پر ایسا ایسا گند شاپر میں ڈال کر مجھے تھما دیا تھا کہ کیا بتاؤں۔''

ہاہاہاہا او ہو ہو ہو۔۔۔ میری ہنسی کسی صورت تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور اشفاق تھا کہ غصے سے فوں فوں کر رہا تھا اور اُبل اُبل پڑتا تھا۔ میرے قہقہے پر مزید چراغ پا ہو گیا اور بولا ''ہاں ہاں یار! تو بھی میرا مذاق اُڑا۔۔۔ بیگم نے تو ویسے بھی کچھ کسر نہیں چھوڑی۔''

میں نے کہا ''یار! میں تم پر نہیں ہنس رہا ہوں بلکہ اپنے آپ پر ہنس رہا ہوں۔ اُس ستم ظریف نے تو میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک کر رکھ دی تھی۔ ایسی ایسی گلی سڑی سبزیاں تھما دی تھیں کہ توبہ بھلی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے ایک تو اپنے حق حلال کے کمائے ہوئے پیسوں کا ماتم منا رہا ہوں، دوسرا گھر والی کی باتیں الگ میرا خون جلا رہی ہیں۔ میری فضول خرچی اور احمقانہ طرزِ عمل پر اُس خدا کی بندی نے میری ایسی خبر لی ہے کہ چھپائے نہ چھپے اور بتائے نہ بنے۔ گویا ہم دونوں ہی نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ ہماری ساری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ بڑے اُستاد بنے پھرتے تھے اور دنیا کو پڑھانے کا دعویٰ کرتے تھے، وہ الف بے سے بھی نابلد لوگ ہمیں پڑھا کر چلے گئے۔۔۔ بلکہ با الفاظِ دیگر ہمیں اُلو بنا کر چلے گئے۔۔۔ لیکن خیر، مجھے اس بات کا اطمینان بھی ہے کہ میں اکیلا ہی اُلو نہیں ہوں۔۔۔ ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے۔۔۔ ہاہاہاہا۔''

فون کو کریڈل پر رکھنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ پاپی پیٹ بھی انسان کو کیا کیا ہنر سکھا دیتا ہے۔ فطری طور پر خالص چیزوں میں بھی دھوکہ دہی اور چال بازی کا یہ عالم ہے تو دیگر کاروبارِ حیات میں کیا کیا طرزِ عمل نہ اپنایا جاتا ہوگا۔

اللہ ہمیں صحیح کاروبار کی توفیق دے۔ آمین!

شوکت علی مُظفّر

احتجاجاً ہنسو!

موبائل فون کے شور کرنے پر اس کی اسکرین دیکھی تو نا معلوم نمبر جگمگا رہا تھا۔ ہم نے کال ریسیو کی، دوسری جانب کوئی صاحب پشاور سے بول رہے تھے۔ اُنہوں نے ہمارے ہیلو کے جواب میں کہا ''تم لوگ اب مذاق کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔''

ہم نے صفائی پیش کی ''مگر میں نے تو آپ سے کوئی مذاق کیا ہی نہیں۔''

''مجھ سے نہیں کیا مگر کرتو رہی ہے۔'' خان صاحب نے اُردو میں پشتو گرامر کے ساتھ کہا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے یا پھر میں آپ کی بات نہیں سمجھ پا رہا، آخر بتایئے تو سہی یہ کس مذاق کی بات کر رہے ہیں جو ہم سے سرزد ہو گیا ہے؟''

''اپنے کالم میں مذاق کرتے ہو اور کیا؟ اب یہ سب ختم کرو، ہنسنے کا نہیں رونے کا وقت آ گیا ہے، پہلے افغانستان میں خونریزی کی گئی اسامہ تو نہ ملا مگر سب کو انصاف خوب فراہم کیا گیا، اپنے پرائے کو ایک ہی بندوق سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ عراق میں بے گناہوں کو خون میں نہلا دیا گیا، پھر لبنان میں ہونے والی قتل و غارت نے آنکھیں نم کر دیں اور اب ملکی صورتحال بھی اس قابل نہیں کہ ہنسا جائے، بگٹی کو مار دیا گیا اور اس کے بدلے میں دو صوبے کلی طور پر اور دو صوبے جزوی طور پر اس کی وجہ سے مسائل کا شکار ہوئے۔ کراچی، حب اور کوئٹہ میں جو ہنگامہ آرائی اور بم دھماکے ہوئے اس سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں، پشاور میں معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تو کیا اب بھی ہم ہنسنے کے قابل رہے ہیں؟ اب رونے کا وقت ہے، سنجیدہ ہونے کا وقت ہے اس لیے اب بس کرو۔۔۔ مذاق بند کر دو اور احتجاجاً ہی سہی سنجیدہ لکھو۔''

خان صاحب نے درج بالا باتیں بھی پشتو گرامر کے ساتھ ہی ادا کی تھیں مگر ہم نے اسے کسی حد تک ''ادبی'' کر دیا ہے۔ خان صاحب کی باتیں کافی وزن دار سہی لیکن ہماری بھی مجبوری ہے، ہم لاکھ کوشش کے باوجود بھی چاہیں تو سنجیدہ نہیں لکھ سکتے۔ ایک مرتبہ تو والدہ کے کہنے پر گاؤں

تعزیتی خط لکھنے بیٹھ گئے، مکمل کیا تو والدہ نے پڑھ کر سنانے کو کہا، ہم نے ابھی آدھا ہی خط پڑھا تھا کہ والدہ کی آواز سنائی دی ''اسے پھاڑ کر پھینک دو۔''

''آخر کیوں، اتنی محنت سے لکھا اور آپ کہہ رہی ہیں اس تعزیت نامہ کو پھاڑ دوں۔'' ہم نے وجہ جاننا چاہی۔

''تعزیت نامہ۔۔۔'' والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا ''کس تعزیت نامہ میں یہ لکھا جاتا ہے، ہم سب یہاں خیریت سے ہیں اور آپ بھی ''خوش'' ہوں گے اور باقی کے جملے بھی یقیناً تم نے اسی طرح کے لکھے ہوں گے۔''

اب آپ خود ہی سوچیے ہم بھلا والدہ محترمہ کو کیسے سمجھاتے کہ یہ تو ابتدائی رسمی جملے تھے، خیر خان صاحب کے حکم کے مطابق ہم نے سوچا تھا کہ اِس مرتبہ سنجیدہ لکھنے کی کوشش کریں گے، لیکن ہمیں انتہائی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ بقول شاعر

کون بہتے ہوئے اشکوں پہ نظر رکھتا ہے
لوگ ہنستے ہوئے چہروں کو دعا دیتے ہیں

ہم صرف دعاؤں کے حصول کے لیے ہی چہرے پر مسکراہٹ سجائے رہتے ہیں مگر نجانے مَلک اس بات کو کیوں نہیں مانتا، کہتا ہے تمہارا چہرہ ہی ایسا ہے۔ بے شک چہرہ ایسا ہو گا مگر تحریر کو اس طرح کرنے میں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے، اب خان صاحب نے فرمائش کی ہے، میں احتجاجاً سنجیدہ لکھوں۔۔۔ مگر کیسے لکھوں؟ ہر کسی کے احتجاج کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے، امریکی احتجاج کرنا چاہتے ہیں تو کسی بھی بے بس ملک میں بمباری کر دیتے ہیں۔ برطانیہ والے کسی واقعے پر احتجاج کرنا چاہیں تو ایک یا دو منٹ کی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ جاپانا والے احتجاجاً ایک دو گھنٹے زیادہ کام کرتے ہیں۔ بھارت احتجاجاً دھمکیاں دیتا ہے اور پاکستان میں احتجاجاً اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار لی جاتی ہے، اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، اپنے ہی بھائیوں کا خون بہا دیا جاتا ہے۔۔۔ اِسی طرح نامور شخصیات احتجاج کرنے پر آئیں تو زاہدہ حنا، نسیم زہرہ، احمد فراز جیسے لوگ اپنے حصے میں آئے ہوئے ایوارڈ قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔۔۔ سیاستدان ہوں تو

پاکستان بنانے کی ضرورت

جگن ناتھ آزاد کے پہلی دفعہ پاکستان پہنچنے پر مدیر ''نقوش'' محمد طفیل صاحب نے اُن کے اعزاز میں دعوت دی، جس میں احتراماً صرف سبزیاں ہی رکھی گئی تھیں۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جگن ناتھ آزاد نے محمد طفیل کو مخاطب کر کے کہا ''اگر آپ نے سبزیاں ہی کھلانی تھیں تو پھر آپ کو پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

دھرنے اور ہڑتالیں کروانے پر تل جاتے ہیں۔۔۔ طالب علم ہوں تو کتابیں پھینک کر کلاشنکوف اٹھا لیتے ہیں۔۔۔ اداکارائیں ہوں تو احتجاجاً پورا لباس پہننا شروع کر دیتی ہیں۔۔۔ غریب غربا اور ان پڑھ لوگ ہوں تو پتلے اور ٹائر جلا کر احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں۔۔۔ احتجاج بھی انتقام ہی کا ایک جزو ہے، ادنٰی اور کمتر درجے کا انتقام۔۔۔ غرض ہر ملک اور فرد کا احتجاج کرنے کا اپنا انداز ہے، انتقام لینے کا اپنا ہی طریقہ ہے، بالکل ان صاحب جیسا جو قریب المرگ تھے اور ان کی اہلیہ ان کے سرہانے بیٹھے ان کی وصیت سن رہی تھیں، وہ کہنے لگے ''تم میرے مرنے کے بعد شکور صاحب سے شادی کر لینا۔''

''مگر وہ تو تمہارے کاروباری حریف رہے ہیں!'' اہلیہ نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا ''ہر موقع پر انہوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں میں ان سے شادی کر لوں۔''

''ہاں''۔۔۔ شوہر نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا ''میں اس سے زیادہ بہتر انتقام اُس بدفطرت انسان سے نہیں لے سکتا۔''

اسی طرح خان صاحب نے احتجاج کرنا چاہا تو ہمیں فون پر سخت لہجے میں سنجیدہ لکھنے پر زور دیا، خان صاحب کا احتجاج اور فرمائش کا احترام مجھ پر قرض بھی ہے اور میرا اخلاقی فرض بھی۔۔۔ مگر میں سنجیدہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ احتجاج کرنے کا میرا بھی اپنا ہی انداز ہے، بقول شاعر

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

سیّد ممتاز علی بخاری

مرزاجی

ہمارے دوست چپ شاہ کہتے ہیں کہ لفظ مرزا درحقیقت "مرزرا" سے ماٴخوذ ہے۔اس کی تاویل وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ اس قوم کے لوگ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے کو تیار ہو جایا کرتے تھے۔اس لیے اُس دور کے ناموروں اور آج کے نامعلوم دانشور نے انہیں مرزرا کا خطاب دیا جو امتدادِ زمانہ کے باعث مرزا رہ گیا ہے۔خیر یہ چپ شاہ کی ذاتی رائے ہے جس سے میرا، آپ کا یا کسی کا بھی متفق ہونا ضروری نہیں۔چپ شاہ تو مرزا نام میں سے مرچوں کی تاثیر بھی نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

مرزا بہت عاشق مزاج ہوتے ہیں۔مرزا صاحباں کی لوک داستان اس کی زندہ مثال ہے۔یہ وہ واحد داستان ہے جس کا عاشق تاریخ میں اپنا نام محبوب سے آگے لکھوا کر فخر محسوس کرتا ہے۔اگر عشق ان کی وراثت نہ ہوتا تو پھر مرزا غالب کیوں ایک ڈومنی کے عشق میں مبتلا ہوتے۔اردو ادب کی تاریخ دو اقسام کے ادیبوں کا مجموعہ ہے۔ایک وہ جو میر یا مرزا ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے فیض یافتہ ہیں۔اب آپ خود ہی نظر دوڑائیں ادب کی دنیا کے شہسوار میر قوم کے سپوت میر تقی، میر درد، میر انیس۔۔۔اور مرزا قوم سے تعلق رکھنے والے مرزا غالب، مرزا داغ، مرزا سودا وغیرہ وہ ادیب ہیں جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل ہی رہے گی۔

اُردو ادب کا دامن طنز و مزاح کے حوالے سے ایسے ہی تنگ ہے جیسے لاہور کے گلی محلوں کی سڑکیں۔بس ہر طرف دو ادیبوں کا چرچا ہے۔اول پطرس بخاری جنھیں بابائے طنز و مزاح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے دس پندرہ مضامین لکھ کر ادب کی دنیا میں تہلکا مچا دیا اور دوسرے مشتاق یوسفی جن کے حوالے سے ناقدین یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ہم دورِ یوسفی میں رہتے ہیں۔ناقدین یقیناً بیوٹی پارلرز کی روز افزوں بڑھتی تعداد کو نظر انداز کر رہے ہیں ورنہ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ "سب پاؤڈر کا کمال ہے"۔لوگ ان کی تحریروں کی چاشنی اور عوام میں اثر پذیری کا باعث ان کی صحت، زباں، حسِ مزاح اور طرز بیان کو قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک اُن کی شہرت کی اصل وجہ دونوں کے دوست مرزا عبدالودود بیگ اور مرزا ہیں کہ جن کی عاقلانہ حرکتوں اور

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر سے جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

یہ شعر جب ہم سے چپ شاہ نے سنا تو انہوں نے پوچھا کہ کس وحشی سے ابن انشاء کا واسطہ پڑا تھا لیکن ہم خود اس بات سے لاعلم تھے۔

پچھلے وقتوں میں ہر دوسرا شخص مرزا ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو صرف دو مرزا ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مرزا عبدالودود بیگ اور دوسرے ذوالفقار مرزا۔۔۔!!! اگر فہمیدہ مرزا کو بھی گنتی میں شامل کرلیں تو اس زمانے میں پورے اڑھائی مرزا ہیں۔ ہماری اس بات پر چپ شاہ معترض ہوئے کہ مرزاؤں میں ثانیہ مرزا بھی تو ہے۔ پھر ہم نے "میر تقی میر" کے فارمولے کو اپناتے ہوئے مرزاؤں کی تعداد پونے تین کردی۔

مرزا لٹھ مار بھی ہوتے ہیں۔ جس کو یقین نہیں آتا وہ "ذوالفقار مرزا" کو دیکھ لے۔ پرانے وقتوں میں شہرت اور ناموری کا دوسرا نام ہوا کرتا تھا تبھی تو مرزا قادیانی نے اس نام کو اپنے مذہب کی تشہیر کے لیے استعمال کیا۔ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک انتہائی نفیس اور شائستہ انسان ہمارے محلے میں منتقل ہوا۔ بڑا ہی اچھا ہمسایہ ثابت ہوا۔ ایک دو روز میں ہی ہم گھل بیٹھے۔ جب اسے ہمارے ادیب ہونے اور چپ شاہ کے مفکر ہونے کا علم ہوا تو عددی مساوات نہ ہونے کے باوجود خوب نبھنے لگی۔ ایک دن ہم بیٹھے مریخ کے مستقبل کے حوالے سے ایک دوسرے کو اپنے زریں خیالات سے آگاہ کررہے تھے کہ اچانک ہمارے محلے میں رہنے والا ایک توتلا ہمارے کمرے میں گھس آیا اور آتے ہی پھولی سانس کے ساتھ سلام دعا کرنے کے بعد ہمارے ہمسائے جن کا نام مرزا خلیق الزمان تھا، سے کہنے لگا "مرزائی! آپ کو ایک بندہ بُلا رہا ہے۔ مجھے آپ کی بیگم نے بھیجا ہے۔"

مرزا صاحب کو بہت غصہ آیا۔ وہ ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔۔۔ بھائی قسم لے لو۔ میں مسلمان ہوں مرزائی نہیں۔" اس کے بعد اس بے چارے کی اتنی دھنائی کی کہ خدا کی پناہ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہم نے مرزا صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ یہ بے چارہ قوتِ گویائی سے معذور ہے اُس وقت تک وہ قوتِ سماعت بھی گنوا چکا تھا۔

کار کی چابی تو دیتی جاؤ بیگم!!

آج بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مرزا شہرت اور دولت کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ مرزا کے حصول کے لیے ہم نے بھی منصوبے بنانے شروع کیے لیکن ہم ابھی سوچوں کے بھنور میں غوطے لگا رہے تھے کہ شعیب ملک نے بازی جیت لی۔ پھر ہم نے اپنی تحریروں کے لیے کسی مرزا کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن پہلے ہی مرحلے میں چپ شاہ گلے پڑ گئے۔ اب ہم ان کے پاؤں پڑتے ہیں لیکن ان سے پیچھا نہیں چھٹتا۔

چپ شاہ کا کہنا ہے کہ کسی دور میں مرزا بھی فلم انڈسٹری پر اسی طرح چھائے ہوئے تھے جس طرح آج پنجابی فلم میں "گجر" راج کررہے ہیں۔ اُس دور کی چند فلموں کے نام دروغ برگردنِ چپ شاہ یہ ہیں: پھڑک مرزا، مرزا کی قربانی، عاشق مرزا، حسینہ اور ظالم مرزا اور پیاسا مرزا۔۔۔

کائنات بشیر، جرمنی

قبلہ حکیم صاحب

عزت مآب قبلہ جناب حکیم جی!

ہوا کے ہاتھ اک ارمان بھیجا ہے
روشنی کے ذریعے اک پیغام بھیجا ہے
فرصت اگر ملے تو اسے قبول کر لینا
اس ناچیز نے پیارا سا سلام بھیجا ہے

خاکسار۔گ،ب،ج

جواب: وعلیکم السلام، والسلام۔۔چشم ما روشن دل ماشاد (شکر ہے کسی نے تو ہمارے دل کو سمجھا ورنہ لوگ تو ہمیں ہر وقت جڑی بوٹیوں، نباتات کی پوٹلی سمجھتے ہیں)

☆☆☆☆

سوال: عزت مآب حکیم صاحب، میری مونچھ پر بالخورہ ہو گیا ہے۔کافی سارے نسخے آزمائے، ڈاکٹر کو بھی دکھایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔برائے مہربانی رہنمائی کریں؟

جواب:

(مونچھوں کو ہٹا لے چہرے سے
تھوڑا سا اجالا ہونے دے)

اے میاں! جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو تم لوگوں کو حکیم کی یاد آتی ہے۔ پہلے بھاگے بھاگے ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے ہو۔ انٹ شنٹ دوائیاں کھاتے ہو۔اول جلول ٹیکے لگواتے ہو۔اب حکیم کوئی جادوگر تو ہے نہیں کہ چھڑی گھما کر تمھاری مونچھوں کو واپس لے آئے۔بہتر ہے مونچھیں صفا چٹ کرا دو مطلب کلین شیو کر لو اور دوست احباب، خاندان میں یہ بات پھیلا دو کہ مونچھوں کا فیشن بالکل ختم ہو گیا ہے۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم صاحب، میری بہن کے بال بہت گھنے اور لمبے ہیں۔اب ان میں بہت جوئیں پڑ گئی ہیں۔کچھ مہربانی فرمائیں؟

جواب: لو کر لو بات، میں کیا مہربانی فرماؤں وہ تو تمہاری بہن نے مفت میں تم سب گھر والوں پہ فرما دی ہے۔پھر بھی پوچھا ہے تو بہتر ہے کہ بہن کے بال بوائے کٹ کروا دو۔اگر اس کی جگہ بھائی ہوتا تو میں ٹنڈ کروانے کا مشورہ بے دریغ دے دیتا۔اور تارا میرا کا تیل خوب اچھی طرح اس کے بالوں میں ڈال کر مساج کروتا کہ جوئیں وہیں پہ دھیں پڑا اس ہو جائیں۔

☆☆☆☆

سوال: جناب میری عمر صرف ۲۰ سال تھی جب میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اب جبکہ میری عمر ۴۱ سال ہے تو چہرے کی جھریاں مزید بڑھ گئی ہیں۔ خدارا کوئی علاج بتائیں تا کہ میرا چہرہ جھریوں سے بالکل پاک ہوجائے؟

جواب:

ابھی تو میں جوان ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں

محترم، سب سے پہلے تو یہ جوانی شوانی والے گیت سننا بند کر دیں۔ ویسے بھی عمر ریوانڈ نہیں ہورہی جو تم ماتم کر رہے ہو۔ اس عمر میں جھریاں نہیں پڑیں گی تو کیا چہرے پہ نور پڑیگا؟ میاں تمہاری جگہ کوئی خاتون شکوہ گو ہوتیں تو میں اسے گھونگھٹ نکالنے کا مشورہ دے دیتا۔ خیر تمہارے لیے بہتر ہے کہ شیشہ دیکھنا بند کر دو۔ گھر والوں سے کہہ دو نگار خانے (گھر) کے تمام آئینے چھپا دیں ویسے بھی،

مجھے یقین ہے آرائش جمال کے بعد
تمہارے ہاتھ سے آئینہ گر گیا ہو گیا

☆☆☆☆

سوال: مکرمی حکیم صاحب، میرا مسئلہ بڑا انوکھا ہے۔ رات کو سوتے وقت میرے منہ میں تھوک جمع ہوجاتا ہے۔ سردیوں میں یہ مسئلہ مزید بڑھ جاتا ہے۔ کچھ علاج معالجہ ممکن ہے؟

جواب: ''رال ٹپکاتے رہنا'' یہ محاورہ تو نصاب میں پڑھا ہی ہوگا۔ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ کھانے کی خواہشات بہت زیادہ ہیں جنہیں آپ پورا نہیں کر پاتے اور میاں خواب میں رال ٹپکاتے ہو۔ سردیوں میں زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ خواب میں آپ کو گھی سے نچڑتے مرغن تر بتر کھانے، نہاری نہوری، پائے شائے، ککڑ شکڑ، حلوے خلوے پریشان کرتے ہوں گے۔ اس لیے سوتے وقت ہاجمولا کی دو گولیاں چوس لیا کریں تا کہ ہاضمہ ہو ضما درست رہے۔

☆☆☆☆

سوال: جناب، میرا نام فلاں ڈھمکاں ہے۔ کوئی آسان سا نسخہ بتائیں جو گھر میں بنایا جاسکے۔ جس کے اجزاء آسانی سے مل جائیں۔ ہم بورنگ کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے بازاری شیمپو استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ کوئی نسخہ بتا دیں تا کہ اوروں کا بھی بھلا ہوجائے۔

جواب: برخوردار، نام میں کیا رکھا ہے۔ للو پنجو، گ ب سے بھی کام چل جاتا۔ پر مسئلہ تو اچھے سے لکھا ہوتا۔ تمہارا آدھا ادھورا سوال پڑھ کر میں چکرا گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس چیز کا نسخہ چاہ رہے ہو۔ اگر شیمپو کا نسخہ طلب کر رہے ہو تو پھر بازار میں موجود سینکڑوں شیمپو کس کام کے۔۔؟ تمہیں بنانے کا طریقہ بتا دیا تو شمپو بنانے والے ہم حکیموں کو منہ بھر بھر کر بددعائیں دیں گے۔ اور کسی کی روزی پر لات مار کر جو منہ ہم دنیا میں لے کر بیٹھے ہیں، آخر اسے ایک دن خدا کو بھی لے جا کر دکھانا ہے۔ اگر صابن بنانا چاہتے ہو تو یہ گھوٹا گھوٹی تمہارے بس کا کام نہیں۔ اپنے حال پر شکر ادا کرو اور حمام میں جا کر نہا لیا کرو۔ شیمپو، صابن اور پانی تینوں کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

☆☆☆☆

سوال:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

جواب: لوکرلو بات، میاں!!!

دل تمہارا، جگر تمہارا، گردے تمہارے۔۔۔ میں کیا جانوں۔ بچو! کسی شاعر سے رابطہ کیا ہوتا۔ وہ تمہیں آسمان کے تارے گن کر بتا دیتا۔ عشق کی بلندیاں اونچائیاں، کھائیاں ناپ کر بتا دیتا۔ محبوب کی گلی کا پتہ، تمہارے درد کی شدت کی انتہا اور دوا دارو بھی کر دیتا۔

☆☆☆☆

سوال: معزز حکیم جی، صبح اٹھنے کے بعد میرا سر بھاری اور مزاج میں غصہ اور چڑچڑا پن ہوتا ہے۔ کہیں مجھے بلڈ پریشر، ڈپریشن تو نہیں۔۔؟ دوسرا ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھوں ہوں تو ٹانگ اور پاؤں سُن ہوجاتے ہیں۔ کچھ مسئلہ حل فرمائیے گا؟

جواب: مکرم، لگتا ہے رات کو بیوی سے دھا دھا دھم دھا دھم لڑائی کے بعد سوتے ہو۔ جس کا اثر صبح تک برقرار رہتا ہے۔ بلڈ

پریشر، ڈپریشن کی تشخیص ڈاکٹر کے لیے رہنے دو اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر نوابوں کی طرح بیٹھنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ ٹانگوں کی قینچی بنا کر بیٹھا کرو یا پھر پھسکڑی مار کر۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم صاحب مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ جو نسخے ٹوٹکے بتاتے ہیں وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ دوسرا ان جڑی بوٹیوں کے نام ایسے نایاب قسم کے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے جیسے یہ اس کرۂ ارض کی جڑی بوٹیاں نہ ہوں۔ اور پھر یہ بھی نہیں پتہ کہ دوا تیار ہونے کے بعد کس رنگ کی بنے گی؟

جواب: محترم تم لوگ ڈاکٹروں کی ایلوپیتھک دوائیاں تو بڑے مہنگے داموں جھٹ پٹ خرید کر اپنی کھال اتروا لیتے ہو اور حکیمانہ نسخے تمہیں مہنگے لگتے ہیں۔ میں نے کونسا مشک، عنبر، زعفران ان نسخوں میں ڈالا ہے۔ محترم یہ دوائیاں ہیں کوئی مصالحہ جات نہیں کہ بعد میں ہنڈیا کس رنگ کی بنے گی۔ اور حضرت میں اسی دنیا کی جڑی بوٹیاں بتاتا ہوں کوہ قاف کی نہیں۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم صاحب، میری پسلیوں اور پیٹ میں ہوا گردش کرتی رہتی ہے اور کھڑ کھڑ کی آوازیں آتی رہتی ہیں جس سے چار لوگوں میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا علاج بتائیں کہ آوازیں آنا مستقل بند ہو جائیں۔

جواب: ہے شاوا شے بھئی، لگتا ہے تمہارے پیٹ میں کوئی باورولا آفت مچائے ہوئے ہے۔ اس لیے چار لوگ چھوڑ یہ تنہائی میں بھی اپنا ساز بجا کر رہے گا۔ بادی اشیاء گوبھی، گوبھی، مٹر مٹر، بھنڈی بھنڈی کھانا بند کر دیں۔ گو مولیوں کے استعمال سے فضا میں پلوشن بڑھ سکتی ہے پھر بھی سلاد میں ضرور ان کا استعمال جاری رکھیں۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم جی، مجھے وہم کی بیماری ہے۔ ہر وقت ہاتھ دھوتی رہتی ہوں۔ کوئی نسخہ عنایت فرمائیے۔؟

جواب: بی بی۔ اس سوال کا جواب تو بہت پہلے مشہور زمانہ مفکر لقمان حکیم نے دے دیا تھا کہ وہم کا کوئی علاج نہیں۔ اب بتاؤ میں لقمان حکیم کی بات کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ ویسے بار بار ہاتھ دھونے میں حرج کیا ہے۔ ساتھ ساتھ لکس لکس صابن سے منہ بھی دھو لیا کرو تو مسکراتا ہوا نورانی چہرہ دیکھ کر تمہارے گھر والے کا دل بھی باغ باغ ہو جائے گا۔ وہ خود بخود گاتا پھرے گا،،

تعریف کروں کیا اس کی جس نے تمہیں بنایا

☆☆☆☆

سوال: جناب، مجھے بچپن سے انگوٹھا چوسنے کی عادت ہے۔ اب میں جوان ہو چکا ہوں لیکن نیند میں اب بھی یہ عادت ہے۔ جب صبح اٹھتا ہوں تو خود کو انگوٹھا چوستے ہوئے پاتا ہوں۔ کوئی نسخہ بتا دیں جس سے یہ عادت چھوٹ جائے۔

جواب: اے لو کر لو بات۔۔۔ میاں کل کو تمہاری شادی ہو گی تو تمہیں انگوٹھا چوستے دیکھ بیوی کیا سوچے گی کہ میں نے کسی منے سے شادی کر لی ہے۔ جو عادت تمہارے والدین کو چھڑوانی چاہیے تھی اس کے لیے تم میرے پاس لپکے چلے آ رہے ہو۔ خیر۔۔۔ بازار سے ایک تولہ ایلوا لا کر اس کا گاڑھا لیپ بنا کر انگوٹھے پر لگا لیا کرو۔ جب انگوٹھا منہ میں ڈالو گے تو لگ پتہ جائے گا تمہیں۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم صاحب!

میرا دل گھبرائے میری آنکھ شرمائے
کچھ سمجھ نہ آئے رے کہ مجھے کیا لاگے

جواب:

(اونہوں، یہ کس طرح کے انٹ شنٹ، ال بلل سوال آنے لگے ہیں)

برخوردار، میں تمہاری نبض کا معالج ہوں۔ تمہاری بے شرم آنکھ، اول جلول جذبات، دل کی بے ہنگم دھڑکنوں کا معالج نہیں ہوں۔ نہیں ہوتا کسی طبیب سے اس مرض کا علاج۔۔۔ عشق لا علاج ہے، بس پرہیز کیجئے

☆☆☆☆

سوال: جناب مکرم، شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دریائے راوی

میں زبردست سیلاب آیا تھا اور لاہور شہر کو بڑا نقصان پہنچا تھا لیکن باوجود دریائے راوی کے کنارے ہونے کے بادشاہی مسجد نہیں ڈوبی تھی بتایئے گا کہ کیوں؟

جواب: اومیاں تاریخ کی اولاد، یہ سوال تمھیں کسی خشک، بور تاریخی استاد سے پوچھنا چاہیئے تھا پھر بھی طفلِ مکتب تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اکبر کے زمانے میں بادشاہی مسجد نہیں بنی تھی۔

☆☆☆☆

سوال: حکیم جی، کیا ناشتہ کرنا بہت ضروری ہے؟ کیا میں ناشتہ ترک کرسکتی ہوں یا مجھے زبردستی ناشتہ کرلینا چاہیئے؟

جواب: اے لو۔۔۔۔۔

اپنے ہر سوال کا جواب ہو تم

بچی ناشتہ کرنے کے لیے بنا ہے ترک کرنے کے لیے نہیں۔ میرے خیال سے ناشتہ زبردستی دَھکے ڈھکے سے کر لینا چاہیئے۔ بے چاری بھینس صبح صبح اٹھ کر صرف ناشتے کے اللے تللے پورے کرنے کے لیے دودھ دیتی ہے۔ کیونکہ چائے کے بغیر پوتی دنیا والوں کی آنکھ نہیں کھلتی۔ سارا جہان روز صبح صبح ناشتے کے نام پہ انڈے، پراٹھے، کلچے کلچے، نہاری، پائے، نان چنے، حلوہ پوری، قیمے کے تر بتر پوڑے اور جانے کیا کیا کھا جاتا ہے۔ پھر بھاگتی دوڑتی زندگی کے لیے صبح کا ناشتہ بہت ضروری ہے۔ ویسے بھی اچھے دن کا آغاز اچھے ناشتے سے ہوتا ہے۔ بھوکا پیٹ تو دہائیاں مچاتا رہتا ہے۔ سو اب اپنے بے قابو جی کو منانا تمہارا کام۔

☆☆☆☆

سوال: جناب عزت مآب میرا مسئلہ بڑا عجیب ہے جو مجھے کچھ عرصے سے درپیش ہے۔ میں جب بھی دانت برش کرتا ہوں تو مجھے قے اور متلی محسوس ہوتی ہے۔ کیا اس کا کوئی حل ہے؟

جواب: برخوردار، لگتا ہے تم اپنے دانتوں کو اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی دینی چاہیئے۔ ٹوتھ برش جب تک چڑیل کے بالوں کی طرح نہ ہو جائے تم اسے استعمال کرتے رہتے ہو۔ اسی لیے جوابی ری ایکشن مل رہا ہے۔ رنگ برنگے نئے نئے ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ خرید لو۔ ڈنٹونک، ویکو وجردنتی منجن اور اخروٹ کو ئلے کا منجن استعمال کیا کرو۔ دانتوں کو نیا برش اور زبان کو نئے نئے ذائقے ملیں گے تو مسئلہ حل سمجھو۔

اضافی ٹپ: برش کو حلق میں گھسیڑنے سے احتیاط رکھو۔

☆☆☆☆

سوال: جناب میں پہلے دبئی سے امریکہ شفٹ ہو گیا۔ تب سے میرے بال بہت گرنے لگے ہیں۔ پتہ نہیں یہ امریکہ کے موسم کا اثر ہے یا گھر والوں سے جدائی کا۔ جس کا تاوان مجھے بالوں کی صورت بھگتنا پڑ رہا ہے۔ الجھن اور سوچ بچار میں۔۔۔۔ یہاں اچھا لائف سٹائل اور پیسہ ہے۔ کیا بالوں کو بچانے کی خاطر واپس چلا جاؤں؟

جواب: مسئلہ تو واقعی بڑا گھمبیر ہے۔۔ یہ تو پیسے اور بالوں میں پیچا پڑ گیا۔ ویسے اتنا کہہ دوں کہ دنیا کے بڑے بڑے ارب پتی امریکہ سے ہی ہوئے ہیں۔ میاں بال چلے گئے تو نئی وگ کا چانس باقی رہے گا۔ اور پیسہ چلا گیا تو گھر والے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ اب خوب اچھی طرح سوچ لو کہ کرنا کیا ہے۔

☆☆☆☆

سوال: میرے گھر والوں کا کہنا ہے۔

کہتے ہیں ڈاکٹر، حکیم کی وفا نہیں اچھی
لوگوں کے سب سوالوں کا جواب ہو تم

جواب: کبوتر کی اولاد، جا کر ان سے کہہ دو۔

ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا
میری حکمت کا حساب نہیں مل سکتا

☆☆☆☆

سوال: جناب والا! ماں کی دعا کو جنت کی ہوا کہتے ہیں تو ساس کی دعا کو کیا کہیں گے؟

جواب: میاں یہ سوال کسی جورو کے غلام سے کیا ہوتا۔ ویسے ساس کی دعا بھی تو بندے کو کسی نہ کسی پاسے لے ہی جائے گی۔ اُمید بہار رکھ!

بیگم کے پاس

شادی کے بعد زندگی مصروف تر ہوئی
اب اپنے دوستوں سے بھی ملتے نہیں ہیں ہم
امی بھی روز کہتی ہیں کچھ دیر گھوم آؤ
بیگم کے پاس بیٹھ کے ملتے نہیں ہیں ہم

محمد انس فیضی

چاچی نواز دے

بستر ٹٹولتے ہیں چچا جان ساری رات
ان کی خوشیوں کے لیے کوئی ساز دے
مولا ترے کرم کے ہیں وہ بھی تو منتظر
اس سال تو چچا کو بھی چاچی نواز دے

محمد انس فیضی

نئے سال کی دعا

دل سے دعائیں دیتا ہوں مسٹر لطیف کو
اس سال بھی میاں کی طبیعت ہری رہے
مولا نواز دے انہیں اولاد پھر کوئی
پھر سے مسز لطیف کی گودی بھری رہے

محمد انس فیضی

شوّر

کمزور نظر آتا ہوں کمزور نہیں ہوں
گفتار کا شوقین ہوں منہ زور نہیں ہوں
میں بھی تیری الفت میں بہادوں کئی دریا
فرہاد کی مانند مگر "شوّر" نہیں ہوں

محمد انس فیضی

قطعات

مولوی

پھرتی رہتی ہیں نیم کپڑوں میں
غیر سے بھی خطاب کرتی ہیں
مولوی جی کو دیکھ کر لیکن
رخ پہ فوراً نقاب کرتی ہیں

محمد انس فیضی

دیکھتے رہے

ہم کو میاں خبر تھی حرام وحلال کی
دیوانہ وار ہو کے مگر دیکھتے رہے
پلو کو اس نے آگے سے دوہرا کیا تو کیا
ہم بھی نظر جما کے اُدھر دیکھتے رہے

محمد انس فیضی

پرپوز

ہوتی نہیں ہے ٹھیک یہ تاخیر عشق میں
دل میں لگی ہوئی کو بھی ایکسپوز کیجیے
بازی کہیں نہ مار لے پھر دوسرا کوئی
اب وقت آ گیا ہے کہ پرپوز کیجیے

محمد انس فیضی

گے رجحان

میں جانتا ہوں کیسا ہے رجحان پوت کا
کچھ دیر سوچ کر ہی نتیجے پہ آ گیا
میرا خیال تھا کہ بھتیجی سے ہو نکاح
لختِ جگر کا دل تو بھتیجے پہ آ گیا

محمد انس فیضی

نسخۂ کارگر

پتھروں سے نہ یہ مانے گا، بہت ضدی ہے
سنگ بے سود رہے ہیں اِسے سمجھانے کو
بھیڑ کو لیلیٰ نے بندوق تھما کر یہ کہا
"کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو"

احمد علوی

اک ذرا انتظار---

کچھ بھی نہیں ہے پاس مرے خالی ہاتھ ہوں
تینوں طلاق لے گئی مجھ سے قمر جہاں
میری نظر میں یوں تو جہاں کے حسین ہیں
"اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں"

احمد علوی

قطعات

مودی کی ڈگری

کب گدھے کو بخش دے یارو وہ گھوڑے کی سند
سامنے قدرت کے چلتی آپ کی مرضی نہیں
آپ کے سر کی قسم فرضی ہوں میں سرتا قدم
صرف اک بی اے کی ہی ڈگری مری فرضی نہیں

احمد علوی

اُردو زبان

شوگر کے عارضے میں ہوں مدت سے مبتلا
ہر طرح کی مٹھاس سے خطرے میں جان ہے
ہندی میں لکھ کے لاتا ہوں میں اس لئے غزل
رس گلے سے بھی میٹھی یہ اردو زبان ہے

احمد علوی

زر اور شر

زر ہے لُوٹا براہِ شر تم نے
اب غریبوں کی آئی شامت ہے
قوم کو خوب لُوٹنے والو!
یہ شرافت ہے یا شرارت ہے؟

تنویر پھول

ٹرٹر

اے کہ تیرا نشان ہے ہاتھی
ہاتھی والوں کے حشر سے تُو ڈر
اہلِ عالم کی آنکھ میں حیرت
سُن رہے ہیں ٹرمپ کی ٹرٹر

تنویر پھول

ایشیاء

اگر گوروں کو اتنی ایشیا والوں سے نفرت ہے
بتائیں پھر وہ کیسے مانتے ہیں ابنِ مریم کو
تعلق ایشیا سے وہ بھی رکھتے تھے، حقیقت ہے
اگر وہ سامنے آئیں، رویّہ اِن کا پھر کیا ہو؟

تنویر پھول

سات اتوار

ایک لڑکا کر رہا تھا یہ دعا
اے خدا! بیڑے ہمارے پار ہوں
بارش و طوفاں سدا دنیا میں بھیج!
تاکہ ہر ہفتے میں سات اتوار ہوں

تنویر پھول

قطعات

برائلر گائے

یورپی چینلوں نے پھیلائی
یہ خبر زور شور سے، ہائے
جلد ایجاد ہونے والی ہے
ایشیا میں "برائلر" گائے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

۱۴ فروری

سوچتا رہتا ہے "انور" آج کل
کب ملے گی مجھ کو میری "انوری"
اس برس بھی وصل کا ناغہ نہ ہو
آ رہی ہے پھر سے چودہ فروری

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

درخواست

یکجا کریں گے دیس کی پانچوں ثقافتیں
یہ کام اپنے عشق سے کر کے دکھائیں گے
دل میں بسا کے پانچ ہی "صوبائی جانِ من"
اس شہر کو وفاقی علاقہ بنائیں گے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

نثری نظم

سماعت کی بڑی بدقسمتی ہے
نہایت نامناسب گائیکی ہے
ترنم سے سنا، مت نثری نظمیں
یہ نثری نظم کی بے حرمتی ہے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

نقادوں سے

ذرا سا یہ تحرک کیجیے گا
اس آفر کو سپیشل لیجیے گا
پنگوڑے میں غزل رکھی ہے میں نے
بزرگو!!!! آ کے جھولا دیجیے گا

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

پاکستان کی فریاد

جان چھوٹے گی کب مری جانے
بدتمیزوں کی چھیڑخانی سے
وہ بھی آنکھیں مجھے دکھاتے ہیں
ڈرتے رہتے ہیں جو زنانی سے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

قطعات

ہار

سوچ کر یہ آپ آزردہ نہ ہوں
آپ کا دل کیوں میں گرماتا نہیں
آپ آئے ہیں یہاں پر جیت کر
اس لئے میں ہار پہناتا نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دل لگی

بولے رو کر یہ عاشق ناکام
اب نہیں ہوتی عاشقی ہم سے
دل لگانے کی جب بھی کوشش کی
وہ لگے ہم سے دل لگی کرنے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بے بس

دیکھئے تو یہ کاروبار ہوس
بس کی اک سیٹ پہ ہیں بیٹھے دس
چشم و لب بھی ہلا نہیں سکتے
بس میں بیٹھے ہیں اور ہیں بے بس

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

میں

انا پرستی کی حد ہوگئی کہ اب ہم لوگ
کسی کو جانتے ہیں اور نہ کچھ سمجھتے ہیں
ہے گرچہ صورتِ انساں، صدا ہے بکری کی
جسے بھی دیکھو وہی کر رہا ہے "مَیں مَیں مَیں"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

زردہ

ہے لت پڑی ہوئی کہ کروں ایک کو میں دو
دولت کا شوق ہے میں کماتا ہوں اس لئے
میٹھے کا کوئی شوق نہیں ہے مجھے جناب
زردہ میں زر ہے دس دفعہ، کھاتا ہوں اس لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

انگریزی

زمستانی ہوا میں تھی عجب مستی عجب تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی اندازِ بلاخیزی
مرے آداب افرنگی، مرے اطوار بھی اعلیٰ
مگر سب کو پریشاں کر گئی تھی میری انگریزی

محمد خلیل الرحمٰن

قطعات

ابا ۔۔۔

مری آپا کو چاہے مال و زر دے
بڑے بھائی کو بھی اپنا ہنر دے
مرے ابا مری خواہش بھی ہے
حویلی بس یہ میرے نام کر دے

محمد خلیل الرحمن

انصاف

بچوں سے بڑھ کے کیوں نہیں پُر اعتماد ہم
کیوں جھوٹ بولتے ہوئے ہکلانا چاہیئے
اہلِ ہوس کے ہاتھ میں آیا ہوا ہے وہ
انصاف کو کچھ آپ بھی شرمانا چاہیئے

نوید ظفر کیانی

نیوز چینلز

نیوز چینلز کا ہے یہ دعویٰ
ہم فقط آگہی پھیلاتے ہیں
ہم بھی تائید کرتے ہیں اِن کی
یہ تو بس ''آگ ہی'' پھیلاتے ہیں

نوید ظفر کیانی

نثری نظم

ہائے مجنوں ہیں بھلا کیوں بیکس
کھولے بیٹھے ہیں دلوں کے بکس
اپنے سیل فون کو رکھیں چوکس
مانگ سکتی ہے صبا بھی بیلنس

نوید ظفر کیانی

کراچی

کراچی بلدۂ اربابِ دانش
مگر ہے بلدیہ اس کی عجب شے
بنا ڈالا ہے ''کوڑا دان'' اس کو
کراچی کو ''کوڑاچی'' کر دیا ہے

نوید ظفر کیانی

مذمت

یہ دہشت گرد کہتا پھر رہا تھا
ہے ظالم کاروائی بھائیوں کی
کمر ہی توڑ دیتے ہیں حکمراں
مذمت کر کے دہشت گردیوں کی

نوید ظفر کیانی

ڈاکٹر مظہر احمد

احمد علوی کی ظرافت

ظرافت انتہائی نازک مگر پیچیدہ فن ہے۔ گویا ظرافت نگار پلِ صراط پر چلتا ہے کہ اگر اس کے فکر وفن میں ذرا بھی لغزش در آئی تو انجام معلوم۔ بناوٹ یا مسخرہ پن اس نوع کے ادب کے لیے سمِ قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ مشہور نقاد پروفیسر محمد حسن نے طنز ومزاح میں مسخرے پن کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''طنز ومزاح کا سب سے بڑا دشمن ہے مسخرا پن۔ جسے مسخرے پن کی جتنی فکر ہوگی اتنی ہی وہ طنز ومزاح کی پست سے پست سطح تک اُترے گا۔ اعلیٰ طنز ومزاح دڑا کی، قوت مشاہدہ اور قوتِ اظہار کا مرہونِ منت ہوتا ہے اس کے مسخرے پن کا نہیں۔ طنز نگار یا مزاح نگار سر کے بل کھڑا ہوکر دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرنے کے بجائے صرف دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سے پردہ اُٹھاتا ہے کہ وہ اردگرد کی ناہمواریوں کو دیکھ سکے اور ان کے مضحک پہلوؤں پر ہنس سکے۔''

موجودہ عہد اسی مسخرے پن سے عبارت ہے۔ اور یہی وجہ ہے طنز ومزاح کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے۔ طنز ومزاحیہ شاعر مسخرے پن میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں اور یوں اپنے ہی فن کے قاتل بنے ہوئے ہیں۔ ایسے پرآشوب دور میں احمد علوی کی طنز ومزاحیہ شاعری اپنے موضوعات کے تنوع، طنز اور مزاح کے دیرینہ اور نت نئے حربوں کے برجستہ استعمال اور فکری ہم آہنگی کی وجہ سے ہماری توجہ کی مستحق ہے۔ ''ہنسے تو پھنسے'' احمد علوی صاحب کا تیسرا مجموعۂ طنز ومزاح ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں ''طمانچے'' اور ''چین ڈرائیو'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آکر قبولِ عام کی سند حاصل کرچکی ہیں۔ احمد علوی کا فن طنز اور مزاح دونوں میں کمالات دکھاتا ہے۔ اس فن کے لیے جو قوتِ مشاہدہ، باریک بینی اور قوتِ اظہار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور انھیں بروئے کار لاکر وہ بیک وقت فرد وسماج کی کمیوں اور خامیوں پر طنز

کے تیر برساتے ہیں اور طنز کے وسیلے سے اصلاح کی طرف گامزن بھی ہوتے ہیں۔ آیئے ''ہنسے تو پھنسے'' کاایک تجزیاتی جائزہ لیں۔

احمد علوی انتہائی بے باک ظرافت نگار ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کی ناہمواریوں، کمیوں اور بے اعتدالیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بطور خاص وہ سرکاری ادارے جواردو کی ترویج وترقی کے لیے قائم پر اُن کی کئے گئے ہیں، ان میں درآنے والی ناہمواریوں اورناانصافیوں گہری نظر ہے۔ نام نہاد ادیب وشاعر ایسے اداروں پر قابض ہیں۔ اقربا پروری، چاپلوسی، خدمت گاری جیسے عیوب عام ہوگئے ہیں۔ سیمیناروں، مشاعروں میں اپنوں کونوازنے کا سلسلہ بڑھتا جارہا ہے ایسے میں ایک حساس طنز ومزاح نگار کیوں کر خاموش رہ سکتا ہے۔ چنانچہ احمد علوی ایسے اداروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ متذکرہ مجموعۂ کلام میں چند نظمیں ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں ''کچا چٹھا''،''مشاعرہ جشنِ جمہوریت''،''مشاعرے کا شاعر''،'' آج کا ادبی منظر نامہ'' اور''ایکسپرٹ'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

طنز ومزاح اعتدال، متانت اور سنجیدگی کا فن ہے۔ اس میں ذراسی لغزش طعن وتشنیع بن جاتی ہے۔ احمد علوی کا فن کہیں کہیں اس زمرے میں داخل ہونے لگتا ہے۔ مگر موصوف بھی کیا کریں کہ ان کے تجربات ومشاہدات اتنے تلخ وترش ہیں کہ ان کے اظہار کے لیے قلم کوزہر میں ڈبونا ہی پڑتا ہے۔ ہماری تو صرف یہی دُعا ہے کہ ان کی یہ زہرناکی معتدل ہوجائے تاکہ ان کے قلم سے ظرافت کے اعلیٰ نمونے صفحۂ قرطاس کی زینت بنیں۔

اس نوع کی تیز وتلخ نظموں کے علاوہ احمد علوی کے اس مجموعے میں قطعات، بند، ہزلیات وغیرہ کا ذخیرہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ ان تخلیقات میں طنز ومزاح کے تمام حربوں کو انھوں نے بحسن وخوبی برتا ہے۔ موضوعات کے علاوہ پیروڈی اور تضمین سے بھی مزاح نگاری کی گئی ہے۔

اُردو کی ظریفانہ شاعری کی روایت میں مزاحیہ غزل جسے

معافی چاہتا ہوں مادام کہ سائن بورڈ آپ کے راستے میں مخل ہوا۔۔۔

احمد علوی نے ''ہزل'' کا عنوان دیا ہے، ابتدا ہی سے موجود رہی ہے۔ انھوں نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی ذہانت سے نت نئے موضوعات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ ان غزلوں کی فضا نہایت شگفتہ ہے۔ شگفتہ نگاری کی ایسی مثالیں معدوم ہوتی جارہی ہیں چنانچہ ان کی اہمیت یوں بھی دوچند ہوگئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

کرتی ہے پولس اس سے پہاڑوں کو برآمد
جس چور نے رائی بھی چرائی نہیں ہوتی

اس دن نہیں ملتی مرے لہجے میں ظرافت
جس دن مری بیگم سے لڑائی نہیں ہوتی

میک اپ چڑھا کے چہرے پہ کہتی ہے دوستو
کردے کوئی اس حسن کے ملبے کو خرد برد

کھا کھا کے سیمیناروں میں بریانی قورمہ
ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

چوتھا شعر فیض کے مصرعے کی عمدہ تضمین ہے۔ یوں بھی احمد علوی کو تضمین سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ اپنے طنزیہ ومزاحیہ قطعات میں اساتذہ کے مصرعوں کی تضمین کرکے اور اُن کے مصرعوں کی معنوی کیفیت تبدیل کرکے کامیاب مزاح نگاری کرتے ہیں۔ بظاہر یہ طریقہ کار آسان نظر آتا ہے مگر ایسا ہے نہیں۔ اس کے لیے اردو شاعری کی روایت سے واقفیت، اساتذہ کے اشعار کی بروقت ضرورت اور ان کے تہہ در تہہ موضوعات کی ندرت کا پارکھ ہونا ضروری ہے او راحمد علوی کے یہاں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ وہ مزاح کے اس حربے کو برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں۔

مساوی ہے چاروں پہ نظرِ عنایت
کئی مرحلے قابلِ غور بھی ہیں
ابھی ایک بیوی سے ہے ایک بچہ
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

بیوی کی قبر کو نہ بھگو آنسوؤں سے یار
سالی بھی نوجوان ہے کچھ اعتبار رکھ
ساس اور سسر کے ہاتھ میں لاکر کمائی دے
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

کل رات ڈرتے ڈرتے یہ بیگم سے کہہ دیا
کچھ دیر سیل فون کا پیچھا بھی چھوڑ دے
شوہر سے بھی ضروری ہے مانا یہ سیل فون
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پہلے دو قطعے خاص مزاحیہ ہیں جب کہ تیسرے قطعہ میں عہدِ جدید کی بظاہر نعمتوں مگر بباطن زحمتوں پر طنزیہ وار کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے تضمین کو بطور حربہ فن استعمال کیا ہے۔ تضمین کے علاوہ احمد علوی کے یہاں ''پیروڈی'' کا فن بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ پیروڈی یا بھی نہایت نازک فن ہے کہ اس میں خود شاعر ہی نہیں بلکہ وہ شاعر بھی جس کی تخلیق کی پیروڈی کی جارہی ہے، دونوں کی جان خطرے میں ہوتی ہے۔ چند الفاظ کے اُلٹ پھیر سے سنجیدہ تخلیق میں طنز ومزاح کی بجلیاں بھردینا پیروڈی کا فن ہے۔ احمد علوی نے بھی چند عمدہ اور کامیاب پیروڈیاں تخلیق کی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے طنز ومزاح کے مختلف حربوں اور موضوعات کو برتا ہے۔ ان کی مزاح نگاری شوہر و بیوی کی مضحک تعلقات ومعاملات کے اردگرد گھومتی ہے۔ چنانچہ ذیل کے قطعات میں یہ موضوعات پیروڈی کے ذریعے اور بھی دوآتشہ ہوگئے ہیں۔

بیلن کو دیکھتے ہی غائب ہوئے ہم ایسے
پایا نہ کئی ہفتے نام و نشاں ہمارا
بیگم سے پٹنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا

بڑھاپے میں ہوا جو بدگماں تیرا ہے یا میرا
اگر مجھ پر فدا ہے یہ زیاں تیرا ہے یا میرا
تنگ کر میری بیوی سے یہ فرمایا پڑوسن نے

مجھے فکرِ میاں کیوں ہو میاں تیرا ہے یا میرا

شوہر تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
تُو تو چوبیسوں گھنٹے پلتا ہے
بولا شوہر کہ اس زمانے میں
یہ بھی اعزاز کے ملتا ہے

احمد علوی کی ظریفانہ شاعری میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ خانگی مزاح کے علاوہ انھوں نے سماج کے دیگر موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور کہیں طنز کے ذریعے تو کہیں مزاح کے ذریعے سماج کی کجیوں پر گرفت لگائی ہے۔ ایک کامیاب ظرافت نگار اپنی قوتِ مشاہدہ اور باریک بینی سے عام موضوعات میں بھی تازگی اور ندرت پیدا کر دیتا ہے اور یہ صلاحیت احمد علوی میں موجود ہے۔ مہنگائی اور رہنمایانِ قوم پر طنز سے آراستہ یہ قطعات ہمارے دعویٰ کو دلیل فراہم کر رہے ہیں۔

کل ہند شاعروں کی پریشاں ہیں بیویاں
آتے ہیں خالی ہاتھ کچھ لے کر نہیں آتے
جس روز سے بے انتہا مہنگائی بڑھی ہے
اسٹیج پر اب انڈے ٹماٹر نہیں آتے

الیکشن میں نظر آتے ہیں جو گلیوں محلوں میں
الیکشن جیت کے تیرے نہ میرے درمیاں ہوں گے
اُڑن چھو اس طرح ہوں گے کہیں ڈھونڈے نہ پاؤ گے
یہ اگلے پانچ برسوں تک نشانِ بے نشاں ہوں گے

مزاح نگاری کے لیے جس بذلہ سنجی، بے ساختگی اور شوخی کی ضرورت ہوتی ہے وہ احمد علوی کے یہاں موجود ہے۔ وہ بات میں سے بات نکالنا جانتے ہیں۔ واقعات و موضوعات کی مضحکہ خیزی انھیں مزاح نگاری کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ فکرِ رسا رکھتے ہیں اور اسی لیے مزاح نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایسے برجستہ اور پُر مزاح قطعات ان کے دامن میں بے شمار ہیں۔

واسطے زلفوں کے رہتے تھے ہمیشہ فکر مند
پھر اچانک یہ ہوا زلفوں پہ اِترانے لگے
دو سگی بہنوں سے دو گنجوں کی شادی ہو گئی
اور یہ بے زلف بھی ہم زلف کہلانے لگے

عہدِ حاضر کی شاعری کی لفظیات و علامات نئی ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانے میں ان سے متعلق اصطلاحات نے بھی شاعری میں جگہ بنالی ہے۔ بطور خاص طنز و مزاحیہ شاعری میں یہ سلسلہ مضحک موضوعات کے برتنے میں معاون ثابت ہوا ہے اور ہمارے ظریف شاعر کو نئے پیرائے میں اظہارِ خیال کی آزادی دیتا ہے۔ احمد علوی کے یہاں بھی ان اصطلاحات کا استعمال بطور شعری علامت ہوا ہے۔ یہاں صرف ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

انکار ہوگا اور کبھی اقرار نیٹ پر
ہوگا سبھی حسینوں کا دیدار نیٹ پر
ہم بھی کریں گے عشق کا اظہار نیٹ پر
ہوگا جواں بڑھاپے کا یہ پیار نیٹ پر

اپنوں کو کھلے گا نہ رقیبوں کو کھلے گا
اک ساتھ عشق سات حسینوں سے چلے گا

غرض شوخی و ظرافت سے مزین احمد علوی کی طنز و مزاحیہ شاعری لق و دق صحرا میں نخلستان کی طرح ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اب طنز و مزاحیہ شاعری پر زوال کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ چند ناموں کو چھوڑ کر اس نوع کی شاعری کی طرف اب توجہ نہیں دی جارہی ہے نیز مشاعروں کی نام و نہاد ضرورتوں (مجبوریوں) کی وجہ سے بھی معیار روز بروز گرتا جارہا ہے۔ ہم نے مضمون کی ابتدا میں محمد حسن صاحب کا ایک اقتباس نقل کیا ہے کہ مسخرا پن طنز و مزاح کی شاعری کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اور یہ مسخرا پن اب عام ہوتا جارہا ہے ایسے پُر آشوب دور میں چند آوازیں ہیں جو اپنی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایسی ہی آوازوں میں احمد علوی کا بھی نام شامل ہے۔ ہم تو اُن کے لیے یہی دعا کریں گے کہ

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

جینی کروس / نوید ظفر کیانی

ہزاروں خواہشیں ایسی ---

بیشتر دیگر امریکیوں کی طرح میرا یعنی جینی اور میرے شوہر جارج کا لائف سٹائل بھی محض کھانے، سونے اور ٹی وی دیکھنے کی حد تک ہی محدود ہے۔ جونہی ہماری پشت صوفے سے لگتی ہے، ہماری توندیں کسی جیلی مچھلی کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ہم نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کچھ کیا جائے، کچھ ایسا، جس سے ہم اس دلدلی توندوں کی صورتِ حال سے چھٹکارا پا سکیں۔ اس کے لئے خاصے غور وخوص کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے اپنا "جارج اینڈ جینی ڈائٹ پلان" وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماہرینِ غذا اکثر اپنے پہلے سے گھڑے ہوئے نام نہاد "ڈائٹ پلان" کو دوسروں کی زندگیوں میں ٹھونسنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہاتھی کے ڈائٹ کا منصوبہ چیونٹی کے ڈائٹ پلان کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، لیکن ماہرینِ غذا پر جائیں تو وہ اس امر کو بھی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ہر قسم کا پلان ہر قسم کی زندگی پر تھوپا جا سکتا ہے، چنانچہ ہم نے خود انحصاری کو ہی بہتر روش جانا اور وزن گھٹانے کا شاندار منصوبہ بنا لیا جس کا ابتدائی ڈھانچہ حسبِ ذیل ہے:

"جارج اور جینی کا وزن گھٹانے کا منصوبہ"

۱۔ وزن گھٹانے کے بارے میں کتابیں خریدی جائیں اور اپنی سہولت سے اُن کو پڑھا بھی جائے۔

۲۔ غیر صحتمندانہ غذاؤں کو نکال باہر کیا جائے۔

۳۔ اُن کی جگہ غذا آور غذائیں خریدی جائیں۔

۴۔ غذا آور غذائیں کھائی جائیں۔

۵۔ یوں وزن گھٹایا جائے اور زندگی کا صحیح لطف اُٹھایا جائے۔

۶۔ کھانے سے بچت شدہ ہوئی رقوم کپڑوں کی خریداری پر لگائی جائے۔

کتابوں کی دکانوں پر متوازن غذا کے موضوع پر کتابوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ پہلے تو یہی جی میں آئی کہ "اکڑ بکڑ بمبے بھو" کا فارمولہ اپلائی کیا جائے اور کتاب کا انتخاب کیا جائے، لیکن پھر عقل

کو ہاتھ مارا تو یہی سوجھا کہ ''کلیرنس سیل'' والے ریک پر ہاتھ صاف کیا جائے کیونکہ اس ریک پر کتب ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہیں۔ کتابوں کی کتابیں اور بچت کی بچت۔ کتابوں کا انتخاب کرتے کرتے ہمارے شیطانی دماغ نے پھر پلٹا کھایا اور یہ سوالات اُٹھائے کہ:

یہ کتابیں کلیرنس سیل والے ریک پر کیوں ہیں؟

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اِن کتابوں میں جو متوازن غذا کا بیان ہے اُس نے کام نہ کیا ہو اور لوگ مزید پھیل پھول گئے ہوں۔

کیا پتہ لوگوں نے اِن کلیرنس سیل پر موجود کتب سے پرہیز کی روش اختیار کی ہو اور بہتر متوازن غذا پا گئے ہوں۔

متوازن غذا کے باب میں سستی کتابیں ''نیم حکیم، خطرہء جان'' کی مثال ہو سکتی تھیں۔ کامیاب نسخہ جات کے حصول کے لئے ہم نے پوری قیمت میں پانچ موٹی موٹی کتابیں خریدیں اور گھر کا رُخ کیا۔

اگلے چند دنوں تک ہم کتابوں کو پڑھنے کے بجائے اُن کی ورق گردانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کتابوں کے رنگین صفحات پر ایسی ایسی اشتہاء انگیز کھانوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں کہ بس دیکھتے جایئے۔ ایک تو اِن کھانوں کے نام بھی خاصے مشکل تھے۔ جانے ماہرینِ غذا اِن ناموں کو دنیا کی کس جناتی زبان سے اخذ کرتے تھے۔ جن جن غذاؤں کے ہجے کرنے میں دشواری محسوس ہوئی، اُن کو معدے کے لئے ضرر رساں خیال کرتے ہوئے نظر انداز کرنا ہی ضروری سمجھا ورنہ ہمارے معدے نے تو ان کے ہجوں کی ادائیگی کی اذیت کو ہی گیسٹک اثرات میں تبدیل کر دینا تھا۔ اِسی طرح ایسی تمام غذاؤں سے اجتناب کرنا بھی ضروری تھا جن کی تیاری میں پندرہ منٹوں سے زیادہ وقت درکار تھا۔ بھلا اِس کمپیوٹر کے عہد میں ایسی ماٹھی غذا کھا کر ہماری صحت نے کون سی ترقی کرنی تھی۔

ہم نے ایسی تمام غذاؤں کو اپنے باورچی خانے سے نکال باہر کیا جو ہمارے جسم کے غبارے میں مزید پھونکیں بھر سکتی تھیں۔ آپ بھی متجسس ہوں گے کہ ایسی کون سی غذائیں ہیں جنھیں ہم نے ''غیر صحتمندانہ'' کے زمرے میں اِس کامیابی سے ڈال دیا۔ اس معاملے میں ہمیں زیادہ ردوکد نہیں کرنا پڑا کیونکہ ایسی غذاؤں کے استعمال کا ہمارا خاصا وسیع تجربہ تھا جن کے استعمال سے ہمارے چند ڈائٹ فوبیا میں مبتلا دوست مدتوں سے روکتے رہے ہیں۔ مثلاً سنیکس، میٹھی اشیاء اور وہ تمام اشیاء جو ذائقے کے اعتبار سے بے مثال ہوتی ہیں اور جنھیں کھانے کی طرف یہ بے ایمان دل بے ساختہ راغب ہو جاتا ہے۔ خصوصاً رات کے کھانے کے بعد جب تھوڑی بہت فراغت نصیب ہو تو ایسی چیزیں ازخود اُڑ کر منہ کی طرف لپکتی ہیں۔ چلو اب چھٹی ہوئی، نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بنسری۔

اب ہم نے اپنے ریفریجریٹر سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس مہم میں ہم نے دو بڑے کوڑے والے شاپر بیگ بھر ڈالے جو ہم نے اپنے بیٹے کوری کو عطیہ کر دیے جو ایسی غیر صحتمندانہ غذاؤں پر مرتا تھا۔ ویسے اُس کے باریک جسم کو ایسی غذا کی فوری ضرورت تھی بھی کیونکہ اُس کی ہڈی پر ماس نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی، ہاں البتہ یوں لگتا تھا جیسے تھوڑی بہت ماس بوٹی کہیں مانگ تانگ کر جسم پر منڈھ رکھی ہو۔ اب ہمارے پاس جو پارچہ جات رہ گئے تھے اُن کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

''صحتمندانہ غذا کے پارچہ جات''

چند تازہ گاجریں

نازک اندام سرخ مرچیں

پیاز

انڈے

گرینی سمتھ والوں کے معصوم صورت سیب

سیاستدانوں جیسے کیلے

اور پانی

اب ظاہر ہے کہ ہمیں ریفریجریٹر کے خلا کو متوازن اور صحتمندانہ غذاؤں سے پُر کرنا تھا کیونکہ ہم بہتر اور صحتمندانہ زندگی کے حصول کے پاکیزہ مشن پر تھے اور مجاہدانہ پیش قدمی کیے جا رہے

ہمیں استاد لاغر مراد آبادی کا ایک قولِ برحق یاد آ رہا ہے، فرماتے ہیں "یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیئے اُنہیں انعامات ملتے ہیں۔

خامہ بگوش از مشفق خواجہ

تھے۔ مقامی ڈیپارٹمینٹل سٹور پر اشیاء کی خریداری شروع ہوگئی۔ جارج نے ڈبل روٹی کا ایک بڑا سا پیکٹ خریداری والی ٹوکری میں ڈالا۔

"یہ تو صحت بخش غذا نہیں!" میں نے معترض ہوکر کہا۔

جارج غالباً کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا اور سٹور سے ساری کی ساری خریداری اگلے پانچ منٹوں میں ختم کرنا چاہتا تھا۔

"یہ صحت بخش غذا ہے، دیکھ لو، یہ لکھا ہوا ہے۔۔۔" اُس نے ڈبل روٹی کے ریپر کی طرف اشارہ کیا۔ واقعی وہاں واضح لفظوں میں "صحت بخش غذا" کی تحریر موجود تھی۔

"اِس میں تو گندم اور میدہ ہوتا ہے جو جسم کو موٹا کرتا ہے" میں نے کہا۔

اب میں نے ایک نسبتاً فربہ (قریباً پندرہ پونڈ والی) لیکن محفوظ ڈبل روٹی کا انتخاب کیا جس پر "ڈائٹ" کے الفاظ نمایاں طور پر کندہ تھے، جو ہمارے وزن گھٹانے کے مشن کو آسودگی فراہم کرنے کے لئے کافی تھے۔ میں نے جونہی اُسے خریداری والی ٹوکری میں ڈالا، اُس نے پہلے سے ڈالے گئے میٹھے میٹھے انگوروں پر اپنا وزن ڈالا اور اُنہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

"اب ذرا دلیے کا پیکٹ ہو جائے۔" جارج نے کہا۔

وہ اپنی مردانہ لا اُبالی روش سے اُس ریک کی طرف بڑھا جہاں مختلف کمپنیوں کے سیریل کے پیکٹ سجائے گئے تھے۔ میں نے اُس کے ساتھ قدم سے قدم ملانے کی ترقی پذیرانہ کوشش کی لیکن میں چونکہ خریداری والی ٹوکری کو بھی گھسیٹ رہی تھی اور اُس کا وزن ڈبل روٹی کے اضافے کی وجہ سے خاصا بڑھ چکا تھا (لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے وزن سے زیادہ نہیں) اِس لئے ہزار کوششوں کے باوجود بھی من حیث العورت بھی اُس کو نہ پکڑ سکی۔ یوں بھی ڈبل روٹی کے وزن نے ٹوکری کو پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا، بلکہ اُس کا ایک ٹائر تو احتجاجاً ٹیڑھا میڑھا ہوکر چل رہا تھا۔

جارج نے ریک کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا اور ایک پیکٹ کا انتخاب کیا۔۔۔ "یہ ہے ایک متوازن اور صحت افزا غذا کا جزوِ لاینفک!"

"جارج! تم نے اس کے اجزا پڑھے ہیں" میں نے معترض ہوکر کہا "اس کے چودہ اجزا میں چینی کا ایک بڑا عنصر بھی شامل ہے، اس کے اندر تو اتنی مٹھاس بھری ہوئی ہے جو ایک سفری غبارے کو بھی پھلا دینے کے لئے کافی ہے، سوچو تو ہمارا کیا حال کرے گی!"

"اچھا؟" جارج نے کمزور پڑتے ہوئے کہا "لیکن اس پر تو لکھا ہے کہ یہ صحت بخش غذا کا جزوِ لاینفک ہے!"

"صحت سے کمپنی والوں کی مراد غالباً ٹیکسی کو ٹرالا بنا دینے والا عمل ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ غیر صحت بخش غذا کا جزوِ لاینفک اجزا پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں از خود صحت افزا غذا والی غذا درکار ہوگی تا کہ اس کے مضر اثرات کو زائل کیا جا سکے، بالکل اُسی طرح جیسے دواؤں کے خمیازے کو بھگتنے کے لئے مزید دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"تو اب تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ میں کیا کروں؟" جارج نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم پھلوں اور سبزیوں کے انتخاب میں میری مدد کرو۔" میں نے باربی کی طرح لہجے میں ٹنوں کے حساب سے شیرینی گھولتے ہوئے کہا۔

یہی وہ حربہ تھا جس کو استعمال کر کے میں نے جارج جیسے ترکھے بندے کو اگلے دس سے پندرہ منٹوں تک مصروف رکھا لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنی تیز روی کی سرشت سے یکسر تائب ہوگیا ہے۔ محض چار منٹوں کے قلیل عرصے میں وہ پالک، گوبھی، اروی، آلوؤں، ٹماٹروں، گاجروں اور تین عدد گنے کے ستوں سے لدا پھندا بر آمد ہوا۔

"یہ گنا کس کے لئے ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس میں فائبر ہوتا ہے جو صحت کے لئے بہت ضروری ہے،

اور غالباً نظامِ انہضام کو درست رکھنے میں بھی معاون ہوتا ہے۔''
جارج نے گویا میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
ہم نے خریداری پر دوسو پونڈ کی خطیر رقم خرچ کردی۔ پچاس ڈالروا گزار بھی ہو سکتے تھے لیکن اس کا انحصار اس امر پر تھا کہ میں صحت مند ہوتی اور میری یادداشت میرا ساتھ دیتی تو میں ممبر شپ والا کارڈ ساتھ لاتی اور رعایت کی مستحق ٹھہرائی جاتی۔
ہم دونوں گھر پہنچے اور تمام اشیاء کو سلیقے سے اُن کی متعلقہ جگہوں پر سجا دیا۔
جب کچھ آرام سے بیٹھ لئے تو میں نے کہا ''اب ہمیں ٹنوں کے حساب سے پانی پینا ہوگا، اسی سے ہماری توندوں کو اپنے صحیح مقام پر پہنچنے میں مدد ملے گی۔''
''لیکن مجھے پانی بالکل بھی پسند نہیں۔'' جارج نے اعتراض کیا۔
''پسند نہیں، کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی سے کہا ''پانی کا تو کوئی ذائقہ ہوتا ہی نہیں۔''
''یہ میرے حلق میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔'' جارج نے کہا۔
''مذاق مت کرو جارج، بھلا ایسی شے جس کا نہ کوئی ذائقہ ہو اور نہ اُس میں کوئی ایسا کثیف جزو ہو جسے نگلنے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے، وہ بھلا حلق میں کیسے پھنس سکتی ہے، تمھاری بات کچھ پلے نہیں پڑی۔''
دو ہفتوں تک تو ہم دونوں پوری شد و مد کے ساتھ متوازن غذاؤں کے نسخہ جات پر عمل پیرا رہے۔ میں دوپہر کا کھانا گول کر جاتی تھی، کلی طور پر سادہ غذاؤں پر انحصار کرتی رہی۔ میٹھے اور ایسے کاربوہائڈریڈز سے یکسر پرہیز کرتی رہی جس سے میری صحت کو کسی قسم کی بدگمانی لاحق ہو پاتی، مثلاً کوکیز، کیک اور کسٹرڈ اور دوسری ایسی میٹھے کی چیزوں سے مکمل طور پر اغماض برتا، پہلے جس سے چشم پوشی کو ہی گناہِ کبیرہ سمجھتی تھی۔
پھر ایک دن ایسا بھی آیا، غالباً تیرہ مارچ کا دن تھا، جب مجھے احساس ہوا کہ ہمارا ''جارج اینڈ جینی منصوبہ'' اب ہم میں نہیں رہا۔ پتہ نہیں کیوں؟
ہم دونوں میں اس سلسلے میں سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی۔
میں نے کہا ''جارج، اس سے تو کام نہیں چلا!''
''کس سے؟'' جارج نے پوچھا۔
میں نے جارج کی طرف شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ وہ مرحوم کو اتنی جلد بھول جائے گا۔ ''ہم لوگ پھر سے الا بلا کھا رہے ہیں۔ میری پتلونیں کولہے اور کمر سے نبرد آزما ہیں۔ قمیصیں جسم کے گوشت میں دھنستی جا رہی ہیں۔ خود تمھاری توند بھی مزید لڑھک چلی ہے۔''
''اوہ اچھا یہ۔۔۔'' جارج نے اپنی توند پر نظر ڈالتے ہوئے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔
مختصر یہ کہ اب میں پچاس کے پیٹے میں ہوں لیکن زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی۔ مجھے اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے خاصی جدوجہد کرنی چاہیئے تھی، خوب ورزش کرنی چاہیئے تھی لیکن ایسا نہیں ہو پا رہا۔ میرے کپڑوں اور دواؤں کا حجم بڑھتا جا رہا ہے اور اب مجھے یہ فکر ستائے جا رہی ہے کہ پچاس کے پیٹے میں یہ حال ہے تو جب میری عمر کا ساٹھواں برس شروع ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔

پرہیزی کھانا؟ نہیں اس سے بھی کام نہیں چلا! پرہیزی کھانا تو میں ہر کھانے کے بعد متواتر کھاتی رہی ہوں!!

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ناک، کان، گلا

اگرچہ انسانی چہرے پہ ناک کان اور گلا الگ الگ اعضاء ہیں مگر ان کا اندرونی باہمی تعلق، انہیں ایک ہی اسپیشلسٹ کے سایہ عاطفت میں رہنے کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔اس تعلق کو ڈاکٹر مظہر عباس نے اپنی اس نظم میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

تھری اِن ون

کیجئے کیسے جسم و جان الگ
کر نہیں سکتے ناک کان الگ
لفظ کچھ اِس طرح سے بل کھائے
کان اُلٹائیں ناک بن جائے
اور ان سے نہیں الگ ہے گلا
اس لئے کردیا انہیں یک جا
ہے مقام ان کا اعلیٰ و ارفع
یہ ٹریفک ہے بھائی سہ طرفہ
ہیں جراثیم ایک جیسے یہاں
تینوں اطراف بس یہی ہیں رواں
ہو گلے کا مرض کسی کو اگر
ناک اور کان میں بھی پھیلے شر
''سوزشِ ناک'' سے جو ہوں چھینکیں
حلق سے بھی نکلتی ہیں چیخیں
دونوں اپنی جگہ پہ ہوں بے کل
ناک ہو بند، کان ہو جل تھل
''ٹانسل'' میں اگر ہو ''انفیکشن''
پھیلے یہ ناک، کان میں فوراً
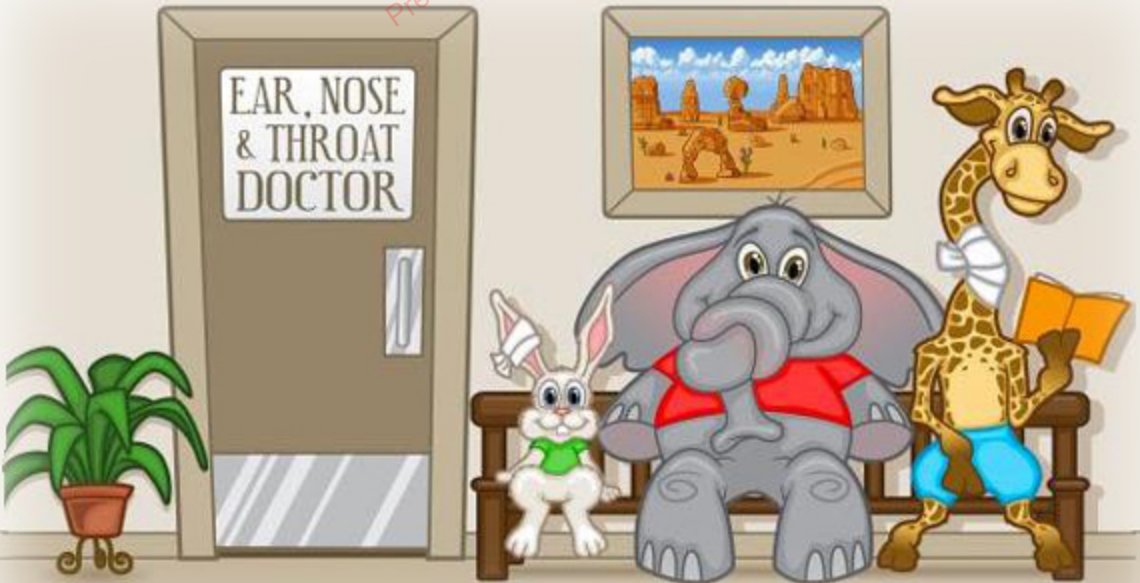
ہے بنی اس طرح کی صورتِ حال
تینوں اعضاء کا ایک ہی ہے مآل
ہوں بہم مبتلائے بیماری
تینوں اعضاء میں ہے بہت یاری
بولے اسپیشلسٹِ ''ای۔این۔ٹی''
ہے سراسر ہمیں خسارا ہی
بل الگ ان کا دے نہیں سکتے
فیس بھی پوری لے نہیں سکتے
ایک نسخہ کرے انہیں اچھا
اِک دوا ہے علاج تینوں کا
ایک میں تین کا اُٹھائیں مزا
سب مریضانِ ناک ، کان ، گلا

ناک

سید محمد جعفری نے اپنی اک نظم میں ناک کے بارے میں کہا تھا

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں

اگر چہ شعبۂ طب میں ناک کی ساخت اور اس کے افعال و امراض پر ہزاروں کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں مگر شاعرانِ کرام اپنے اپنے طریقے سے ناک کی ناک پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جناب انور مسعود ناک کے جغرافیے پہ اس طرح رقم طراز ہیں۔

چہرے کو یہ دو حصوں میں کر دیتی ہے تقسیم
یہ ناک نہیں ہے خطِ تنصیف ہے بلکہ

ناک، زکام اور فلو

ناک کے امراض میں نزلہ اور فلو اس قدر عام ہیں کہ موسم سرما آیا اور اکثر بچے بوڑھے اور جوان اس مرض کا شکار ہوئے۔

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے کیا سمجھے
اسی سے آپ کو نزلہ ہوا ہے کیا سمجھے

عنایت علی خان

سکوں سے بیٹھ کے کیا ہم سے گفتگو کرتے
وہ ناک پونچھتے آئے فلو فلو کرتے

چونچال سیالکوٹی

فلو کے اثرات کو عاشقِ نامراد کی ہیئت کذائی سے جوڑتے ہوئے معروف مزاحیہ شاعر جناب سرفراز شاہد فرماتے ہیں۔

شکستہ جسم تھا اور دردِ سر بھی
رواں آنکھوں سے بھی اک سیلِ بُو تھا
میں آغازِ محبت جس کو سمجھا
حقیقت میں وہ آغازِ فلو تھا

فلو نے جو انفلوئنزا وائرس کا شاخسانہ ہے اکبرالہ آبادی کو بھی نہیں بخشا۔

انفلوئنزا چڑھا ہے چوگاں بازی اب کہاں
اسپتالی ہو رہے ہیں اسپ بازی اب کہاں
چارے کی قلت ہوئی تو بیل بھی مرنے لگے
انفلوئنزا جب ہوا تو نیل بھی مرنے لگے

ہدایت اللہ ناظر ٹونکی اپنی ''مرض بیتی'' کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وید جی نے نبض پکڑی اور کہا کیا حال ہے
عرض کی میں نے کہ سارے جسم میں بھونچال ہے
حلق سوکھا جائے ہے اور دل گھمیری کھائے ہے
ہائے ظالم انفلوئنزا کیوں مجھے تڑپائے ہے
جسم پر ہر دم پسینہ جیسے ساون کی پھوار
بجلیاں ہی سر میں چمکیں سینہ گرجے بار بار
دل تو گھونٹے کھائے ہے کھانسی ملہار گائے ہے
کالی مرچیں سونٹھ پیپل اور منقی سوختہ
داب دینا گودڑی سے تا پسینہ دیں بہا
ہائے اللہ مار ڈالا جان نکلی جائے ہے
ڈاکٹر نے فیس لی اور ڈٹ کے میرے روبرو
بولا کچھ اس طرح What can I do sir for you
میں نے ڈر کر یہ کہا بیگم یہ کیوں بڑائے ہے

جدید ترین دور کے متعدد مزاح نگاروں نے نزلہ زکام اور فلو پر قلمی موشگافیاں کی ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

بہہ رہی ہے رات بھر سے ناک، سر میں درد ہے
اور کچھ سنتے نہیں ہیں کان باقی خیر ہے

سید فہیم الدین

وزارت میں اس کو فلو ہوگیا تو
وہ سرکاری خرچے پہ امریکہ جاسی

شاہدہ ناز

کچھ تو سبب ہے جو مجھے آتی ہے چھینک رات دن
رہتے ہیں آپ ہر گھڑی شائد مرے خیال میں

شوکت جمال

اور ڈاکٹر مظہر عباس رضوی نے تو اس مرض پر "زکامی غزل" کے عنوان سے بالکل نئے انداز میں مضحک صورت حال کا ذکر کیا ہے، اپنی کتاب ہسپتالی شاعری میں لکھتے ہیں "شدید نزلہ زکام میں ایک دن غزل پڑھنے لگے تو کچھ اس قسم کی صورتحال بن گئی۔"

دل فدا ہے ترے رخسارِ حسیں پر، "آچھیں!"
یاد کرتا ہوں تجھے چھینک کے دلبر، "آچھیں!"
تشنگی روح کی بجھ جائے گی آجاؤ صنم
جوشِ جذبات سے لبریز ہے ساغر، "آچھیں!"
آنکھ ہی تر نہیں میری، تری یادوں کے طفیل
ناک بھی گریہ کناں اب ہے برابر، "آچھیں!"
تو سمجھتا ہے کہ آئی ہے یہ برکھا کی پھوار
بے خبر دیکھ یہ کچھ اور ہے منہ پر، "آچھیں!"
جب بھی چاہا کہ کروں بات میں دل کی تجھ سے
آیا بے ساختہ اُس دم مرے لب پر، "آچھیں!"
ایک رومال پہ ہے سینکڑوں چھینکوں کا وصال
دے ٹشو مجھ کو بہت سے مرے دلبر، "آچھیں!"
پھول مہکیں نہ کہیں غنچے کھلیں اب کی بہار
ورنہ ہم کرتے رہیں گے یہاں دن بھر "آچھیں!"

ہم تو آئے تھے دبے پاؤں تری محفل میں
چھینک نے آکے بپا کردیا محشر، "آچھیں!"
صرف مطلع ہی سمجھ میں ہمیں آیا ان کا
ورنہ ہر شعر پہ کرتے تھے سخنور، "آچھیں!"
ڈر قیامت سے بھی اُس کو نہ لگے گا مظہر
دیکھ لے جو کوئی اس چھینک کا منظر، "آچھیں!"

کینسر

جناب عنائت علی خان صاحب کے والد جناب ناظر ٹونکی آخری عمر میں ناک کے کینسر کا شکار ہوگئے اور بالآخر اسی مرض میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی مگر درج ذیل شعر میں اس مرض کی خطرناکی کے باوجود ناظر صاحب نے ظرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ناک کے زخم سے ہے ناک میں دم ناظر کا
خوبصورت تھی کبھی اب ہے خطرناک یہ ناک

نکسیر

ناک سے خون کا جاری ہوجانا ایک عام سی بیماری ہے۔ اگرچہ اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں مگر نکسیر کی اس قدر شاعرانہ و ظریفانہ وجہ ڈاکٹر حضرات کی تشخیص میں نہیں آسکتی۔ مشہور مزاحیہ شاعر جناب ظریف لکھنوی کے بقول

شمیم زلف مشکیں سونگھ کر نکسیر پھوٹی ہے
ترے بالوں کی بو سے ناک میں آیا ہے دم میرا

کان

کان وہ عضو سماعت ہے کہ جس سے دنیائے حرف و صوت میں ساز و آواز کے جلترنگ سنے جاتے ہیں۔ لیکن شاعرانِ ظرافت انسان کے علاوہ بھی کان کی کان دریافت کرلیتے ہیں

ایسے دیوار کے بھی کیا ہوں گے
جیسے ہمسایہ کان رکھتا ہے

نذیر احمد شیخ

ہے شب وصل بولو آہستہ

چارپائی بھی کان رکھتی ہے

جگت موہن

جب کہ انور مسعود غوغائے دہر سے بہت پریشان نظر آتے ہیں۔

چاروں طرف ہیں گوش خراشی کے سلسلے
اک شور آٹھ پہر ہے اور ہم ہیں دوستو
کس امتحان میں ہے سماعت نہ پوچھئے
غوغائے بزمِ دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

کان کی ساخت

بہت کم حضرات کو شائد معلوم ہو کہ درمیانی کان کے حصے میں تین باریک ہڈیاں ہوتی ہیں جنہیں ossicles کہتے ہیں۔ ظریف ڈاکٹر شاعر مظہر عباس اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اُستخواں ہیں بدن میں ہر جانب
گوشِ خانہ خراب میں ہڈی

اور جناب امیر الاسلام ہاشمی کان کے پردے کا ذکر چھیڑتے ہیں تو انہیں کچھ اور بھی یاد آ جاتا ہے۔

کان مت دھرنا کہیں ذکر جو پردے کا چھڑے
ورنہ جو باقی ہے وہ بھی نہ رہے گا باقی
نام تک پردے کا سننے کو ترس جاؤ گے
کم سے کم ہے تو ابھی کان کا پردہ باقی

کان کا درد

یہ تجھے چین کیوں نہیں پڑتا
درد زیادہ ہے تیرے کان میں کیا

سید فہیم الدین

بہرہ پن

ثقلِ سماعت کی بیماری صرف مریض کو ہی متاثر نہیں کرتی بلکہ اکثر پورے خاندان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ معاشرتی رویئے مریض اور اس کے لواحقین کے لئے اکثر شدید پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ مزاحیہ شعراء اس مشکل صورت حال میں بھی تفنن طبع کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ مثلاً دو بہرے شناساؤں کی ملاقات کا احوال دیکھئے۔ جناب ضمیر جعفری فرماتے ہیں۔

اُس نے کہا آداب کرتا ہوں کہو کیا حال ہے
اِس نے کہا ٹھیلے ہیں دو رومال ہیں، اک تھال ہے
اُس نے کہا بیمار ہے بیگم گزشتہ رات سے
اِس نے کہا اچھی کہی دل خوش ہوا اس بات سے

ایک موضوع پہ اگر بہت سے لوگ لکھیں تو کبھی کبھی ایک ہی طرح کی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ تضمینی اشعار میں اس کا امکان زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نقل ہی ہو۔ البتہ شعری زبان میں اسے توارد کہا جاتا ہے جس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے

آپ بہرے ہیں تو ہم ہوں آپ سے کیا بہرہ مند
''ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا''

عاصی اختر

کچھ مداوا کیجئے بہرے پن کا آکر تا یہ کہہ
'ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا'

عظیم عباسی

پچھلے زمانے میں کہ جب مشاعرے صرف شعراء پر ہی مشتمل نہیں ہوتے تھے اور سامعین بھی اس میں شرکت فرمالیتے تھے، داد دینے کے مختلف طریقے اپنائے جاتے تھے۔ داد و تحسین، واہ واہ، کیا کہنے، سبحان اللہ، اجی کیا بات ہے، کیا نکتہ آرائی ہے، کیا عمدہ خیال باندھا ہے، سے بڑھتے بڑھتے وارفتگی میں یوں تبدیل ہو جاتی کہ ہائے ہائے مارڈالا، واللہ گھائل کر دیا جیسے خطرناک جملے بھی سننے میں آجاتے تھے۔ شاعر کی حوصلہ افزائی کے لئے مکرر، یا دوبارہ ارشاد فرمائیں بہت عام سا جملہ بن گیا تھا۔ انور مسعود کی طبیعت کی شوخی نے مکرر اور دوبارہ کے ملاپ سے ایک نئے لفظ دوبرّ کو جنم دیا۔ مکرر کے بارے میں ایک سچا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مشاعرے کی صدارت کوئی فوجی جرنیل صاحب فرمارہے تھے انہیں مکرر مکرر سمجھ نہ آیا۔ وضاحت پر صاحب صدر نے مائیک سنبھالا اور جرنیلی حکم دیتے ہوئے بولے کہ آپ لوگ ایک ہی بار توجہ سے تمام اشعار سنیں۔ یہ شعرا آپ کے باپ کے نوکر نہیں

ہیں کہ بار بار آپ کو ایک ہی شعر سناتے رہیں۔

دوبارہ وہی بات کیوں پوچھتے ہو
اگر تم کو ثقلِ سماعت نہیں ہے

جوش ملیسانی

ثقلِ سماعت کے فوائد کوئی عاشق ہی سوچ سکتا ہے۔عظیم عباسی اور ڈاکٹر مظہر عباس اس بارے میں کہتے ہیں

مرا ثقلِ سماعت پردہ دارِ رازِ الفت ہے
وہ محفل میں بھی مجھ سے بات کرتے ہیں اشاروں میں

عظیم عباسی

بیوی مجھ پر چیختی ہے تم تو کچھ سنتے نہیں
میں ہوں بہرا یا فقط بیوی کا یہ الزام ہے
ڈاکٹر سن کر یہ بولے کیجیے شکرِ خدا
آپ پر اللہ کا یہ تو بڑا انعام ہے

ڈاکٹر مظہر عباس

ثقل سماعت کا علاج آلۂ سماعت سے ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس مشکل سے نجات پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، مگر ڈاکٹر مظہر عباس اس آلے کی اور بہت سی خوبیاں بھی جانتے ہیں۔

کیجیے جب چاہیں ہر آوازِ ناہنجار بند
اب سماعت پر ہے صاحب آپ کو کل اختیار
اک سوئچ کے فاصلے پر یہ سہولت پیش ہے
تنگ کر سکتی نہیں بیگم کی اب ''چیخ و پکار''

گلا

گلا انسان کا ہو یا قمیص کا کبھی کبھار یوں باعث مصیبت بھی بن جاتا ہے۔بقول ڈاکٹر مظہر عباس۔

پکڑ کر لے گئے تھانے میں اس کو کچھ پولس والے
کہا درزی نے جب کاٹا گلا تھا میں نے صاحب کا
ہوئی چھترول درزی کی، بڑھی تفتیش کچھ آگے
تو صاحب کے بجائے اُن کے کُرتے کا گلا نکلا

بچوں کو گلے سے یہی گلہ ہے اور گلے کی سب سے بڑی خرابی بھی یہی ہے کہ وہ اکثر ذرا سی کام و دہن کی لغزش سے خراب ہو جاتا ہے۔گالی کی تخلیق ذہن میں ہوتی ہے اور زبان کے ذریعے گلے یا حلق سے نکلتی ہے۔موسیقی کے کومل سُر جب بے خود کرتے ہیں تو نغمہ و آہنگ کی جوت یہیں پہ جلتی ہے۔درد جب حد سے سوا ہو جائے تو آہ و کراہ یہیں پہ ہاتھ ملتی ہے۔غرض حلق آوازوں کی آماجگاہ ہے۔ ہر قسم کا صوت و آہنگ زخرے سے جنم لیتا ہوا حلق سے ہی برآمد ہوتا ہے۔خراٹے سونے میں بولنے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔کہ ثانی الذکر کیفیت کچھ دیر وقوع پذیر ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے مگر خراٹے ہیں کہ مسلسل سمع خراشی کا باعث بنتے رہتے ہیں۔اور پھر اگر یہ خراٹے شب وصل اپنا رنگ دکھانے لگیں تو بے بسی دیدنی ہوتی ہے۔شاعرِ خوش فکر نذیر احمد شیخ اس منظر کو یوں احاطۂ نظم میں لاتے ہیں۔

عجب صورت ہے ٹوٹے ہیں شبِ ہجراں کے سناٹے
محبت جاگتی ہے اور صنم بھرتا ہے خراٹے
جوانی کی سُلگتی رات کوئی کس طرح کاٹے
کہاں تک آدمی سوئی ہوئی قسمت کا منہ چاٹے
کبھی نتھنوں میں چڑیا چہچہاتی اور پھڑکتی ہے
کبھی بادل گرجتا ہے کہیں بجلی کڑکتی ہے
ابھی سیٹی بجی تھی لیجیے گاڑی کھڑکتی ہے
ذرا چھیڑو تو پھر یہ آگ تیزی سے بھڑکتی ہے
قیامت ہیں بھری برسات کی بھیگی ہوئی راتیں
یہاں پہ حسن کا عالم کہیں سر ہے کہیں لاتیں
بچارا ناک ہی کرتا ہے ہم سے پیار کی باتیں
برستی ہوں کسی پتھر زمیں پر جیسے برساتیں

ڈاکٹر جہاں مرض کی تشخیص کرتا ہے وہیں اس کے علاج کی تلاش میں بھی کوشاں رہتا ہے۔جدید سائنسی تحقیق پر جب شاعر ظریف جناب دلاور فگار کی نظر پڑی تو ان کو ایک اور تشویش لاحق ہوگئی۔

روس خراٹوں کا رستہ روکتا تو ہے مگر
رخ بدل کر ہوگیا خارج یہ خراٹا تو پھر

زبان

لذتِ کام و دہن ہو یا آوازِ ساز و سخن، زبان ہر جگہ اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ بقول جوشؔ ملیح آبادی

لب ہلے تو کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
فکرِ انساں کو سواری مل گئی آواز کی

مگر غالب کے شکوہ کو ڈاکٹر مظہر عباس بہ زبانِ مریض اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تھرمامیٹر سے بند کر کے منہ
نسخہ لکھنے کی یہ ادا کیا ہے
''ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے''

زبان رواں ہو تو اس کی سبک خیزیاں اور جولانیاں اپنے جوبن پہ ہوتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی اس میں لڑکھڑاہٹ آ جائے یا تلفظ اپنا اصل برقرار نہ رکھ سکے تو توتلاپن اور ہکلاہٹ مریض اور سامع دونوں کے لئے بہ یک وقت باعث پریشانی ہو جاتی ہیں۔

توتلاہٹ

ان کا دل جیتا ہے ہم نے تو زباں کے زور پر
چلبلا انداز ان کو بھا گیا ، اچھا لگا
ناز تتلاہٹ پہ بتلاؤ ہمیں کیونکر نہ ہو
لڑکیاں کہتی ہیں تیرا بولنا اچھا لگا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہکلاہٹ

ہماری نظروں سے دو شعرا کی ہکلی غزلیں گزری ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

رَ رَ ریڈیو سے جَ جنگ کی خَ خبر سَن کے مگن نہ ہو
صَ صفیر طائرِ خوشنوا نَ نفیر زاغ و زغن نہ ہو
مَ مجھ میں اور تَ تجھ میں جو رَ ربط اور ضَ ضبط ہے
بَ بلبل اور گَ گل میں بھی مَ میانہءِ چَ چمن نہ ہو
نَ نامہ بر شَ شوخ میں مَ مجھ سے ہے پَ پوچھتا
کَ کمر تو ان کی دَ ہے نہیں کہ کیا کروں جو دہن نہ ہو

حَ حقیقت مَ منتظر لَ لباس میں مَ مجاز کے
جَ جدید طرز کا شعر ہے کَ کوئی صنف سخن نہ ہو
رَ رقیب روسیاہ بزم سے نَ نکل گیا تو رَ رو پڑا
مَ مزا تو جب ہے پَ پٹ کے بھی مَ ماتھے پر شَ شکن نہ ہو
نہ نہ جائے رَ رقیب کے گھَ گھر خدا کے وَ واسطے
رَ رفیق اس کو نہ جانئے جو مَ مجھ سا نیک چلن نہ ہو
شَ شیخ شہر کو کیا کہوں سَ سمجھ لیں آپ بَ بس یہی
مَ مقبروں کا ہو پاسباں کَ کسی لحد میں کفن نہ ہو

سید محمد جعفری

کَ کیا گلہ زَ زندگی جو صعوبتوں کا سفر ہوئی
غَ غم نہیں تہہ آسماں جَ جس طرح بھی بسر ہوئی
دَ دردناک غضب کی تھی دَ داستانِ الم مری
کَ کوئی بھی تو نہ تھا وہاں جَ جس کی آنکھ نہ تر ہوئی
چَ چپکے چپکے چلا کیا چَ چشم ناز سے سلسلہ
نہ کسی کو بھی کسی بات کی کَ کانوں کان خبر ہوئی
رَ روشنی بھی ذرا ذرا تَ تیرگی بھی ذرا ذرا
کَ کچھ بھی مجھ کو خبر نہیں شَ شام ہے کہ سحر ہوئی
ہے نمود فصلِ بہار کی جَ جا بجا مَ مختلف
لَ لال چہرۂ گل ہوا سَ سبز شاخ شجر ہوئی
غَ غیر کو بھی وہی ملا جو ترا نصیب تھا انورا
یَ یار کی نظر کرم نہ ادھر ہوئی نہ ادھر ہوئی

انور مسعود

اسپیچ تھیراپی

تتلاہٹ اور ہکلاہٹ جیسے امراض کے لئے زبان کی ورزشیں کرائی جاتی ہیں اور اس عمل کو اسپیچ تھراپی کہا جاتا ہے۔

چلائے بچہ جو ہم سے زباں تو ہم ڈانٹیں
کہ اچھا لگتا نہیں اُس کا گڑبڑی کرنا
زباں چلانے کی دیتے ہیں تربیت وہ یہاں
اور اِس کو کہتے ہیں اسپیچ تھیراپی کرنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شوکت جمال

پڑا ڈاکا گلی میں دن دیہاڑے
پولس والے مگر آئے نہ آڑے

اکڑتا ہے عدو شہ پر تمہاری
وگرنہ وہ ہمارا کیا بگاڑے

تمہیں وہ دن بھی یاد آتے تو ہونگے
رٹا کرتے تھے جب ہم تم پہاڑے

"پروموٹر" ہوئے ٹی وی کے "اینکر"
کریں برپا سیاست کے اکھاڑے

یہ طے ہے ہم نہ چھوڑیں گے ترا در
رگیدے "خان" ہم کو یا پچھاڑے

لکھا کرتے تھے جن پر نام عاشق
حکومت نے شجر وہ سب اکھاڑے

رہے دنیا میں تم شوکتؔ مگر یوں
بنائے کام کم، زیادہ بگاڑے

منیر انورؔ

مزاجاً جب کریلا ہو گیا ہے
ترا شاعر اکیلا ہو گیا ہے

خلائی شاعری اک مہ جبیں کی
جھمیلے پر جھمیلا ہو گیا ہے

مقدر سے ملی جو ایک بیوی
مرے گھر میں بھی میلہ ہو گیا ہے

یہی دل تھا کبھی اخروٹ جیسا
تجھے پا کر جو کیلا ہو گیا ہے

تری میں میں بتاتی ہے کہ تو بھی
کسی لیلیٰ کا "لیلا" ہو گیا ہے

تمہارا نام آیا تھا زباں پر
مرے اطراف میلہ ہو گیا ہے

تمہارے دل میں رونق ہے تو کیا غم
ہمارا دل بھی "بیلا" ہو گیا ہے

نہ پوچھو کاروبارِ زیست انورؔ
جو تھا اسٹور، ٹھیلہ ہو گیا ہے

احمد علوی

سنا جاتا ہے قاری صاب سے قرآن ٹی وی پر
ترو تازہ ہوا کرتا ہے اب ایمان ٹی وی پر

مراتب بڑھ گئے ہیں ان کے بیگم کی نگاہوں میں
نظر آنے لگے ہیں مولوی منان ٹی وی پر

تلاش چاند کرتے تھے کبھی ہم آسمانوں میں
مگر ہوتا ہے اب تو عید کا اعلان ٹی وی پر

طوائف زادیوں کے دوستو کوٹھے ہوئے سونے
غزل پر رقص فرماتی ہیں صاحب جان ٹی وی پر

بڑا ہے جانور پردہ بہت چھوٹا ہے ٹی وی کا
بتائیں اونٹ کو کیسے کریں قربان ٹی وی پر

بلاوے آئیں گے ان کو یقیناً ساری دنیا سے
مسلمانی اگر کرنے لگیں سلمان ٹی وی پر

سکوں سے نیند بھر کے سو رہا ہے دوستو اب تو
بھروسہ کر رہا ہے کس قدر شیطان ٹی وی پر

عتیق الرحمٰن صفی

پہلے پیار کی پہلی باتیں یاد دلانے آیا ہوں
ڈنڈے سوٹے مکّے لاتیں یاد دلانے آیا ہوں

جہاں پہ ہم تم ملتے تھے وہ سارے منظر بدل گئے
ڈُڈّو چھپڑ اور برساتیں یاد دلانے آیا ہوں

یاد ہے نا ہم رات گئے تک باندر کلا کھیلتے تھے
جوتے پڑنے والی راتیں یاد دلانے آیا ہوں

اِک دوجے پر سبقت کتنی بے معنی سی ہوتی تھی
بچی جھوٹی جیتیں ماتیں یاد دلانے آیا ہوں

شہر میں آ کر بھول گئے جو اپنے سارے رشتوں کو
اُن کو اُن کی اصلی ذاتیں یاد دلانے آیا ہوں

ڈاکٹر عزیز فیصل

چالبازوں نے چالبازی کی
حبِ منصب شکم نوازی کی

ایک باذوق صاحبِ دل نے
عمر بھر شاعرات سازی کی

اس نے بیوی کے منہ پہ مجبوراً
مہ جبینوں سے بے نیازی کی

کیس میں ایکڑوں زمین کی بھی
بات تھی چند فٹ اراضی کی

کس نے بیٹے کو عشق سے روکا؟
دے کے اپنی مثال ماضی کی

کہہ کے مجھ کو شریف، لوگوں نے
مری توہین امتیازی کی

رنگے ہاتھوں غریب پکڑا گیا
شہر بھر نے زباں درازی کی

ڈاکٹر عزیز فیصل

لب پہ رکھی سدا ہنسی میں نے
آنسوؤں کی نہ اک سنی میں نے

ہجر کا بھی بجٹ بنایا ہے
سیکھ کے گُر کفایتی میں نے

رٹ لیئے ہیں جوابِ شکوہ کو
چند شکوے روایتی میں نے

پال رکھے ہیں چند ٹکوں پہ
کتنے ستے حمایتی میں نے

سب مراعات لوٹ کے بھی سدا
خود کو رکھا شکایتی میں نے

اس کو "مس ورلڈ" کہہ دیا آخر
دے کے نمبر رعایتی میں نے

--ق--

وصل کی بات اس سے پکی کی
بذریعۂ سفارشی میں نے

دل پہ تالا لگا کے پیتل کا
دی بشیراں کو جا کے "کی" میں نے

اپنے دیسی وجود پر فیصل
سوٹ پہنا ولایتی میں نے

عرفان قادر

خوش نہیں اتنا وہ شیطاں کی گرفتاری پر
جتنا دلشاد ہے رمضان میں افطاری پر

زن مریدی کی وبا پھیلتی جاتی ہے بہت
"کچھ تو تحقیق کرو اس نئی بیماری پر"

خواب خرگوش کے لیتا ہے مزے جو دن میں
سامنے باس کھڑا پائے گا بیداری پر

آشیانے کی جگہ خود ہی پرندے ڈھونڈیں
ہم غریبوں کو نہ اکساؤ شجرکاری پر

پہلے رفتار ہوا کرتی ہے بیلن کی سلو
اور تیزی سے چلاتی ہے مری زاری پر

دیس کو لوٹ لیا خادمِ اعلیٰ بن کر
جاؤں قربان تری ایسی اداکاری پر

کر چکا میری "زمیں" دوسرے شاعر کو الاٹ
کس عدالت میں کروں کیس مَیں، پٹواری پر

پار کرتی ہو گھڑے پر ہی جو ہر بار چناب
ہیڈ مرالہ سے ہے آسان، چلو لاری پر

عرفان قادر

سو رُپے ایڈوانس لے کر، اب دغا دینے لگے
تھا غزل کا کنٹریکٹ، اِک ماہیا دینے لگے

چڑھ گیا جب پیڑ پر ہاتھی تو پھونکیں مار کر
"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

سامنے آئیں نہ تا کہ کچھ کرپشن کے ثبوت
سب کے سب اک دوسرے کو آسرا دینے لگے

جب یہ جانا ایک شے ہے، مارکیٹنگ کا ہے فرق
نان چھولے بھی ہیں پزے کا مزا دینے لگے

دو مہینوں سے نہ کھانے کو دیا کنجوس نے
دانت کے کیڑے بھی آخر بد دعا دینے لگے

کون ظالم ہیں جو "شیشے" کی شکل میں زہر ہی
نوجوانوں کو برائے شپ شپا دینے لگے

ہم نے دیکھی اُن کے گھر کی راہ گوگل ارتھ پر
پھر نہ جانے کیوں غلط گھر کا پتا دینے لگے

جُڑ سکا ایلفی سے بھی سو بار جب اُن سے نہیں
تب ہمیں ویلڈنگ کو دِل ٹوٹا ہُوا دینے لگے

کیا بنے اُس قوم کا جو ہو گئی اتنی کرپٹ
کام جائز کی بھی رشوت جا بجا دینے لگے

تنویرؔ پھولؔ

لِسٹ میں بیگم! نئی شلوار لکھ
آ رہا ہے عید کا تہوار لکھ

چور اُچکّے بن گئے شب زندہ دار
اور چوکیدار ہے بیمار لکھ

اُس کی آنکھیں مثلِ اُلّو گول گول
وہ ہے لومڑ کی طرح مکّار لکھ

پیر صاحب کا رویّہ دیکھ کر
سب مرید اُن سے ہوئے بیزار لکھ

مرغیوں کا تو بہاتا رہ لہو
کتنے چرغے ہو گئے تیار ؟ لکھ

رشوتیں کھا کر ہے پھیلی اُس کی توند
پھٹنے والی اُس کی ہے شلوار لکھ

ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے گوبھی کے پھول
پھولؔ جی لائے ہیں وہ تلوار لکھ

تنویرؔ پھولؔ

اپنے مُکھڑے پہ سجا کر وہ نقاب آتا ہے
ڈالنے ڈاکا یہاں خانہ خراب آتا ہے

منظرِ کُرسی میں لیڈر کی ہیں اُلجھی ہیں
سامنے جیسے شرابی کے کباب آتا ہے

مُکھڑا جیسا بھی نظر آئے، اُسے ہم دیکھیں
کون ہے وہ جسے حوروں ہی کا خواب آتا ہے

ساس جو تیری ہے، دیتی ہے سسر کو الزام
روز ہاتھوں میں لئے جامِ شراب آتا ہے

پیر صاحب کی سیہ ریش معمہ تو نہیں
روز و شب ان کیلئے کالا خضاب آتا ہے

مہرباں آج ہے، سالے کی عنایت دیکھو!
ہاتھ میں تھامے ہوئے کھیر کا قاب آتا ہے

نام ہے اُس کا حجاب، آئی وہ ہولے ہولے
پھولؔ سے بولی حجاب، اب تو حجاب آتا ہے

محمد ایوب صابرؔ

ابھی تک ہے جواں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا
کرو سب سے بیاں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

ابھی تو عقل کی اک داڑھ بھی اُس کی نہیں نکلی
وہ ہو گی بدگماں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

کسی کونے میں چُھپ جاؤ وہ تم کو ڈھونڈ لائے گی
ملے کیسے اماں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

یہ آنٹی لفظ نے اُس کا ہے جینا کر دیا مشکل
وہ اب جائے کہاں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

کرائے دار کو وہ پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھتی ہے
وہ ہے مالک مکاں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

اگر بھولے سے بھی تم نے کبھی جو کہہ دیا آنٹی
وہ کھینچے زباں اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

ابھی تک اُس کا غصہ تم نے دیکھا ہی نہیں صابرؔ
وہ اک آتش فشاں، اُس کو ابھی آنٹی نہیں کہنا

ابنِ منیب

اے سی نہ سہی پنکھا چلانے کے لئے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لئے آ

کب سے تری حدت سے ہے محروم زمانہ
روٹی پڑی توے پہ پکانے کے لئے آ

اب تو مرے بچے مجھے کہنے لگے "سائیں"
کچھ اور نہیں منہ ہی ڈھلانے کے لئے آ

لیڈر ہے تُو، باہر ہے تُو، تڑپیں ترے ورکر
تُو ہم سے خفا ہے تو خزانے کے لئے آ

بھرتا ہے مرا پیٹ ترا جوشِ خطابت
تقریر وہی پھر سے سنانے کے لئے آ

کرتی ہے بہت خوار رہِ شہرِ تمنا
اِک روڈ وہاں تک بھی بنانے کے لئے آ

دفتر میں ذرا دیر ہو، چلّائے ہے بیگم
ابّا ہے تُو، بچوں کو ڈرانے کے لئے آ

ہتھیار کیے تیز نگہ، غمزہ و ابرو
چپکے سے کبھی دل کو اٹھانے کے لئے آ

ڈھونڈے ہے تجھے رویتِ خوباں کی کمیٹی
اے ماہ جبیں عید کرانے کے لئے آ

نوید صدیقی

بعد فیشل کے عجب رنگِ جواں ہوتا ہے
ہر مذکر پہ مونث کا گماں ہوتا ہے

تیری جانب سے کروں صاف میں کیسے دل کو
دل پہ لکھا ہوا ڈیلیٹ کہاں ہوتا ہے

ڈھونڈ لیتا ہے بہرحال وہ معشوقہ کو
عاشقِ زار بھی جغرافیہ داں ہوتا ہے

گھر میں ہوتی نہیں جب اہلیہ اس دم وہ گھر
لوگ کہتے ہیں کہ فردوس نشاں ہوتا ہے

درمیاں نیوز کے آجاتا ہے جب آئیٹم سانگ
سامنے ٹی وی کے ہر خوردوکلاں ہوتا ہے

اس کے شعروں میں روانی نہیں ہوتی لیکن
کھا کے کچھ ”انڈے ٹماٹر“ وہ رواں ہوتا ہے

یوں تو بزنس میں بھی کم کم ہے گزارا اس سے
پر سیاست میں دیانت سے زیاں ہوتا ہے

ہم جو فرمائیں تو بکواس سمجھتے ہیں سبھی
ان کی بکواس بھی دلچسپ بیاں ہوتا ہے

داد پاتے ہیں مرے وزن سے خالی اشعار
اور یوں لطفِ سخن نالہ کناں ہوتا ہے

واقعی رکھتا ہے وہ حفظِ مراتب کا خیال
ناظمِ بزم اگر مرتبہ داں ہوتا ہے

فیس بک پر جو چڑی بن کے ستاتی ہے نوید
اکثراوقات حقیقت میں وہ ”کاں“ ہوتا ہے

نوید صدیقی

ایک بیگم نے کہا ”میرا میاں“ ہے زندگی
سن کے شوہر نے کہا ”کوہِ گراں ہے زندگی“

حکمرانوں کی گزرتی ہے مگر آرام سے
گو عوام الناس کی آہ و فغاں ہے زندگی

گیس کی موجودگی میں زندگی ہے واہ وا!
اور نہ ہو تو گیلی لکڑی کا دھواں ہے زندگی

آئینے میں دیکھتا ہوں خود کو بوڑھا ہو گیا
پارلر میں جا کے دیکھوں تو جواں ہے زندگی

نیٹ بھی موسم کی طرح بگڑا ہوا ہے آج کل
بس اِنہیں دو گڑبڑوں کے درمیاں ہے زندگی

جانتا ہے اک سیاست دان یہ اچھی طرح
روز اخباروں میں اک جھوٹا بیاں ہے زندگی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تہذیب کے غلاف سے آگے نہیں بڑھے
ہم اِک "اٹوگراف" سے آگے نہیں بڑھے

وہ شاعری کی شین سے واقف نہ ہو سکی
ہم قافیے کی قاف سے آگے نہیں بڑھے

کیا بات اُن سے کیجئے عمرے کی حج کی اب
بیگم کے جو طواف سے آگے نہیں بڑھے

شادی کا سخت میچ ہوا آخرش draw
وہ اپنے "ہاف" سے آگے نہیں بڑھے

تخمینے ہی لگاتے رہے ہم تمام عمر
لیکن کبھی گراف سے آگے نہیں بڑھے

لیڈر یہ چاہتے ہیں ترقی خود اُن کی ہو
اور قوم اختلاف سے آگے نہیں بڑھے

میدان میں جہاد کے کیسے وہ جائیں گے
جو صرف اعتکاف سے آگے نہیں بڑھے

کچھ لوگ پڑھتے رہ گئے "منٹو کہانیاں"
بد فکر کچھ "لحاف" سے آگے نہیں بڑھے

شاعر مزاح کے بنے کچھ تو کامیڈین
کچھ لاف اور گزاف سے آگے نہیں بڑھے

ہیں اپنی "گل" پہ چودھری صاحب اڑے ہوئے
ہم اپنی شین قاف سے آگے نہیں بڑھے

تسلیم کر لیا کہ ہے دہشت گری غلط
ہم اپنے اعتراف سے آگے نہیں بڑھے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دیکھ کر بھاگا ہوں میں کفگیر اُس کے ہاتھ میں
آگئی ہے اب مری تقدیر اُس کے ہاتھ میں

فیس بک پہ لوڈ کی تھیں جھوٹی تصویریں تمام
آگئی یہ کون سی تصویر اُس کے ہاتھ میں

اُس کے سب قانون اُس کے فائدے کے واسطے
وہ ہے حاکم اور ہے تعذیر اُس کے ہاتھ میں

اِک منٹ میں وہ ہجومِ بیکراں لے آئے گا
آگیا ہے نعرہء تکبیر اُس کے ہاتھ میں

پاس مشکل سے ہوا میٹرک تو ٹیچر بن گیا
الحذر ہے قوم کی تعمیر اُس کے ہاتھ میں

وہ اسے تاریخی مخطوطہ سمجھتا رہ گیا
ڈاکٹر کی تھی جو اک تحریر اُس کے ہاتھ میں

برف کو برفی بنا کر بیچ دے گا شیخ اب
میڈیا اس کا ہے اور تشہیر اُس کے ہاتھ میں

اب کچن کے سارے برتن روز دھلواتی ہے وہ
اک دفعہ چاٹی تھی ہم نے کھیر اس کے ہاتھ میں

شاعرِ رنگیں نوا تحریف کے درپے ہوا
آگئے اقبال و فیض و میر اُس کے ہاتھ میں

ہم نے دیکھا ہے یہ مظہر جو ریٹائیر ہوگیا
اپنا مجموعہ ہے یا تفسیر اُس کے ہاتھ میں

ہاشم علی خان ہمدم

اس کو بھی ''سولہوائے'' کئی سال ہو گئے
مجھ کو بھی ''سٹھیائے'' کئی سال ہوگئے

شادی کے بعد دھوپ سی رنگت رہی مری
چہرے پہ رنگ آئے کئی سال ہو گئے

منی بھی اپنی فلم کے چلبل کی ہو گئی
دل کو بھی چلبلائے کئی سال ہو گئے

کیا پوچھتے ہو مجھ سے پنامہ کے کیس میں
دولت کہیں چھپائے کئی سال ہو گئے

اب تو وہ ڈھیٹ پن میں شریفوں کا باپ ہے
عزت اسے گنوائے کئی سال ہو گئے

لائے تھے آسمان سے تارے اتار کر
آنکھوں کو برقیائے کئی سال ہو گئے

دل سے شباب یار کا جوتا نہیں گیا
نقش وفا مٹائے کئی سال ہو گئے

شادی کے بعد اس نے بھی بھائی کہا مجھے
باجی اسے بنائے کئی سال ہو گئے

صحرا میں بھی پلاٹ کا قبضہ نہیں ملا
مجنوں کے در پہ آئے کئی سال ہو گئے

میری لغت میں اب نئے الفاظ بھی تو ہیں
انگلش کو میریائے کئی سال ہو گئے

تحفے میں کمپنی کا کریڈٹ دیا انہیں
وہ جن کو قطریائے کئی سال ہو گئے

بے چارے عام لوگ تو کنگال ہی رہے
دولت کو قومیائے کئی سال ہو گئے

اب تو ہمارا نام تک سنتا نہیں کوئی
ہمدم غزل سنائے کئی سال ہو گئے

ہاشم علی خان ہمدم

تاریخ کا حصہ ہیں وہ سلطان وغیرہ
ہیرو ہیں مرے دیس کے اب شان وغیرہ

پنجاب کی پولیس جنہیں ڈھونڈ رہی ہے
رہتے ہیں کراچی میں کہاں ڈان وغیرہ

بلو سے ملتا ہے کبھی پپو سے پنگا
پینڈو کا مقدر نہیں ایان وغیرہ

وہ زیر کفالت ہیں بزرگوں کے ابھی تک
کیوں شور مچاتے ہیں یہ عمران وغیرہ

یہ لُس کی شدت ہے کہ سردی کا اثر ہے
یا مس نے مروڑے ہیں ترے کان وغیرہ

رشوت کی کمائی سے افاقہ نہیں ہوتا
معدے میں سلگتے ہیں چنے نان وغیرہ

فیشن سے ہوئے وصل کے امکان زیادہ
لپٹے ہیں حسینوں سے کئی تھان وغیرہ

اک پاپ ہی لگتا ہے مجھے پاپ میوزک
ک؟ نچتے چلے جاتے ہیں جو سرتان وغیرہ

وہ میچ مگر اور کوئی جیت گیا ہے
جس میچ میں کھیلے نہیں کپتان وغیرہ

اب کون بجٹ ساز انہیں دور کرے گا
مہنگائی سے آتے ہیں جو بحران وغیرہ

یہ گفٹ کسی اور ہی سودے کا ثمر ہے
رشوت کا لبادہ ہیں یہ احسان وغیرہ

گنتے ہیں ہمیں لوگ وغیرہ کے لقب سے
پی آر وغیرہ ہے نہ پہچان وغیرہ

دھندہ ہے یہ نقادِ سخن سوز کا ہمدم
رہتے ہیں کسے یاد یہ اوزان وغیرہ

نوید ظفر کیانی

وہ زلف ہے لہراتی ہوئے "لام" کی صورت
بھونڈوں کے لئے ہے کسی پیغام کی صورت

بھیا ہوں تمھارے یا وہ رقباء ہوں ہمارے
کرتے ہیں حجامت کسی حجام کی صورت

لالے نے جو لی ہے تو عجب مست ہوا ہے
نسوار کی چٹکی بھی ہے اِک جام کی صورت

کیوں پیشِ مسز دیکھا تھا مِس نے متبسم
مسٹر کے لئے گھر میں ہے ہنگام کی صورت

اُس بُت کے اگر سرد رویے کا بیاں ہو
ملتان میں مل جاتی ہے کالام کی صورت

جرمانۂ میک اپ تو بھرا ہو گا میاں نے
یونہی نہیں وہ جلوۂ گلفام کی صورت

جو گھر میں بنے رہتے ہیں نوابِ زمانہ
سسرال میں ہیں بندۂ بے دام کی صورت

اُس عمر میں ہیں جس میں نظر آنے لگی ہے
دشنام کی صورت ہمیں اکرام کی صورت

سب جاب کے کلّے سے بندھے رہتے ہیں دن بھر
اب ڈیڈ کی صورت نہ کہیں مام کی صورت

ہم بحث بھی کرتے ہیں تو بن جاتی ہے مَن مَن
وہ عرض بھی کرتے ہیں تو احکام کی صورت

نوید ظفر کیانی

کسی نیوز چینل پہ تکرار کیا تھی
دماغوں کی لسی سی بیکار کیا تھی

جو ڈیٹنگ میں میری معاون رہی ہے
گدھا گاڑی کے بھیس میں کار کیا تھی

بڑے مان سے آئے تھے ہم فدائی
ترے ہاں رقیبوں کی بھرمار کیا تھی

سگِ کوئے لیلیٰ جو پیچھے لگا تھا
تو بجلی سی مجنوں کی رفتار کیا تھی

وہ تھم تمھارا سمجھ میں نہ آیا
کہ پتلون تھی یا وہ شلوار کیا تھی

اگر کارِ سائنس تھا راکٹ بنانا
تو پھر خان صاحب کی نسوار کیا تھا

وہ گنجوں کی کیوں آنیاں جانیاں تھیں
وہ ہاتھوں میں کھجلی سی ہر بار کیا تھی

میں اظہارِ الفت کی رکھتا تھا نیت
جواباً وہ کرنے کو تیار کیا تھی

یہ دس فٹ بھی ہوتی تو بیکار ہوتی
کوئی تیرے تاڑو کو دیوار کیا تھی

تری چونچ ہے نہ مری دُم سلامت
تری جیت کیوں تھی مری ہار کیا تھی

کئی عاشقوں کے سجائے تھے بوتھے
ملیٹینٹ تھی، کوئی مٹیار کیا تھی

محمد خلیل الرحمٰن

(ظفر اقبال کی زمین پر کھیتی باڑی)

سرپھٹول گھر کے اندر روز ہوتی ہے مگر
"یہ تماشا اب سرِ بازار ہونا چاہیے"

روز برتن دھوتے دھوتے ایسی عادت پڑگئی
اب تو ہم کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

اب وہی کرنے لگے ہیں اک نئی شادی کی بات
جو کبھی کہتے تھے بس اِک بار ہونا چاہیے

"جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفؔر"
آدمی کو بس ذرا ہشیار ہونا چاہیے

پھر سے بنیادیں نئی ہم کھود ڈالیں گے خلیؔل
شیخ چلّی کا محل مسمار ہونا چاہیے

محمد خلیل الرحمٰن خلیؔل

چار سو وہ نظر بھی رکھتے تھے
اس نے کتے بھی سب سدھائے تھے

چار سالوں نے مل کے پیٹا تھا
دیکھ لو کتنے ان کو پیارے تھے

اس نے تھپڑ رسید کر ڈالا
میں نے پھاڑے فقط غبارے تھے

اک سہیلی نے راز فاش کیا
پھر تو دیکھے زمیں پہ تارے تھے

جن کو لڑکی سمجھ کے چھیڑا تھا
وہ تو ہجڑے بھی غم کے مارے تھے

دیکھی دلہن تو خود کشی سے مرا
شامیانوں میں اب شرارے تھے

چار بلیوں کے پیرہن سے لگے
ایسے بوتیک پہ غرارے تھے

اُن دنوں تانک جھانک کرتے تھے
جب جوانی کے دن گزارے تھے

قد میں بونے مگر تھیں جورو بانس
ساتھ چلتے دکھے چھوہارے تھے

نادہندہ رہا ہے عشق ترا
کب خلیؔل ایسے گوشوارے تھے؟

نوؔر جمشید پوری

گھر میرے، خدا بھیج دے مہمان وغیرہ
آئے تو کوئی گھر مرے انجان وغیرہ

قربان گئے جن پہ دل و جان وغیرہ
ہم ساتھ اٹھا لائے وہ گلدان وغیرہ

وہ جا کے سیاست میں بھی کچھ کر نہیں پایا
اب بیٹھ گیا کھول کے دکان وغیرہ

ہم ہو کے شکم سیر دعا اور بھی دیں گے
بریانی ملے، قورمہ ہو، نان وغیرہ

کچھ کام نہ آئے گا وہاں بیچ کے جانا
بیکار سیاست میں ہے ایمان وغیرہ

غزلیں ہی سنا تا رہا وہ صبح تلک بس
اے کاش! کھلا دیتا ذرا پان وغیرہ

اے یار تری بزم میں تو نوؔر بہت ہے
خوشبو بھی ملے سلگے جو لوبان وغیرہ

جہانگیر نایاؔب

اِس قدر پھولے کہ پنچر ہوگئے
ہم کزن سے ان کے شوہر ہوگئے

اور تو کچھ ہو نہ پائے ہم کبھی
اِک عدد بیوی کے شوہر ہوگئے

انگلیوں پر وہ نچاتی ہے ہمیں
گھر کے ہم مالک تھے نوکر ہوگئے

قبل از شادی تھے دلبر ہم مگر
چھ مہینے ہی میں "الٹر" ہو گئے

نصف بہتر ہے مری اب وہ مگر
ہم ہی ان کے نصف بدتر ہوگئے

سالیاں مثلِ "کرن بیدی" ہوئیں
اور سالے سارے "گبر" ہوگئے

بھائی ہیں انجینئر اپنے سبھی
ہم نکمے تھے سخنور ہو گئے

تھی تڑپ ہم میں سمندر کی طرح
سوکھ کر ہم آج پوکھر ہوگئے

ڈیڈ نے لے لی جگہ ہے باپ کی
محترم سے اب تو مسٹر ہوگئے

ہے تغیّر وقت کا نایاؔب یہ
جتنے غنڈے تھے منسٹر ہو گئے

روبینہ شاہین بیناؔ

اک بار ووٹ مانگنے آیا تھا اور بس
لیڈر نے سب کو اُلو بنایا تھا اور بس

ہابیل کے بھی قتل کو تسلیم کرلیا
تھانے کا اُس نے چکر لگایا تھا اور بس

اب قوم کا نصیب نہیں کالا باغ بھی
لیڈر نے سبز باغ دکھایا تھا اور بس

قیمت پھلوں کی پوچھ کے بیچارگی کے ساتھ
حسرت سے ہاتھ اُس نے لگایا تھا اور بس

سالن میں مرچیں یونہی کہاں تیز ہوگئیں
نند نے ہمارا ہاتھ بٹایا تھا اور بس

وہ مونچھوں والا بھائی نکل آیا دیکھ لو
ایف بی پہ ہم نے بہن بنایا تھا اور بس

لیبل ہے زن مرید کا اس پہ لگا ہوا
اک بار اس نے کھانا بنایا تھا اور بس

بیگم کے ڈھیٹ پن میں نہ آئی کبھی کمی
شوہر نے میکے جا کے منایا تھا اور بس

بیگم نے ڈائیٹنگ کی ہدایات جاری کیں
وہ تو خوشی سے پھولا پھلایا تھا اور بس

پھر اس کے بعد سارا کچن اس کو مل گیا
چولہے کو ایک بار جلایا تھا اور بس

اس نے ہر اک کُڑی کو ہی باجی بنا لیا
میڈم نے پیار اس کو سکھایا تھا اور بس

چھینا کسی نے پرس تو احسان یہ کیا
پاکٹ میں لوٹنے کا کرایہ تھا اور بس

بیناؔ مشاعرے کی خبر ہی نہیں رہی
دیوان میں نے اپنا سنایا تھا اور بس

روبینہ شاہین بیناؔ

ہوئی نہ دل کے کٹہرے میں گر صفائی میاں
تمھارے کام نہ آئے گی یہ کمائی میاں

چھپا رہے ہو اثاثے جو ساری دنیا میں
ذلیل کر کے رہے گی یہ منہ چھپائی میاں

اب ایسے چور کو کس قید میں لیا جائے
چرا کے دل مرا جس نے نظر چرائی میاں

یہ تیرا کام تھا لیکن ہوا نہیں تجھ سے
کرے گا کون کرپشن کی یہ کٹائی میاں

تو معترف نہیں اس کے سیاسی باؤنسر کا
اگرچہ خان نے تیری وکٹ گرائی میاں

ذرا قریب سے دیکھو نا اپنے کاسے میں
کھلے گی دل کی عدالت میں پارسائی میاں

یہ اقتدار کی دولت یونہی نہیں رہے گی
تجھے تو مار ہی ڈالے گا تیرا بھائی میاں

ثبوت کوئی نہیں ہے تو مال کس کا ہے
یا تیرے سارے اثاثے ہیں ماورائی میاں

دکھائی دیتے ہیں لیکن دکھائی دیتے نہیں
کسی کو کیوں نہیں دیتے ہیں یہ دکھائی میاں

جگہ جگہ پہ نشاں ہیں تری کرپشن کے
گلی گلی میں پڑی ہے تری کمائی میاں

دکھائی دینے لگا ہے جو چشم بینا سے
کسی کو کیوں نہیں دیتا ہے وہ دکھائی میاں

عابد محمود عابدؔ

ہر جگہ سب سے ہیں اپنی یاریاں
روز ملتی ہیں ہمیں افطاریاں

زخم میرے بھر چکے ہیں اس لئے
تازہ چھینٹی کی کریں تیاریاں

لُوٹنے کے واسطے اس ملک میں
چل رہی ہیں لیڈروں کی باریاں

اِک سواری رہ گئی ہے، آؤ جی!
دینہ، جہلم، لالہ موسیٰ، کھاریاں

فیس بک پر بیٹھے رہتے ہیں فضول
قوم کی کب جائیں گی بیکاریاں

پارکوں میں کالجوں میں دھرنوں میں
پھیلتی ہیں عشق کی بیماریاں

گھر میں گھس کر جائیں بیوی کے حضور
تھانے داروں کی یہ تھانیداریاں

عابد محمود عابدؔ

گِھس چکے انتظار کے جوتے
دِل میں آ جا اُتار کے جوتے

میں نے مانگا ثبوت چاہت کا
جو دیا اس نے مار کے جوتے

عشق کے حکم پر بنائے ہیں
اپنے چمڑے سے یار کے جوتے

ایک فرشی مشاعرہ ہو گا
شعر ہوں گے اتار کے جوتے

سُنتی ہو روٹی مت پکانا تم
کھا کر آیا ہوں یار کے جوتے

شک کے کانٹے مجھے چبھے کیوں کہ
پھٹ چکے اعتبار کے جوتے

چور نے سب قبول فرمایا
اُترے جب تھانے دار کے جوتے

اپنے گُل دان میں سجاؤں گا
جان سے پیارے یار کے جوتے

گُھس گیا ہے دماغ میں پُھر
کھائیے اہل کار کے جوتے

اعلیٰ افسر بنایا ہے یارو!
ابّا نے مجھ کو مار کے جوتے

حادثہ رونما ہُوا عابدؔ
اُترے جیسے ہی کار کے جوتے

اسانغنی مشتاق رفیقی

زور سے بول سنائی نہیں دیتا باشاہ
مجھ کو دن میں بھی دکھائی نہیں دیتا باشاہ

پھینک جاتا ہے مرے چہرے پہ میرا بیٹا
ہاتھ میں لا کے کمائی نہیں دیتا باشاہ

دوست ہے میرا، مگر نقد رقم مانگتا ہے
ڈاکٹر قرض دوائی نہیں دیتا باشاہ

جب سے شادی ہوئی بیگم کے سوا دنیا میں
مجھ کو کچھ اور بھائی نہیں دیتا باشاہ

گھی بنانے کے لئے اُس کو اُٹھا لیتا ہے
چائے والی بھی ملائی نہیں دیتا باشاہ

جب سے ”شکر کر“ کی وبا پھیلی ہے گاؤں میں مرے
تحفے میں کوئی مٹھائی نہیں دیتا باشاہ

یوں تو چرچے ہیں رفیقی کی سخاوت کے مگر
روپیہ کیا ہے وہ پائی نہیں دیتا باشاہ

اسانغنی مشتاق رفیقی

کون کہتا ہے کہ شیطان سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو واعظ ترے ہذیان سے ڈر لگتا ہے

تری باتوں سے میں مرعوب نہیں ہوسکتا
ہاں ترے منہ میں چھپے پان سے ڈر لگتا ہے

کیا پتہ چائے میں کیا گھول کے تو رکھ دے گا
چائے والے ترے احسان سے ڈر لگتا ہے

وہ بھی کیا دن تھے ترے ہونٹ کنول لگتے تھے
اب تو جاناں تری مسکان سے ڈر لگتا ہے

ووٹ کی شکل میں اک دن اسے تو مانگے گا
حاکم شہر تری دان سے ڈر لگتا ہے

کسی گونگے سے کوئی خوف نہیں ہے لیکن
جاگتے بولتے انسان سے ڈر لگتا ہے

کیا پتہ کب مجھے وہ پھاڑ کے کھا جائے گا
بھیس بدلے ہوئے انسان سے ڈر لگتا ہے

پوجا کرتے ہوئے دیکھا ہے کنول کو جب سے
مجھ کو کافور سے لوبان سے ڈر لگتا ہے

طنز گوئی میں رفیقی تری ہے بات ہی اور
ہر کسی کو ترے دیوان سے ڈر لگتا ہے

سیّد فہیم الدین

کس طرح اب میرا جیون ہو بسر شام کے بعد
تیری گلیوں میں اُبلتے ہیں گٹر شام کے بعد

ہم کبھی رُکتے ہیں دفتر میں اگر شام کے بعد
کیونکہ افسر کو لگاتے ہیں بٹر شام کے بعد

رفتہ رفتہ تیرے چہرے سے جو میک اپ اُترے
حُسن تیرا بھی نظر آئے کھنڈر شام کے بعد

عین ممکن ہے کسی شک میں ہی اندر کر دے
تم پولیس کو جو کبھی آئے نظر شام کے بعد

اب تو گلیوں میں فہیم ہم ہی نظر آتے ہیں
اور دُبکے ہیں لحافوں میں نڈر شام کے بعد

سیّد فہیم الدین

کس قدر سرد ہو گیا ہے وہ
پیٹ کا درد ہو گیا ہے وہ

بن کے بیوی کے پیر کی جوتی
واہ! کیا مرد ہو گیا ہے وہ

کل رقیبوں نے اس قدر پھینٹا
راہ کی گرد ہو گیا ہے وہ

دیکھ کر اپنی ساس کا چہرہ
دفعتاً زرد ہو گیا ہے وہ

روز آتا ہے مانگنے قرضہ
گھر کا اِک فرد ہو گیا ہے وہ

ارشاد العصر جعفری

جگت پور کا پیر

الف ایس سی کے پیپرز ہو چکے تھے اور ہم سب دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ کم از کم تین ماہ کی فراغت تھی اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہ تین مہینے کیسے گزریں۔ اس سال گرمی بھی کچھ زیادہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے گروپ مصروفیات یعنی شرارتوں میں بھی کمی آ چکی تھی۔

"کیسے کٹیں گے یار، یہ اڑھائی تین ماہ۔ سوچو۔ ذہن لڑاؤ" عامر نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی مفید کاروبار کر لینا چاہئے" شاہد نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہ لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ تمہاری کاروباری ذہنیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ آج کل گرمی کی شدت کی وجہ سے چلتے ہوئے کاروبار مندے پڑے ہوئے ہیں اور تم نیا کاروبار کرنے کا مشورہ دے رہے ہو" عامر نے شاہد پر گرمی نکالتے ہوئے کہا۔

"بھئی مانا کہ گرمیاں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے مزاج میں بھی گرمی شامل ہو جائے" ذوالفقار نے عامر کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی بات بھی تو دیکھو۔ اس کے پاس ہے سرمایہ۔ جو یہ کاروبار شروع کرے گا" عامر نے کہا۔

"اچھا تم بتاؤ۔ ان فراغت کے دنوں میں، اور شدید گرمیوں میں کیا کیا جائے" صدیق نے عامر سے پوچھا۔

"کسی ٹھنڈے علاقے میں چلتے ہیں" عامر نے اپنی سیاحتی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا۔

"ٹھنڈے علاقوں میں جانے کے لئے بھی سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس ہے سرمایہ؟" شاہد نے کہا۔

"یار۔ سب مل کر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ اگر گرمیوں کے یہ تین مہینے ہم فارغ رہ گئے تو یقیناً پاگل ہو جائیں گے" طارق

نے کہا اور پھر واقعی سب سوچ میں ڈوب گئے۔
ہم اتنی دیر سے ان کی باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔ سب سوچ میں گم ہوئے تو ہمارے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند کوندا اور ہماری آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

''غالباً قیس چلبلائی کے ذہن میں کوئی ترکیب آ گئی ہے'' شاہد نے ہمارے چہرے کی طرف دیکھا تو کہا۔ باقی ساتھیوں نے بھی چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''ہاں۔ ایک ترکیب آئی ہے میرے ذہن میں۔ اگر کامیاب رہی تو تفریح بھی ہو جائے گی اور پیسہ بھی آ جائے گا۔ اس کے بعد ہم مہینہ سوا مہینہ کسی پہاڑی علاقے میں بھی گزار سکیں گے'' ہم نے کہا۔

''اچھا۔ ایسی کون سی ترکیب ہے'' طارق حیرت سے بولا۔ باقی بھی حیران دکھائی دے رہے تھے۔

''کسی گاؤں میں چلنا پڑے گا'' ہم نے کہا۔

''کیوں۔ کیا آم چوری کرنے کا ارادہ ہے'' ذوالفقار نے کہا۔

''اگر میری ترکیب کامیاب رہی تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ آم کی پیٹیاں خود بخود چل کر ہمارے پاس آئیں گی'' ہم نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان سب کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

''اچھا۔ کیا جن قابو کرنے کا ارادہ ہے'' ندیم نے حیرت بھرے لہجے میں کہا تو ہم نے گھور کر اسے دیکھا۔

''میں جن تو قابو نہیں کر سکتا البتہ تمہیں جن ضرور بنا سکتا ہوں'' ہم نے ندیم سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' صدیق نے پوچھا۔

''تم لوگ بات تو پوری سنتے نہیں ہو درمیان میں بول پڑتے ہو۔ اب میری بات غور سے سنو'' ہم نے ان سے کہا اور ان سب کی طرف دیکھا۔ وہ سبھی ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

''میں بن جاتا ہوں پیر۔ مجھے کچھ تعویز لکھنے آتے ہیں کیونکہ میں نے دو سال پہلے پورا ایک مہینہ ایک پیر کے ساتھ گزارہ ہے۔ اس کا چیلا بن کر اور اس دوران میں نے اس کی حرکتیں بہت غور سے دیکھی تھیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ میں یہ کردار بخوبی نبھا لوں گا۔ ہم یہاں سے نزلہ، زکام، کھانسی، بخار وغیرہ کی گولیاں پیس کر لئے چلیں گے اور انہیں چینی میں مکس کر کے اور چینی پر دم کر کے مریدوں کو دیں گے۔ ایک آدمی جاسوسی کرے گا۔ وہ گاؤں کے ہر گھر کا پتا کرے گا کہ اس گھر کے کیا مسائل ہیں۔ گاؤں کے کسی گھر کی جاسوسی کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جاسوس زیرو زیرو ایٹ۔ وہ تمام تفصیل معہ گھر کے افراد کے کوائف مجھے بتائے گا۔ اس طرح میں ان کے مسائل سے آگاہ ہو جاؤں گا اور ان پر پریشر پڑے گا۔ اگر کوئی بندہ میرے لئے پریشانی کا باعث بنے گا تو اسے باقی ساتھیوں نے سنبھالنا ہوگا۔ انہیں سنبھالنے کے لئے ہمیں ماسک میک اپ کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب تم خوفناک ماسک میک اپ کر کے رات کے وقت کسی کو ڈرانے جاؤ گے تو معصوم اور سیدھے سادھے دیہاتی فوراً ڈر جائیں گے۔ اس کے علاوہ تم سب نے مختلف ذرائع سے اس گاؤں میں میری پبلسٹی کرنی ہے۔ ایک بار میں مشہور ہو جاؤں پھر لوٹ ہی لوٹ اور عیش ہی عیش'' ہم نے انہیں اپنی شیطانی ترکیب سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ترکیب تو بہت ہی اچھی اور شاندار ہے'' طارق نے خوش ہو کر کہا۔ باقیوں نے بھی اقرار میں سر ہلایا۔

''پھر اس شیطانی پروگرام پر کب سے عمل ہونا چاہئے'' شاہد نے بے چینی سے پوچھا۔

''نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم میں سے کسی کے رشتے دار رہتے ہیں کسی گاؤں میں'' ہم نے ان سے پوچھا۔

''یہاں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے جگت پور۔ وہاں میرے رشتے دار رہتے ہیں۔ میں وہاں کبھی کبھی جاتا ہوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جگت پور کے قبرستان کے بالکل قریب ایک پرانا اور ویران سا مکان بھی ہے۔ جسے تم اپنا مسکن بنا سکتے ہو'' عامر نے چہک کر کہا۔

''ویری گڈ۔ اس مکان میں جن بھوت تو نہیں رہتے'' ہم

نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ابے فراڈیئے پیر۔جنوں سے ڈرتا ہے'' صدیق نے ہمارا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور قہقہہ بھی لگایا۔

''خاموش گستاخ۔ پھونک مار کر آگ لگا دوں گا۔ ہمارے سامنے زبان چلاتا ہے'' ہم نے بھاری آواز میں کہا۔

''اس مکان میں پہلے جن رہتے ہوں یا نہ رہتے ہوں،اب تو ہیں گے نا'' عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''او کے۔تم جاؤ اور تمام تفصیلات اس طرح حاصل کرو کہ گاؤں والوں کو ذرا بھی شک نہ ہو اور ہمارا ذکر بھی چھیڑ دینا کہ ایک پہنچا ہوا پیر قیس چلبلائی اس گاؤں میں آنے والا ہے۔اتنے میں ہماری تھوڑی سی شیو بھی بڑھ جائے گی۔ویسے بھی ایک ہفتے سے ہم نے شیو نہیں کی۔ذرا چہرہ نورانی ہو جائے گا'' ہم نے عامر سے کہا تو اس نے اثبات کے انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆☆

''حق،حق،حق، اللہ ہو۔حق،حق،حق، اللہ ہو''۔۔۔ہم آنکھیں بند کئے ورد کر رہے تھے۔کبھی ہماری آواز آہستہ ہو جاتی اور کبھی تیز۔عامر داڑھی،وگ اور ماتھے پر بڑے سے مسے کا میک اپ کئے ہمارے پاس بیٹھا تھا۔آنکھوں میں اس نے لینز لگا کر آنکھوں کی رنگت بھی تبدیل کر لی تھی۔اسے دیکھ کر کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔آج ہمیں جگت پور میں اپنا ڈیرہ بنائے پہلا دن تھا۔ ایک دن پہلے عامر اس گاؤں کے بارے میں تمام تفصیلات معلوم کر کے آیا تھا۔اس نے ایک ایک گھر کے بارے میں ایسی تفصیلی معلومات دیں کہ ہم حیران رہ گئے۔ہم نے اس گاؤں میں رہنے والے تمام افراد کے کوائف اور مسائل ایک کاپی میں لکھ لئے تھے اور آپس میں اشارے طے کر لئے تھے تاکہ جیسے ہی کوئی آئے عامر مخصوص اشارے سے ہمیں بتا دے کہ یہ کون ہے اور اس کے کیا مسائل ہیں۔اس طرح ہمیں پیر بننے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔عامر نے میک اپ اس لئے کیا تھا تاکہ گاؤں میں کوئی آدمی اسے پہچان نہ لے۔اس نے اپنے جاننے والوں میں ہماری کچھ زیادہ ہی تعریف بھی کر دی تھی اور یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ ایک دو دنوں میں ہم اسی گاؤں میں آنے والے ہیں۔

ورد کو جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو ہم نے آنکھیں کھولیں۔ہمارے سامنے ایک بزرگ عورت،ایک جوان عورت اور ایک بچی بیٹھے ہوئے تھے۔انہیں دیکھنے کے بعد ہم نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور عامر کی طرف دیکھا۔اس نے 9 نمبر کا مخصوص اشارہ کیا تو کاپی میں لکھے ہوئے 9 نمبر کے تمام کوائف اور مسائل ہماری نظروں کے سامنے آ گئے۔

''حق۔اللہ ہو'' ہم نے نعرہ بلند کیا اور جوان عورت کو گھور کے دیکھا۔

''تم شریفن بی بی ہو'' جیسے ہی ہم نے اس کا نام لیا۔اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں شریفن بی بی۔ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارا شوہر تم پر بہت ظلم کرتا ہے۔تمہیں بہت ستاتا ہے اور کچھ کماتا بھی نہیں'' ہم نے پر رعب لہجے میں کہا۔

''پیر سائیں۔۔۔پیر سائیں۔آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ مجھے بچائیں سائیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے بچا لیں۔اسے ٹھیک کر دیں'' شریفن بی بی نے روتے ہوئے کہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ہمارے پاؤں پکڑ لئے۔

''فکر نہ کر بچہ۔وہ انسان کا پتر بن جائے گا۔ایسا ٹھیک ہوگا کہ پھر کبھی تمہارے سامنے زبان بھی نہیں ہلا سکے گا'' ہم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مہربانی پیر سائیں۔مہربانی۔میں عمر بھر آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔بس اس کے ظلم و ستم بند کرا دیں'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے اس کا شوہر ظلم و ستم کرتا بھی ہمارے حکم سے ہو۔اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے ہمارے پاؤں دبانا شروع کر دیئے تو ہم نے اپنی ٹانگیں مزید پھیلا دیں۔شریفن بی بی زور زور سے ہمارے پاؤں دبانے لگی۔ہم سوچنے لگے کہ اگر وہ اسی جوش و خروش سے اپنے شوہر کی خدمت کرے تو اس کا شوہر بھی اس پر تشدد نہ کرے۔سوچتے سوچتے ہم نے عامر کی طرف دیکھا تو وہ

ہمیں گھور رہا تھا۔ ہم نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔
''تم اس کی ماں ہو'' کچھ دیر بعد ہم نے بزرگ خاتون سے پوچھا۔
''ہاں بیٹا۔ میں اس دکھیاری کی ماں ہوں'' بزرگ خاتون نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔
''یہ بچی بیمار ہے'' ہم نے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے بزرگ خاتون سے پوچھا۔
''جی جی سائیں۔ آپ تو جانتے ہیں۔ اسے بخار رہتا ہے'' بزرگ خاتون نے کہا۔
''ہاں۔ پیر قیس چلبلائی جانتا ہے۔ بھلا اس سے کون سی بات چھپی رہ سکتی ہے۔ ادھر آؤ بچی'' ہم نے فخریہ انداز میں پہلے بزرگ خاتون سے کہا پھر بچی کو اپنے قریب بلایا۔
ہم نے اس کی نبض دیکھی۔ ہمارے ایک انکل مجنوں بیزار ڈاکٹر ہیں اور ہم اپنا فارغ وقت ان کے ساتھ کلینک پر گزارتے ہیں۔ ڈسپنسر کا کورس بھی ہم نے کیا ہوا ہے۔ ہم نے بخار کی ایک دو علامات پوچھیں۔
''تم جاؤ اور چینی لے آؤ۔ ہم چینی پر دم کر دیں گے۔ یہ بچی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی اور تمہاری بڑی بیٹی کے لئے تعویز لکھ دیں گے۔ تمہارے داماد کا دماغ بہت جلد ٹھکانے پر آ جائے گا اور وہ ایسا زن مرید بنے گا کہ اسے بیوی کے سوا دنیا میں اور کچھ دکھائی بھی نہیں دے گا'' ہم نے بزرگ خاتون سے کہا تو وہ اٹھ کر جانے لگی۔
''انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ اب ان کی ضرورت نہیں'' ہم نے اس کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''تم نے سازش کی ہے۔ پیر خود بن گئے ہو جبکہ پیر مجھے بننا چاہئے تھا'' ان کے جانے کے بعد عامر نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو ہمیں ہنسی آ گئی۔
''چلو پیر نہ سہی۔ پیر کے چیلے تو بن ہی گئے ہو'' ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ایک تعویذ لکھا اور بزرگ خاتون کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ آتی ہوئی دکھائی دی تو ہم نے ورد شروع کر دیا۔
''حق، حق، حق، اللہ ہو، اللہ ہو، حق، حق'' وہ آئی اور ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ ہم اسے ورد میں مشغول ملے۔ کچھ دیر بعد ہم نے اپنا ورد ختم کیا اور اس کی طرف دیکھا۔
''یہ لو سائیں۔ میں چینی لے آئی ہوں'' اس نے چینی ہمیں تھما دی۔ ہم منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے اور پھر چینی پر دو تین پھونکیں ماریں۔ اس کے بعد چینی دوسرے کمرے میں لے گئے اور اس میں پسی ہوئی بخار کی گولیاں ملا دیں۔
''یہ لو۔ اس چینی کو دن میں تین مرتبہ بچی کو کھلانا ہے اور یہ تعویذ ہے اسے اپنے گھر میں موجود درخت کی ٹہنی پر باندھ دو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا'' ہم نے چینی اور تعویز بزرگ خاتون کو دیتے ہوئے کہا۔
''پیر سائیں۔ ہم غریب لوگ ہیں اس لئے یہ حقیر سا نذرانہ قبول کرو'' بزرگ خاتون نے سو سو کے تین نوٹ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا لیکن ہم نے انکار میں سر ہلایا۔
''سائیں۔ یہ نذرانہ قبول کر لو۔ میں خوش ہو جاؤں گی'' بزرگ خاتون نے منت کرتے ہوئے کہا۔
''ہم نذرانے والے پیر نہیں ہیں اماں جی'' ہم نے ناراض لہجے میں کہا تو بزرگ خاتون مایوس ہو گئی۔
''پیر سائیں۔ اگر آپ نذرانہ قبول نہیں کریں گے تو اماں جی کا دل ٹوٹ جائے گا اور سائیں کسی کا دل تو نہیں توڑنا چاہئے'' اس مرتبہ عامر نے منت بھرے لہجے میں کہا۔
ہم جانتے تھے کہ عامر ظاہراً منت بھرے لہجے میں بات کر رہا ہے جبکہ وہ دل ہی دل میں گالیاں دے کر کہہ رہا ہو گا کہ اسے جلدی سے پیسے وصول کر۔ کہیں خاتون کا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔
''جی جی۔ پیر سائیں۔ میرا دل نہ توڑ۔ یہ نذرانہ قبول کرو'' بزرگ خاتون نے کہا۔
ہم نے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر نوٹوں پر رکھا اور پھر بزرگ خاتون سے کہا۔
''اگر تمہاری خوشی ہے تو پھر یہ نوٹ ہمارے خلیفے کو دے دو''

ہم نے لاپرواہی سے کہا تو اس نے وہ نوٹ عامر کو دے دیئے اور پھر دعائیں دیتے ہوئے چلی گئی۔

''اگر تمہارے انکار پر وہ پیسے دینے کا ارادہ بدل دیتی تو پھر'' عامر نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''بچہ۔ ہم جانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا'' ہم نے مسکرا کر کہا۔

''اگر کبھی ایسا ہوا تو یاد رکھنا میں تمہارے حصے کی رقم سے کٹوتی کرلوں گا۔ ہاں'' عامر نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تو ہم نے اسے گھور کر دیکھا لیکن اسے ہمارے گھورنے کی پرواہ ہی کب تھی۔

''تمہارا ایک کیس اور آرہا ہے۔ ساس بہو والا جھگڑا ہے نمبر ۱۳'' عامر نے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور پھر زور زور سے ورد شروع کردیا۔ چند لمحوں بعد ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ ورد بھی کررہے تھے۔ لڑکی نے کالے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

''آگئی ہو نگہت بی بی۔ ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے'' چند لمحوں بعد ہم نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''جج۔۔۔جج۔۔۔جی پیر سائیں جی'' ہماری توقع کے عین مطابق وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہم جانتے تھے کہ تم ضرور آؤ گی۔ ساس کی ستائی ہوئی ہو۔ ہمارے پاس نہیں آؤ گی تو پھر کہاں جاؤں گی'' ہم نے اسے مزید حیران کردیا۔ اب حیرت کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں عقیدت بھی پیدا ہوگئی تھی۔

''آپ۔ آپ تو پہنچے ہوئے ہیں سائیں۔ بہت پہنچے ہوئے۔ میں آپ کی سدا کنیز۔ مجھے میری ساس سے نجات دلا دیں پیر جی'' نگہت نے ہاتھ باندھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری ساس مرجائے'' ہم نے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا تو وہ ڈرگئی۔

''نن۔نا۔نہ پیر سائیں۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس کے ظلم سے نجات مل جائے۔ وہ میرے ساتھ محبت اور پیار سے پیش آئے'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لیکن تم بھی تو اس کے ساتھ لڑتی رہتی ہو۔ جھگڑا تو دونوں طرف سے ہوتا ہے نا'' ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں مجبور ہوتی ہوں نا سائیں۔ پھر لڑتی ہوں۔ انسان ہوں آخر کب تک صبر کرسکتی ہوں۔ اگر ساس مجھ سے نہ لڑے تو میں بھی کبھی اس سے نہ لڑوں'' نگہت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ساس ٹھیک ہوجائے گی لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ کیونکہ تمہاری دشمن، جو پہلے تمہارے شوہر کی منگیتر تھی، اس نے تمہاری ساس پر کالا جادو کیا ہوا ہے تاکہ تم میں جھگڑا ہوتا رہے اور پھر تمہیں طلاق ہوجائے'' ہم نے کہا۔

''اوہ۔اوہ سائیں آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں آپ کی باندی، آپ کی کنیز۔ مجھے اس کے شر سے بچالیں۔ وہ کم بخت تو تعویذ گنڈوں کی ماہر ہے۔ یقیناً اس نے کالے جادو کے کسی عامل کے ساتھ تعلق استوار کئے ہوں گے اور پھر میری ساس پر کالا جادو کرایا ہوگا'' نگہت نے بھی ہمارے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

''عامل کے ساتھ تعلقات استوار کئے ہوں گے۔ کیا مطلب ہے تمہارا'' ہم نے حیران ہوکر کہا۔ ویسے ہم اس کی بات سمجھ چکے تھے۔

''اوہ۔ آپ بہت معصوم ہیں پیر سائیں۔ آپ ان بری عورتوں کو نہیں جانتے۔ یہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے مردوں سے یاریاں لگاتی ہیں اور پھر ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرتی ہیں'' نگہت نے کہا۔

''کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں۔ مردوں کے ساتھ مل کر اپنا منہ کالا کیسے کرتی ہیں۔ کیا یہ مردوں سے کہتی ہیں وہ مرد ان کے چہرے پر توے کی سیاہی لگادیں یا یہ کالی روشنائی سے منہ کالا کراتی ہیں'' ہم نے بدستور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''سائیں جی۔ آپ اس بات کو رہنے دیں۔ نگہت بی بی شرمیلی لڑکی ہیں۔ یہ آپ کو صاف صاف نہیں بتاسکتیں۔ بس آپ

ان کے مسئلے کا کوئی حل سوچیں'' عامر نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔
''وہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اس کی ساس ٹھیک ہو جائے گی'' ہم نے عامر کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اتنی پر لطف گفتگو روک دی تھی۔
''مہربانی پیر سائیں۔ مہربانی۔ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہو گا'' نگہت نے ایک بار پھر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔
''ہم تمہیں تعویذ لکھ کر دیتے ہیں۔ اسے لے جاؤ اور اپنے گھر کے چولہے میں دفن کر دینا۔ تین دن بعد ایک اور تعویذ لینے کے لئے آنا۔ تمہیں تین بار ہم سے تعویذ لینا ہوگا'' ہم نے کہا اور اسے ایک تعویذ لکھ کر دیا۔
''بہت مہربانی سائیں۔ حکم کریں کیا نذرانہ پیش کروں'' نگہت نے انتہائی مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔
''ہم نذرانے کے قائل نہیں ہیں لڑکی۔ لیکن یہ کالو جادو کا مسئلہ ہے اس لئے ہمیں کچھ چیزیں شہر سے منگوانی پڑیں گی اس پر خرچہ ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ فی الحال دو ہزار دے دو۔ باقی جیسے جیسے خرچہ ہوگا وہ ہم تم سے لیتے رہیں گے'' ہم نے کہا۔
''ٹھیک ہے سائیں۔ یہ تین ہزار روپے رکھ لیں اور خرچے کی بالکل پرواہ نہ کریں۔ پیسے کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ بس میری ساس کو مجھ سے محبت ہو جائے'' نگہت نے تین ہزار روپے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''محبت کیا، تمہاری ساس تمہاری نوکرانی بن جائے گی اور تمہارا شوہر تمہارا غلام'' ہم نے کہا۔
''سائیں۔ شوہر تو پہلے ہی میرا غلام ہے۔ اگر ساس بھی کنیز بن جائے تو زندگی کا مزہ آ جائے گا'' نگہت نے خوش ہو کر کہا۔
''ہمارے پاس آ گئی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب جاؤ اور عیش کرو'' ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''شکریہ سائیں''...... نگہت نے کہا۔ پھر اس نے سلام کیا اور جانے لگی۔
''سنو نگہت'' ہم نے اسے آواز دی تو وہ رک گئی اور اس نے مڑ کر دیکھا۔
''جی سائیں۔ کوئی غلطی ہو گئی ہے سائیں'' نگہت نے پریشان لہجے میں پوچھا تو ہم نے انکار کے انداز میں سر ہلایا۔
''نہیں۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی بلکہ آج تم نے ہمارے لئے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔ شام میں بھنی ہوئی مرغی، دیسی گھی کی چوری، اور کچھ آم بھیج دینا'' ہم نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔
''جی بہتر سائیں۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کی میزبانی کروں'' نگہت نے کہا اور پھر وہ چلی گئی۔

☆☆☆☆

اُن دونوں نے شاید ہماری تعریف کچھ زیادہ ہی کر دی تھی کیونکہ اگلے دن صبح سے ہی ہمارے دربار میں رش لگ گیا۔ دوپہر تک سر کھجانے کی فرصت نہ ملی۔ گرمی کی شدت ہوئی تو لوگوں کا رش ٹوٹا۔ اب میں اور عامر اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔
''میرے خیال میں اب تمہیں دائرہ جاسوسی اردگرد کے دیہاتوں تک پھیلا دینا چاہئے اور اس کام میں تم اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی شامل کر لو'' ہم نے عامر سے کہا۔
''کیوں۔ میں کوئی قربانی کا بکرا ہوں'' عامر نے منہ بناتے

ہوئے کہا۔اسے پیر کی بجائے چیلا بننے کا افسوس تھا۔
''تمہیں ٹی اے ڈی ملے گا اور یہ جتنی رقم جمع ہو رہی ہے ہم سب کے کام آئے گی۔ میں تنہا تو اس کا مالک نہیں ہوں۔ تمہیں پتا ہے کہ ہم نو، دس ہزار روپے کما چکے ہیں اور شام کی شفٹ ابھی لگے گی اور جیسے جیسے ہماری شہرت پھیلے گی ہماری آمدنی میں اضافہ ہو گا'' ہم نے عامر کو بھاتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ او کے۔ میں اپنے کام کا دائرہ بڑھا دیتا ہوں'' عامر نے کہا۔
''ہوشیار۔ کچھ لوگ ریڑھی پر آ رہے ہیں'' عامر نے باہر دیکھتے ہوئے کہا تو ہم نے آنکھیں بند کیں اور ورد شروع کر دیا۔
''حق، حق، اللہ ہو، اللہ ہو، حق، حق''۔۔۔
''کرم دین کا گھرانہ ہے۔لڑکی کو دورے پڑتے ہیں'' عامر نے آہستہ سے کہا اور ہمیں کیس نمبر تین یاد دلایا۔ ہم نے اثبات کے انداز میں گردن ہلائی۔ کچھ دیر بعد ریڑھی ہمارے ٹوٹے پھوٹے دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔ ریڑھی دس گیارہ سال کا لڑکا چلا کر لایا تھا۔ دو ادھیڑ عمر عورتوں نے ایک بے ہوش لڑکی کو ریڑھی سے اتارا اور اسے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہم حسب معمول نیم وا آنکھوں سے ان کا جائزہ لے رہے تھے اور زبان سے ورد بھی جاری تھا۔ کچھ دیر بعد ہم خاموش ہوئے اور پھر آنکھیں کھولیں۔
''کرم دین خود کیوں نہیں آیا۔ کیا اسے اپنی بیٹی کی جان عزیز نہیں'' ہم نے ناراض لہجے میں ایک عورت سے کہا۔
''وہ۔ وہ سائیں شہر گیا ہوا ہے'' دوسری عورت نے جواب دیا۔شاید وہ کرم دین کی بیوی تھی۔
عامر نے ہمیں بتایا تھا کہ کرم دین دوسری شادی کے چکر میں ہے جبکہ اس کی اپنی لڑکی کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور کرم دین نے اس کی شادی نہیں کی کیونکہ وہ دیہاتوں کے رواج کے مطابق وٹہ سٹہ پر اپنی دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ کرم دین کی لڑکی کی سہیلیوں کی شادیاں بہت عرصہ ہوا، ہو چکی ہیں او اسے دورے پڑنے کی وجہ بھی شاید یہی ہو کہ اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔

''سائیں۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ اب میں آپ سے کیا کہوں'' کرم دین کی بیوی نے کہا۔
''ہونہہ۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری لڑکی چاندنی کو جن کب آتے ہیں'' ہم نے کرم دین کی بیوی سے پوچھا۔
''سائیں۔ کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے۔ جب ان کی مرضی ہوتی ہے آ جاتے ہیں'' کرم دین کی بیوی نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔ ہم اس کے جنوں سے بات کرتے ہیں'' ہم نے کہا تو کرم دین کی بیوی اور دوسری عورت نے لڑکی کو اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لٹا دیا۔
اب ہم نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو ہمارے ہوش اڑ گئے۔ وہ نام ہی کی چاندنی نہیں تھی بلکہ روپ کی بھی چاندنی تھی۔ لمبے لمبے سیاہ بال، سرخ و سفید رنگت، ستواں ناک، عنابی ہونٹ، میک اپ کے بغیر اتنا حسین چہرہ اس سے پہلے کبھی حقیقت میں تو نہیں دیکھا تھا البتہ رومانوی ناولوں کی ہیروئن کے بارے میں ضرور پڑھا تھا کہ وہ اتنی حسین ہوتی ہیں۔ ایسا دلفریب حسن دیکھ کر ہمارا دل واقعی فریب کھانے لگا بلکہ یہ کہا جاتے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ غٹر غوں غٹر غوں کرنے لگا۔ ہم نے لاحول ولا پڑھ کر اور خود کو تھپڑ مار کر دل کی یہ غٹر غوں بند کی۔ بے شک ہمارا نام قیس چلبلائی تھا اور ہم خود کو مجنوں کا ہم پلہ ہی سمجھتے تھے لیکن ہم پستیوں میں گرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے ہم پہلے کمرے میں آ گئے۔
''اس کے جن کافی زور والے ہیں لیکن کوئی بات نہیں ہم انہیں قابو کر لیں گے۔ اس سے پہلے کرم دین کو ٹھیک کرنا پڑے گا'' ہم نے کرم دین کی بیوی سے کہا۔
''سائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اگر آپ کرم دین کو ٹھیک کر دیں تو میں عمر بھر آپ کو دعائیں دوں گی'' کرم دین کی بیوی نے کہا اور چادر سے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔
''اس کا تو باپ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تم دو تین دن اور صبر کر لو'' ہم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد ہم نے پانی کا ایک گلاس لیا اور دوسرے کمرے میں آ گئے اور پانی کے چھینٹے چاندنی کے چہرے پر مارے۔ چند

لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس کے قہقہے سے ہم نے محسوس کیا کہ وہ اداکاری کر رہی ہے اور یہ محسوس کرتے ہی ہم نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ کی آواز دوسرے کمرے تک گئی کیونکہ کرم دین کی بیوی اور دوسری عورت دوڑتی ہوئیں اس کمرے میں آ گئیں۔ تھپڑ کھا کر پہلے تو چاندنی نے ہمیں گھورا پھر اس نے پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں قہقہہ لگایا۔

''تم جا کر ریڑھی پر بیٹھو۔ ہم اس کے جن قابو کرتے ہیں'' ہم نے سخت لہجے میں کرم دین کی بیوی سے کہا۔

''اچھا سائیں۔ اچھا'' کرم دین کی بیوی نے جلدی جلدی کہا اور پھر وہ اپنی ساتھی عورت کے ہمراہ چلی گئی۔

چاندنی بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔ ہم نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ ہمارے ہاتھ کانپنے لگے اور ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سینکڑوں چیونٹیاں ہمارے جسم میں رینگ رہی ہوں۔ ہم نے دل میں ایک بار پھر لاحول ولا پڑھا اور چاندی کو مزید ایک تھپڑ جڑ دیا۔

ہم جانتے تھے اور اکثر اخبارات میں پڑھتے بھی رہتے تھے کہ جعلی پیر جن نکالنے کے بہانے اپنی مریدنیوں کو بے آبرو کر دیتے تھے اور بعض تو ان میں ایسے سنگدل ہوتے تھے کہ اپنا مذموم مقصد حاصل کرنے کے بعد لڑکی کا گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے اور اس کارستانی کو جنوں کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے لیکن ہم کوئی پیشہ ور پیر نہیں تھے اور نہ ہی ہمارا دل اتنا سخت تھا کہ ہم کسی لڑکی کو بے آبرو کرتے۔ ویسے تو ہم قیس چلبلائی تھے اور عشق ہماری نس نس میں سمایا ہوا تھا۔ ہر حسین چہرے کو دیکھ کر ہمیں لوریا ہو جاتا تھا لیکن ہم کسی کی عزت کے قاتل نہیں بننا چاہتے تھے اور ایسے موقع پر عزت کا قتل تو معصوم اور بیگناہ عورت کے قتل پر مجبور کر دیتا تھا۔ عزت کا قاتل اپنا جرم چھپانے کے لئے جان کا قاتل بھی بن جاتا تھا۔

''تم مکر کرتی ہو اور وہ بھی ہمارے سامنے'' ہم نے جلال بھری آواز میں کہا لیکن چاندنی نے ہماری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

وہ قہقہے لگاتی رہی۔ ہمیں غصہ تو بہت آیا لیکن ہم برداشت کر گئے۔

''ہمیں سب معلوم ہے کہ تمہارے من کا دیوتا کون ہے'' جیسے ہی ہم نے کہا چاندنی نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا وہ صحیح نشانے پر لگا تھا۔ چاندنی کچھ دیر تک ہمیں دیکھتی رہی۔

''آپ تو پہنچے ہوئے ہو سائیں۔ لیکن بات آپ نے پرانی کی ہے۔ اب میرے من کا کوئی دیوتا نہیں'' چاندنی نے کہا۔

''کیوں۔ اب کیا ہو گیا ہے'' ہم نے کہا۔

''آپ جانتے نہیں ہیں یا میری زبان سے سننا چاہتے ہیں'' چاندنی نے ہمارے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی نظروں میں ایسا جادو تھا جو زاہد صد سالہ کا زہد بھی توڑ سکتا تھا اس لئے ہم نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔

''ہاں۔ ہم تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں'' ہم نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''میرے من کا دیوتا اب کسی اور کے من کا دیوتا بن گیا ہے۔

میرے والد کے مسلسل انکار کی وجہ سے اس کے والدین نے اس کی منگنی کہیں اور کر دی ہے اور میرا والد میرے وٹے پر اپنی شادی کرنا چاہتا ہے۔ سائیں! یہ مرد ہمیں بھیڑ بکری کیوں سمجھتا ہے۔ میری بکری لے لو اس کے بدلے میں اپنی بکری دے دو کیونکہ میری بکری مجھ پر حرام ہے تم پر حلال ہے اور تمہاری بکری تم پر حرام ہے اور میرے لئے حلال ہے۔ لہٰذا آؤ آؤ تبادلہ کر لیں۔ دونوں بکریوں کو حلال کر لیں" چاندنی نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور اس کا سوال ایسا تھا کہ میں جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میرے پاس اس کے سوال جواب تھا ہی نہیں۔

"میرا وعدہ ہے چاندنی۔ میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گا" ہم نے چاندنی سے کہا۔

"سائیں۔ آپ کیا کرو گے۔ میرے باپ پر تو دوسری شادی کا بھوت سوار ہے" چاندنی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میرا نام قیس چلبلائی ہے اور ایسے بھوت اتارنے کا فن مجھے آتا ہے" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی کوئی فائدہ نہیں سائیں۔ میرے دیوتا تو کسی اور مندر میں آباد ہو گیا ہے ناں" چاندنی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ صرف منگنی ہوئی ہے شادی تو نہیں ہوئی۔ میں تمہارے باپ کو انسان کا پتر بناتا ہوں۔ اس کے بعد تم اپنے من مندر کے دیوتا کو کہنا کہ اگر اس کی محبت سچی ہے تو وہ اپنے ماں باپ کو دوبارہ تمہارے گھر بھیجے" ہم نے کہا۔

"سائیں۔ کیا واقعی میرا باپ اپنا ارادہ ترک کر کے میری خوشی میری جھولی میں ڈال دے گا" چاندنی نے بے یقین لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ہم پر یقین نہیں ہے" ہم نے غصیلے لہجے میں کہا تو وہ ڈر سی گئی۔

"نن۔ نن۔ نہیں سائیں۔ ٹھ۔ ٹھیک ہے سائیں" چاندنی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اب ہم تمہیں تمہاری ماں کے ساتھ بھیج رہے ہیں۔ ہم نے تمہارے جن ٹھکانے لگا دیئے ہیں لہٰذا اب تم نے ڈرامے بازی

ضرورت برائے سیل مین

ایک معروف کمپنی کو چند قابلِ اعتماد اور ہنر مند سیلز مین کی ضرورت ہے جو موسمِ سرما میں ہماری کمپنی کے اُبلے ہوئے انڈے اور سبز قہوہ گلیوں میں بیچ سکیں۔ تنخواہ حسبِ قابلیت بشمول کمیشن فی انڈا۔

نوٹ: انڈا اُبالیں گے ہم۔ چھلکا آپ اُتاریں گے قہوہ بنائیں گے ہم۔ کپ دھوئیں گے آپ۔ تھرماس اور کولر کمپنی فراہم کرے گی۔

ارسلان بلوچ

نہیں کرنی۔ گھر میں بالکل ٹھیک ٹھاک طریقے سے رہنا ہے" ہم نے کہا۔

"آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر سائیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں" چاندنی نے اس مرتبہ مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

ہم اٹھ کر پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ ہم نے کرم دین کی بیوی کو آواز دی۔ وہ ریڑھی سے اتر کر اندر آ گئی۔

"ہم نے بتایا تھا کہ اس کے جن بہت زور والے ہیں لیکن ہم نے پھر بھی انہیں مار بھگایا ہے۔ اب چاندنی بالکل ٹھیک ہے۔ اسے لے جاؤ۔ انشاء اللہ تمہارا شوہر بھی ایک دو روز میں ٹھیک ہو جائے گا" ہم نے کرم دین کی بیوی سے کہا۔

"مہربانی سائیں مہربانی" کرم دین کی بیوی نے کہا پھر اس نے اپنے پلو سے پانچ پانچ سو کے کچھ نوٹ کھولے اور ہماری طرف بڑھائے۔ چاندنی کے حسن و جمال کو دیکھتے ہوئے ہمارا دل تو چاہا کہ نذرانہ قبول کرنے سے انکار کر دوں لیکن پھر سوچا کہ اگر گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو بھوکا مر جائے گا اور ویسے بھی عامر ہمیں دھمکی دے چکا تھا کہ اگر ہم نے کسی کا نذرانہ قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ ہمارے حصے سے کٹوتی کر لے گا۔

"بی بی۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن چونکہ تمہاری بیٹی کے جن بہت زور والے تھے اور ہم نے انہیں بھگا بھی دیا ہے۔ انہیں بھگانے کے بعد ہم نے کچھ صدقات دینے ہیں اس لئے یہ رقم لے رہے ہیں۔ تم یہ رقم ہمارے خلیفے کو دے دو"...... ہم نے کرم دین کی بیوی سے کہا تو اس نے وہ رقم عامر کے حوالے کی اور پھر وہ

چلی گئیں۔

''عامر۔اپنے ساتھیوں کو کال کرو۔وہ جنوں والے ماسک میک اپ لیتے آئیں۔ان دنوں ہمارے پاس جو کیس آئے ہیں ہم وہ کیس حل بھی کر دیں تاکہ ہماری شہرت اور دولت میں اضافہ ہو'' ہم نے عامر سے کہا۔

پھر اسی رات سب دوستوں نے ماسک میک اپ کئے اور گاؤں کے ان گھروں میں پہنچ گئے جن کی شکایات ان کے عزیز و اقارب نے کی تھیں۔انہیں جنوں کے روپ میں ڈرایا گیا اور پھر اپنے احکامات سنائے گئے۔ان میں سے کسی میں بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ہماری بات ماننے سے انکار کرتا۔

اگلے دن صبح ہی صبح کرم دین تقریباً دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور آتے ہی ہمارے پاؤں میں پڑ گیا۔

''سائیں، سائیں۔ مجھے بچالیں سائیں جی۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے'' کرم دین نے ہمارے قدموں میں لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا۔ہم نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا پھر وہ الٹ گیا اور رونے لگا۔

''رات تمہیں جن اٹھا کر لے گئے تھے۔وہ آج بھی آئیں گے اور تمہارا خون پی کر جائیں گے'' ہم نے درشت لہجے میں کہا۔

''اوہ۔آپ تو جانتے ہیں سائیں۔سب جانتے ہیں۔ مجھے بچالیں میں مرنا نہیں چاہتا'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں مر ہی جانا چاہئے کرم دین۔تم انسان نہیں ہو بیوپاری ہو۔اپنی بیٹی کے بیوپاری۔اسے بیچ کر اپنی شادی کرنا چاہتے ہو۔تم بے غیرت انسان ہو۔میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔دفع ہو جاؤ'' ہم نے غصے سے کہا۔

''اوہ۔سائیں آپ تو یہ بھی جانتے ہیں۔ٹھیک ہے سائیں۔اب یہ نہیں ہوگا۔مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کر دیں۔اب جہاں اس کی ماں چاہے گی وہیں اس کی شادی ہوگی'' کرم دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے۔تمہیں ان خونخوار جنوں سے نجات دلائیں گے'' اس مرتبہ ہم نے نرم لہجے میں کہا تو کرم دین کے چہرے کے تاثرات پھیل گئے۔

''مہربانی سائیں جی۔بہت بہت مہربانی'' کرم دین نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو ہم نے اسے ایک تعویذ لکھ دیا۔

''یہ لو۔یہ تعویز اپنے گلے میں ڈال لو۔اس کا اثر تین دن رہے گا۔ان تین دنوں میں تم اپنی بیٹی کی شادی کر دو۔اس کے بعد ہم آ کر ہم سے ایک اور تعویذ لینا۔اس کا اثر مستقل ہوگا'' ہم نے کہا۔

''شکریہ سائیں جی۔شکریہ۔میں غلام ہوں آپ کا'' کرم دین نے کہا اور پھر اس نے تعویذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''سائیں۔کچھ نذرانہ بھی ہے'' اس نے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے ہم پھونک ماریں گے اور وہ خوفناک جن بھاگ جائیں گے۔ہم نے تمہیں تعویذ لکھ دیا ہے اب وہ تمہارے پاس نہیں آئیں گے لیکن اپنا غصہ نکالنے کے لئے وہ ہم پر حملہ کریں گے اور ہمیں ان سے بچاؤ کے لئے بہت سے عمل کرنے پڑیں گے۔شہر سے بہت سی چیزیں منگوانی پڑیں گی جن پر بہت خرچہ آئے گا'' ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''سائیں۔یہ ایک ہزار ہے۔یہ رکھ لیں'' کرم دین نے کہا اور پھر اس نے جیب سے ہزار ہزار کے تین نوٹ نکالے اور ان میں سے ایک بوسیدہ نوٹ الگ کر کے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ہزار روپیہ رکھو اپنے پاس۔تم نذرانہ نہیں دے سکتے تو کوئی بات نہیں'' ہم نے منہ بنا کر کہا۔

''شکریہ سائیں۔ بہت بہت شکریہ۔ میں اب جاؤں سائیں'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔تم اب جاؤ اور ہم نے تمہیں جو تعویز دیا ہے وہ واپس دیتے جاؤ۔ ہمارا دماغ خراب ہے کہ ہم اپنے خرچے پر تمہاری جان بچاتے پھریں'' ہم نے غصیلے لہجے میں کہا تو اس کا منہ لٹک

گیا۔

''اچھا سائیں یہ دو ہزار رکھ لیں'' کرم دین نے لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ دو نوٹ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پانچ ہزار کا سامان آئے گا اور ایک کالا بکرا۔ سمجھے تم۔ اگر بندوبست ہوسکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جاؤ اور ہمارا وقت برباد نہ کرو'' ہم نے بدستور غصیلے لہجے میں کہا تو اس نے تینوں نوٹ ہماری طرف بڑھائے۔

''سائیں۔ اس وقت تو میرے پاس یہی تین ہزار ہیں۔ دو ہزار میں پھر دے جاؤں گا'' کرم دین نے کہا۔

''تمہارے گھر میں کالا بکرا موجود ہے وہ اور دو ہزار ابھی دے جاؤ تاکہ ہم آج رات ہی عمل کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں دیر ہو جائے اور جن اپنا وار کر جائیں۔'' ہم نے کہا۔

''ٹھیک ہے سائیں۔ جیسے آپ کا حکم'' کرم دین نے کہا اور پھر اس نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور چلا گیا۔

☆☆☆☆

ہمارا دربار خوب چل رہا تھا اور درجنوں کی تعداد میں لوگ روزانہ اپنے مسائل لے کر آ رہے تھے۔ ہماری شہرت اس گاؤں سے نکل کر اردگرد کے دیہات اور شہر تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شہری خواتین کی بڑی تعداد ہمارے پاس آ رہی تھی۔ شہری خواتین سے تو ہم خوب رقم بٹور رہے تھے۔ ہم اپنی چکنی چپڑی باتوں سے انہیں خوب لوٹتے۔ اب زیادہ تر ایسے لوگ آ رہے تھے جنہیں ہم جانتے نہیں تھے لہٰذا انہیں ان کے حالات اور مسائل کے بارے میں نہیں بتا سکتے تھے۔ اب ہم فیس ریڈنگ کرتے تھے اور اس کے مطابق محتاط انداز میں بات کرتے تھے۔ آنے والے افراد کے مسائل میں تقریباً پچاس فیصد مماثلت تھی۔ اس لئے بھی ہماری گاڑی نہ صرف چل رہی تھی بلکہ فل سپیڈ سے دوڑ رہی تھی۔ ہم روزانہ ہی دس پندرہ ہزار روپے کما لیتے تھے۔ کھانا پینا گاؤں کے لوگ کرتے تھے۔ روز دیسی گھی میں پکے ہوئے دیسی مرغ، دیسی گھی کی چوری، آم، مکھن، لسی، غرضیکہ خوب عیش ہو رہے تھے۔

ایک دن ہم دربار لگائے بیٹھے تھے۔ پانچ خواتین اور تین چار مرد ہمارے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک مرد ہماری ٹانگیں دبا رہا تھا اور ایک مرد ہمارے کندھے دبانے میں مصروف تھا۔ اتنی خدمت ہوتے دیکھ کر عامر کا موڈ خراب تھا۔ وہ اب اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے چیلا بننے کی بجائے پیر بننا چاہئے تھا۔ ہمیں ٹانگیں اور کندھے دبوانے کے ساتھ ساتھ ان عورتوں اور مرد پر غصے بھی ہو رہے تھے۔

اچانک دروازے کے قریب ایک کار آ کر رکی۔ کار سے ذلفی اور شاہد اتر کر تیزی سے ہماری طرف آئے۔

''سائیں۔ جلدی سے ہمارے ساتھ چلو۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ اٹھو اٹھو'' شاہد نے ہمارے بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جلدی چلو۔ پولیس آ رہی ہے'' شاہد نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا تو ہمارے ہوش اڑ گئے۔

''چلو چلو۔ تمہارے مریض کے جن نکالنے ہیں ہم نے'' ہم نے اونچی آواز میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھے۔

ہم چاروں جلدی سے کار میں بیٹھے اور پھر کار آگے بڑھی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ پولیس یہاں آ رہی ہے'' ہم نے شاہد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو میرے چاچا اے ایس آئی ہیں۔ میں ان سے ملنے تھانے گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے اس گاؤں میں جعلی پیر کی اطلاع دی ہے۔ پولیس پارٹی ریڈ کی تیاری کر رہی تھی کہ میں شاہد کے پاس پہنچا اور ہم نے کرائے پر کار لی اور تمہارے پاس آ گئے'' ذلفی نے کہا۔

''اب یہ وگ اور چوغہ بھی اتار دو۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس کی گاڑی ہمیں راستے میں ہی مل جائے اور پھر صرف تم دو کی بجائے ہم چاروں دھر لئے جائیں'' شاہد نے کہا تو ہم نے جلدی سے بڑے بڑے بالوں والی وگ اور چوغہ اتار کر کار کی کھڑکی سے باہر پھینک دیئے اور پھر بیک مرر میں دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے بال سیٹ کرنے لگے۔ ہم جیسے ہی گاؤں کی حدود سے نکل کر مین روڈ پر آئے ہمیں پولیس کا ڈالہ نظر آیا جو گاؤں کے کچے راستے پر اتر رہا تھا۔ ذلفی نے کار کی رفتار بہت تیز کر دی۔

حنیف سیّد

دانو، اپنے اپنے

کتنے سال ہوئے ہماری شادی کو؟'' وھائٹ اِسٹون نے میز پر کینوس بچھاتے ہوئے اپنی وائف اسنوبل سے دریافت کیا۔

''پورے گیارہ سال، پر کیوں.؟'' اِسنوبل نے کلرز ٹیبل پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تم نے اپنے بوائے فرینڈ سے ملوایا نہیں آج تک، مجھ کو!''

''میرا ہے ہی کہاں بوائے فرینڈ، کوئی .؟''

''پیار ہی نہیں کیا آج تک تم نے کسی سے؟'' وھائٹ اِسٹون نے رنگوں میں پانی ڈالنا شروع کیا۔

ہاں ڈارلنگ، کیا تو تھا، ایک سے۔''

''پھر؟'' وھائٹ اِسٹون نے رنگوں میں پانی ملایا۔

''لات ماردی، اُس کے۔''

''پر کیوں؟'' کینوس پر اُس نے ایک جگہ پیلا رنگ اُنڈیلا۔

''عزت لوٹنا چاہتا تھا، شادی سے پہلے ہی۔''

''مورکھ تھا یار! بہت ہی مورکھ؛ پر رہتا کہاں ہے وہ ؟'' پھر نیلا رنگ دوسری جگہ۔

''دریا پار۔''

''نام کیا ہے اُس کا؟'' ہرا رنگ تیسری جگہ۔

”پرموو۔“

”پرموو ملہوترا؟“ لال رنگ چوتھی جگہ۔

”ہاں وہی؛ پرتم کیسے جانتے ہو، اُس کو؟“

”بس..! یوں ہی۔“ وھائٹ اِسٹون نے ہاتھ کے پنجے سے ایک ایک کرکے رنگ کینوس پر لگانا شروع کردیے۔

”یہ بنا کیا رہے، ہو ڈارلنگ؟“

”نقشہ، زندگی کا، اوبڑ کھابڑ، بے ہنگم، اور دل آویز بھی۔“

”پر ہے کس کی زندگی کا یہ؟“ اِسٹونیل، اِسٹول پر بیٹھ گئی۔

”مورکھ ہو یار!“ وھائٹ اِسٹون نے مذاق اُڑایا۔

”کیوں ڈارلنگ ؟“

”تم پوچھتا ہے کس کی زندگی کا! سب کی زندگی کا، ساری دنیا کے لوگوں کی زندگی کا نقشہ ہے، یہ۔“

”کیا تمھاری زندگی بھی ایسی ہی ہے، ڈارلنگ؟“

”ہاں...! ہے، بالکل ہے۔ ہنڈرڈ پرسنٹ، ایسی ہی۔ اِسی نقشے کی طرح خوب صورت اور رنگین بھی۔ تم...! میری زندگی ایسی محسوس نہیں کرتیں کیا؟“

”کرتی ہوں یار..! لیکن صرف تمھاری۔ پر میری زندگی تو ایسی ہے نہیں!“

”ہے کیوں نہیں ڈارلنگ! لیکن تم کو اپنی زندگی کا رنگ دیکھنا نہیں آتا۔ میں دکھاتا ہوں تمھاری زندگی، تم کو۔ یہ دیکھو اپنی زندگی! ہے نا اِسی طرح کالی، اندھیری اور سونی بھی؟“ وھائٹ اِسٹون نے کینوس پر ایک جگہ کالا رنگ ڈال کر جلدی جلدی لیپ دیا۔

”ٹھیک کہتے ہو ڈارلنگ..! ہے ایسی ہی میری زندگی، بالکل ایسی ہی!“ اِسٹونیل اُداس ہوگئی۔

”لیکن تم چاہو تو اپنی زندگی کو رنگین بنا سکتی ہو، یار!“

”وہ کیسے ؟“

”یہ بتاؤ۔۔۔! سارے رنگوں میں تم کو کالا رنگ ہی کیوں پسند آیا؟“ وھائٹ اِسٹون نے دریافت کیا۔

”کیوں کہ ایسی ہی زندگی ہے میری۔ کالی، اُوبڑ، کھابڑ

اور اندھیری بھی۔ پر میں جس زندگی کا رنگ دیکھنا چاہتی ہوں، وہ تو ہے ہی نہیں، اِس میں!" اِسنوبل نے افسردگی ظاہر کی۔

"ہے کون سا رنگ وہ، جو اِس میں نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے، تو جو چاہو اُنڈیل لو، اِس میں۔"

"ڈارلنگ!" اِسنوبل کی آنکھوں میں نشہ چھا گیا اور وہ اُٹھ کر وھائٹ اِسٹون کی گود میں جُھول گئی، پھر وھائٹ اِسٹون نے اُس کو پہلو میں لیتے ہوئے کینوس اُوڑھ لیا۔ مانو رات کی سنہری چاندنی نے اُن کو اپنی آغوش میں جکڑ لیا ہو، مانو اُن کی رُوحیں سینکڑوں بے باک تتلیوں، پریوں، جگنوؤں اور خوش بوؤں کے گلستاں میں دل آویز موسیقی کی دھنوں پر رقص کر رہی ہوں۔

"کیا ہماری دنیا سنہری ہوگئی؟" کچھ دیر بعد اِسنوبل نے کینوس ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"رَب جانے، لیکن تم بدرنگی ضرور ہوگئیں۔" وھائٹ اِسٹون نے اپنا لباس درست کیا۔

"اور تم بھی۔" اِسنوبل نے بھی خود کو سنبھالا۔

"کون کتنا بدرنگا ہے؟ یہ تو آئینہ بتائے گا۔" وھائٹ اِسٹون نے کہا اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے اُٹھ کر آئینے کے روبہ رو پہنچ گئے۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو آئینے میں دیکھ کر قہقہوں سے سنسان حویلی کی دھجیاں اُڑا دیں۔

"ڈارلنگ! ہمارے ساتھ ہنسنے والی تیسری کلکاری بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا؟" اِسنوبل سنجیدہ ہوگئی

"ہاں۔۔۔! یہ تو ہے۔ اور اگر نہیں ہے، تو؟"

"تو کیا خاک زندگی ہے، یہ؟ اوبڑ کھابڑ اور بدرنگی بھی!"

"اُوبڑ کھابڑ، بدرنگی، کھٹی۔ کچھ میٹھی، یعنی کہ کھٹ مِٹھی، یہی تو زندگی ہے، یار!" وھائٹ اِسٹون نے سمجھایا۔

"ہُنّھ! اُوبڑ کھابڑ، کھٹ مِٹھی۔ زندگی!" اِسنوبل نے بھرپور طنز کیا۔

"ہاں..! یہی زندگی ہے، یار! اچھا دیکھو۔۔۔! جب تم سے چکّر چلا تھا میرا، تو ہم دونوں کالج چھوڑ کر کہاں جاتے تھے؟"

"لالو چاٹ والے کے یہاں۔"

"ہاں! اور تم وہاں مرچ منگوڑے، بریڈ پکوڑے اور دال کچوڑے، یعنی کہ سبھی کچھ گڈمڈ کرکے اور کھٹ مِٹھی چٹنی ڈال کر کھایا کرتی تھیں نا۔۔۔! یا کہ نہیں؟" وھائٹ اِسٹون نے اِسنوبل کو یاد دلایا۔

"وہی تو پسند تھی، مجھ کو۔"

"اِسی لیے نا! کہ گڈمڈ اور کھٹ مِٹھی تھی، وہ۔"

"یہ تو ہے۔"

"ہاں یار! سب آسانیاں ہوں تو زندگی دشوار ہو جائے، اب دیکھو نا پہاڑ سے برف پگھل کر پانی آبشار کی شکل میں گرتا ہے، پتھروں سے ٹکراتا ہے، دھوپ، دھول سے گزرتا ہے، کتنا میٹھا ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا؟"

"ہوتا ہے۔" اِسنوبل نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں! جس کو ہر کوئی شوق سے پیتا ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول۔ اِس کے برعکس تالاب کا سڑا جل، جس کو جانور بھی پینا پسند نہیں کرتے۔ ہے نا؟"

"ہاں، ہے۔"

"اسی طرح تمھارے چہرے پر بنی یہ اندرونی جھنش؛ تمھاری بیوٹی کو کتنا سوئٹی بنا رہی ہے، یار!" وھائٹ اِسٹون کا مُنہ اِسنوبل کے گالوں کی جانب لپکا۔

"ہٹو ڈارلنگ! مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا، یہ آرٹ دیکھو!" وھائٹ اِسٹون نے کینوس کے پاس آتے ہوئے آگے کہا "اِس میں ہے کیا؟ کچھ بھی تو نہیں، لیکن تم جانتی ہو یار کہ یہ پینٹنگ لاکھوں کی پسند بنے گی، کیوں کہ اِس میں سب کی پسند کے اپنے اپنے رنگ ہیں، کوئی ہرا رنگ دیکھے گا، تو کوئی نیلا۔ کوئی لال دیکھے گا، تو کوئی پیلا اور کوئی گلابی دیکھے گا، تو کوئی کالا بھی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ بدلاؤ چاہتی ہے، یہ دنیا۔ آج تم اسکرٹ ٹاپ میں کتنی پیاری لگ رہی ہو۔"

"اُس دِن تو بولا تھا جینز شرٹ میں پیاری لگتی ہو۔"

"اچھا، تو تم نے میری برتھ ڈے پر مجھے ساڑی بلاؤز نہیں پہنایا تھا، کیا؟" وہ مسکرایا۔

"ساڑی بلاؤز میں تو تم بہت پیارے لگے تھے، یار۔ کیا خوب تھے کانوں کے کنڈل اور ماتھے کی بندی۔ لپ اسٹک تو کیا خوب بول رہی تھی، ہونٹوں پر۔ اور تمھاری چوٹی دیکھ کر تو کتنے غضب کا طوفان چڑھ گیا تھا میرے دل و دماغ میں، تم اِسے کٹوانا کبھی مت۔"

"تم بھی چوٹی میں بہت پیاری لگوگی، یہ بوائے کٹ بال، تو چبھنے لگے ہیں مجھ کو، اَب۔"

"اِسی لیے تو انجلی کی برتھ ڈے پر اُس لمبے بالوں والی کو بڑے چاؤ سے گھور رہے تھے، تم۔"

"نہیں یار! تم غلط سوچتی ہو، اچھا بتاؤ! کیا میں تم سے پیار نہیں کرتا؟" وھائٹ اِسٹون نے سارے دانت نکال دیے۔

"کرتے ہو۔"

"تمھاری ہر خواہش کا خیال نہیں رکھتا؟"

"رکھتے ہو۔"

"دولت، گاڑی اور بنگلا نہیں ہے تمھارے پاس؟"

"پر ٹونی چاہیے مجھے تو۔"

"وہ بھی مل جائے گا۔"

"پر کب؟" "گیارہ سال تو ہو گئے ہیں، شادی کو۔"

"ابھی بارہ تو نہیں ہوئے، یار؟"

"نہیں۔"

"پہلے بارہ تو ہونے دو۔"

"یہ تو تم ہر سال، ایک سال بڑھا دیتے ہو۔"

"یہ تو وہی بڑھاتا ہے۔"

"کون؟"

"وہی جوتشی۔"

"وہ تو لالچ میں بڑھا دیتا ہوگا۔ تم ایک دم سے زیادہ کیوں نہیں دے دیتے اُس کو رقم۔"

"اچھا تو ابھی دے کر آتا ہوں۔"

☆☆☆☆☆

"دے آئے؟" وھائٹ اِسٹون، جب جوتشی کے یہاں سے لوٹا تو اِسنوبل نے چہک کر دریافت کیا۔

"دے آیا۔"

"کیا کہا، اُس نے؟"

"اُس نے کہا: "سال بھر کے اندر آجائے گا ٹونی۔"

"قسم سے؟"

"بائی گاڈ۔"

"اور کیا کہا، اُس نے؟"

"اور کہا: اپنے پرانے دوستوں سے سمبندھ بنا کر رکھو! لابھ ہوگا۔" وھائٹ اِسٹون نے بتایا۔

"یہ کیا ہے ہاتھ میں؟"

"تصویریں۔"

"مگر ہیں کِس کی؟"

"گرلز فرینڈز کی۔"

"پر تھیں کہاں یہ؟"

> مختارالدین احمد کراچی گئے تو پاکستانی ادیبوں نے اُنھیں تحفے کے طور پر کتابیں پیش کیں۔ وہ سب کتابیں احمد صاحب سجا کر میز پر رکھتے گئے۔ مشفق خواجہ کمرے میں داخل ہوئے تو میز کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے "احمد صاحب، آپ نے کافی ردّیاتِ کراچی جمع کر لی ہیں۔"

"فوٹوگرافر کے یہاں۔"

"لائے کیوں، ان کو؟"

"سمبندھ بڑھانے کے لیے۔ کمرے میں سجانے کے لیے، لابھ ہوگا۔" وھائٹ اِسٹون نے بنا جھجک بتایا۔

"اے، بھگوان! کیا واقعی تمھارے سمبندھ رہے، اتنی لڑکیوں سے؟" اِسنوبل نے تصویریں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ہاں، رہے تو!"

"اِس میں شادی سے پہلے کی کتنی ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں، سب بعد کی ہیں۔"

"تم تو کہتے ہو، تم ہی سے پیار کرتا ہوں۔"

"وہ تو کرتا ہوں۔"

"تو یہ سب کیا ہے؟"

"روز روز بریانی اچھی لگتی نہیں، یار۔! کبھی کبھی چٹنی کو بھی دِل کرتا ہے، ہے کہ نہیں؟"

"ہاں، ہے تو! پر ہے غلط یہ۔"

"غلط ولط کچھ نہیں یار۔ اب دیکھو ۔! اپنے مکان میں ساری کی ساری چیزیں وہی ہیں۔ ہیں نا وہی؟"

"ہاں ہیں۔"

"لیکن جس دن تم گھر کا ڈیکوریشن چینج کرتی ہو، سُوزگ ہو جاتا ہے یہ گھر۔۔۔۔ ہے کہ نہیں؟"

"یہ تو ہے!" اِسنوبل کا مُنہ جیسے کڑوا ہو گیا ہو۔

"بس اِسی طرح ساری دنیا چاہتی ہے بدلاؤ، اب دیکھونا! بوائز، اپنی گرلز فرینڈز کو اور گرلز، اپنے بوائز فرینڈز کو لبھانے کے لیے اپنے لباسوں اور رکھ رکھاؤ میں کس قدر بدلاؤ لا کر اپنی زندگی کو خوش گوار بنا رہے ہیں۔ تمھارا بوائے فرینڈ مورکھ تھا۔ آج شام اُس کے یہاں چلیں گے۔"

"نہیں؛ میں نہیں جاؤں گی، وہاں۔"

"جاؤ گی کیوں نہیں، یار! جُوتشی نے کہا ہے؛ پرانے دوستوں سے سمبندھ بنا کر رکھو! لابھ ہوگا۔ یہی تو مزہ ہے زندگی کا، کہ جیو اور جینے دو۔ اور سنا ہے کہ دریا پار کرو تو سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ ویسے میں نے ملہوترا کو فون بھی کر دیا ہے، کہ ہم دونوں آ رہے ہیں، سنڈے کو۔"

☆☆☆☆☆

"کون؟"

"میں ہوں، وھائٹ اِسٹون۔ یعنی کہ اِسنوبل کا ہسبنڈ۔ اِسنوبل بہت سیدھی ہے، بے چاری اور وفادار بھی۔ شادی کے گیارہ سال بعد بھی نہیں بھولی آپ کو۔" وھائٹ اِسٹون نے اندر داخل ہوتے ہوئے پرمود ملہوترا کو تفصیل سے بتایا۔

"اچھا اچھا، آیئے۔ آیئے صاحب!" پرمود نے دونوں کو بلا کر کمرے میں بڑی عزت سے بٹھالیا۔

"اور یہ ہیں، راگنی۔ یعنی کہ میری وفادار بیوی۔" پرمود نے بتایا اور راگنی مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"معاف کیجیے! کہیں دیکھا ہے، آپ کو!" اِسنوبل نے راگنی سے دبے لہجے میں دریافت کیا۔

"سوال ہی نہیں ہوتا۔ یہ کل ہی تو آئی ہیں، امریکا سے۔ یعنی کہ پورے دس سال بعد، اپنے بھائی کے پاس سے۔" پرمود نے بتایا، اور راگنی، وھائٹ اِسٹون کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"اگلے سنڈے کو آئیں، آپ لوگ بھی۔" گپ شپ اور چائے وغیرہ کے بعد وھائٹ اِسٹون نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا ضرور آئیں گے ہم دونوں، اگلے سنڈے کو۔" راگنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

"پرمود کے آنے سے پہلے راگنی کی تصویر ہٹا دو، ورنہ پہچان لے گا، وہ۔"

"پر اُس نے تو ہٹائی نہیں تھی تمھاری تصویر۔"

نورم خان

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

کچھ لوگوں کو ہر بات میں خواہ مخواہ کیڑے نکالنے کی عادت ہوتی ہے اور وہ بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آئے ، بکنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے مخدوم اور صوفی منش وزیرِ اعظم کی سواری کراچی آئی تو حسبِ عادت و روایت ہماری ایجنسیوں کے حفاظتی اہل کار اپنی درجنوں گاڑیوں کے گھیرے میں لے کرانہیں انکی منزل پر پہنچانے کی جنونی کیفیت میں مبتلا نظر آئے۔ انکی اس بیچارگی پر اظہارِ ہمدردی کی بجائے اعتراضات کی بھر مار سے ایک گونہ بیزاری سی محسوس ہوئی اور لوگوں کی بے حسی پر رونا آ گیا۔ اس وقت یہ تلخی مزید بڑھ گئی جب شام کو ایک حکومت مخالف چینل نے اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لئے نہ صرف جنابِ وزیر اعظم کی اسمبلی کے فلور پر وہ تقریر دکھانا شروع کردی جس میں انہوں نے حلفاً کہا تھا کہ وہ صرف تین چار گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ سرکاری سفر کرتے اور ڈرائیونگ بھی خود کرتے ہیں اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں ایسی بے لوث بے اعتنائی شاید ہی دنیا کا کوئی اور فرمانروا دکھا پائے گا۔

لیکن بجائے اسکے کہ اس پر ان کی تعریف کی جاتی اور وزارتِ عظمٰی کے دوسرے دعوے داروں کو اس روشن مثال کو گرہ میں باندھنے کا مشورہ دیا جاتا، مذکورہ چینل نے کراچی میں انکے حالیہ سفر پر درجنوں پولیس اور دوسری ایجنسیوں کی رنگ برنگی جلتی بجھتی بتیوں والی گاڑیوں کو اس طرح دکھانا شروع کردیا جیسے بے شمار ستارے اور سیارے اپنے مرکز کے مدار میں والہانہ گردش کررہے ہوں۔ صرف اس وِڈیو ہی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ پسِ پردہ صوتی اثرات یعنی رَننگ کمنٹری بھی جاری رہی:

''دیکھئے ناظرین !ان گاڑیوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے جو انہیں اپنے جلو میں لئے ہٹو بچو کا ہوٹر بجاتی معصوم شہریوں کو خوفزدہ کررہی ہیں اور یہ بھی دیکھئے ناظرین کہ جنابِ وزیرِ اعظم خود ڈرائیونگ اس لئے کررہے ہیں کہ انہیں بیش قیمت گاڑیوں کی ڈرائیونگ کا بے انتہا شوق ہے۔ بتایئے ناظرین انہیں کس نے حق دیا ہے کہ وہ شہر قائد کی سڑکوں پر فاتحانہ قبضہ کرکے بے بس شہریوں کو یرغمال بنائیں؟ ٹریفک میں پھنسے بے بس عوام، بوڑھوں ، عورتوں اور گرمی اور حبس سے بلبلاتے شیر خوار بچوں کی حالتِ زار ملاحظہ کریں اور ذرا یہ دیکھئے کہ ایدھی کے ایمبولینس میں کراہتے مریض اور تڑپتی حاملہ خاتون کا کیا حال ہوگیا ہے۔ کیسی بے چارگی......کیسی بے بسی ہے یہ......؟''

جب اس نیوز ریڈر نما اینکر اور اسکے پروڈیوسر نے یہ محسوس کیا کہ بات اب بھی نہیں بنی تو ایک قدم اور آگے جاتے ہوئے انہوں نے ''۱۰۔ڈاؤننگ اسٹریٹ'' پہ ریکارڈ شدہ کسی برطانوی

وزیراعظم کی رخصت کا منظر دکھانا شروع کر دیا کہ "دیکھئے! تاجِ برطانیہ کی یہ سادگی اور ہم جیسے غریب اور خیرات پر پلنے والے ایک مسکین ملک کے مسکین وزیراعظم کی یہ شان و شوکت۔" اس سے پہلے کہ اس چینل کی اس چھچھوری حرکت پر کوئی تبصرہ کیا جائے "۱۰۔ڈاؤننگ اسٹریٹ" کے بارے میں اتنا جاننا کافی ہے کہ یہ امریکی وائٹ ہاؤس، پاکستانی ایوانِ وزیراعظم یا ۷۰۔کلفٹن اور ۹۰۔عزیزآباد قبیل کی چیز ہے۔ عام فہم زبان میں اسے وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ کہا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے اسے سرکاری ایوان یا محل سمجھ لیں جسے فارسی میں "کاخ" بھی کہا جاتا ہے۔ اگر اسے اُلٹ کر پڑھیں تو لفظ "خاک" وجود میں آتا ہے۔ اتنا جاننے کے بعد آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے کہ ہمارے پاکستانی محلات اور کروفر کے مقابلے میں "۱۰۔ڈاؤننگ اسٹریٹ" پر خاک ہی ڈالنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اس تفصیل سے یہاں ہم اُس مشہور مثل کی یاد دلانا چاہتے ہیں جو صدیوں پہلے کسی دیسی ناسٹراڈیمس (فرانسیسی مفکر) نے ایک سچی پیش گوئی بطور مثل کے زبان زدِ عام کر ڈالی تھی۔ وہ مشہور مثل "چہ نسبت خاک را باعالمِ پاک" ہے یعنی خاک کو عالمِ پاک یعنی آسمان سے کیا نسبت؟ شروع شروع میں یہ "خاک" کی بجائے "کاخ" یعنی برطانوی محل کی طرف واضح اشارہ تھا جو غلط العوام کی وجہ سے صدیوں بعد "خاک" کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ تاہم مفہوم اب بھی واضح ہے کہ برطانوی محل یعنی "۱۰۔ڈاؤننگ اسٹریٹ" اور پاکستانی محلات میں کیا نسبت؟ یعنی خاک (برطانیہ) پاک (پاکستان) کی برابری کر ہی نہیں سکتا۔

اسلئے اے بھائیو! ان بے جا اعتراضات کو چھوڑو اور ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ آخر اقوامِ عالم میں ہمیں بھی اپنی عزت و حرمت اور رعب و دبدبہ دِکھانا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے یہاں دِکھانے کو بہت کچھ ہے مگر ہم تو کسی کو ٹھینگا بھی نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے اسے ہماری مجبوری سمجھو اور ان پُرشکوہ سواریوں پر معترض ہوکر بلاوجہ "ضمیر ضمیر" نہ کھیلو کیونکہ بقول استاذی عطاء الحق قاسمی "ضمیر کسی غلط کام پر روکتا نہیں، صرف اس کا مزا کرکرا کر دیتا ہے۔"

پھر یہ بھی سوچو کہ ہمارے رہبرانِ قوم اس عالمِ دہشت گردی کے ماحول میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے عوام کے درد کا درماں کرنے نکلتے ہیں تو کیا ہمارا اتنا بھی فرض نہیں بنتا کہ ہم چند سڑکوں پر چند گھنٹوں کی رکاوٹ برداشت کرلیں؟ ایسے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایمبولینس میں کسی مریض اور رکشے میں دردِ زہ سے تڑپتی کسی خاتون کی بے بسی دکھا کر احساسِ ترحم و بیزاری بڑھا کر دنیا والوں کو ہم کوئی اچھا پیغام نہیں دے رہے۔ دو چار گھنٹوں میں کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑتا۔ اگر خدانخواستہ کوئی ضدی بچہ اس دنیا میں وارد ہونے کی جلدی میں ایک رکشے ہی کا انتخاب کرلے تو تالیفِ قلب کے لئے ایسے بچوں کے والدین کی پہلے بھی سرکاری امداد کی جاچکی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ہمارے حکمران اس معاملے میں کسی کنجوسی سے کام نہیں لیں گے۔ آخر انواع و اقسام کے ٹیکس کیوں وصول کئے جاتے ہیں!

تاہم ہمیں ایک شبہ ہے۔ کہیں ایسے مریض اور اس طرح کی خواتین جانتے بوجھتے کسی شاہی سواری، معاف کیجئے، سرکاری سواری کے منتظر تو نہیں رہتے کہ اسی بہانے سرکارِ عالی دربار سے دو چار لاکھ روپے اینٹھ سکیں؟ اس لئے ان جیسوں کی حوصلہ شکنی کے لئے ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وی آئی پیز کی نقل و حرکت کے لئے شہری حدود میں ہیلی کاپٹرز استعمال کئے جائیں۔ ویسے تو ہیلی کاپٹر ہر جگہ اتر سکتے ہیں تاہم کسی جگہ ہیلی پیڈ کا مسئلہ ہو تو اس کا بھی ایک آسان حل ہے۔ کریں یہ کہ ایک وسیع و عریض مصنوعی ہیلی پیڈ زنجیروں سے باندھ کر چند دیوہیکل ہیلی کاپٹرز آگے آگے اُڑیں اور جہاں ظلِ سبحانی اور ان کے درباریوں کا دربار لگانا مقصود ہو، وہاں آناً فاناً یہ ہیلی پیڈ نصب کر دیئے جائیں۔ اللہ اللہ، خیر صلّی!

لو جی! ان ہڈحرام مریضوں اور ہر معاملے میں امداد مانگ کر عالیجاہوں کی خلوت و جلوت کے مزے کرکرا کرنے والی عورتوں کے شر سے چھٹکارے کا ہم نے ایک بہترین حل پیش کر دیا ہے۔ مگر اللہ کرے اس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو کوئلے سے گیس بنا کر بجلی پیدا کرنے کا مشورہ دینے اور اس کے لئے فنڈز لینے والے سائنس دانوں کی کوششوں کا ہو رہا ہے

ضیاء اللہ محسن

ڈوب مرنا چاہیئے

پچھلے دنوں ہمیں راوی کنارے جانے کا اتفاق ہوا ،اپنے ریڈیو پروگرام سے فارغ ہوکر ہم چند دوستوں کے ہمراہ پک اپ میں سوار ہوئے ،سردی اپنے عروج پہ تھی ، ہماری منزل تقریباً ۴۰ کلومیٹر دور تھی ،شمالی اور جنوبی پنجاب کے سنگم پہ واقع یہ مشہورِ زمانہ دریائے راوی ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ ،اور فیصل آباد کو سرزمینِ ساہیوال سے جدا کرتا ہوا گزرتا ہے۔دریائی علاقوں کے آس پاس رہنے والے باشندے بھلے مفلوق الحال ہوں ،مگر خوش مزاجی اور زندہ دلی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔اپنے پسماندہ علاقے کی مناسبت سے وہ بڑے فخر کے ساتھ ''راوی۔۔ناں کوئی آوی۔۔ناں کوئی جاوی'' کے نعرے الاپتے ہیں۔(یعنی ایسا علاقہ جہاں نہ کوئی آئے نہ کوئی جائے)

اِس یاترا سے قبل ہمارے ایک قیافہ شناس دوست سکندر نے ہمیں بتایا کہ ''دوستو! خوشخبری یہ ہے کہ بھارتی اور چند پاکستانی سیاستدانوں کی پوری کوشش کے باوجود ابھی بھی راوی میں کچھ کچھ پانی دکھائی دیتا ہے۔'' مگر۔۔یہ کیا ،ہم موقع پر پہنچے تو سب کچھ اس کے برعکس نکلا۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو سکندر کی وہ بات

کنارے پہ پہنچ کے دریا پر ہم نے ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ پانی کی عدم دستیابی کے باوجود ہمیں یوں لگا کہ جیسے بے چارے سکندر پہ گھڑوں پانی پڑ چکا ہو،راوی کے جھومتے ،گاتے اور اچھلتی لہروں کے نظارے تو دور کی بات ،چلو بھر پانی بھی وہاں دستیاب نہ تھا،بلکہ خشک اور بے جان دریا ہمارا منہ چڑا رہا تھا،وہ تو بھلا ہو ہمارے ان شاعر حضرات کا جو ایسی نازک صورت حال میں بھی ڈوبنے کے نت نئے مقام دریافت کرتے رہتے ہیں۔

اُس کی آنکھیں تو سمندر سے بھی گہری تھیں وصیؔ
تیرنا آتا تھا لیکن، ڈوبنا اچھا لگا

صد افسوس کہ ماضی میں ہماری قوم سے کئی بار جانے انجانے میں شاعر موصوف جیسی ''حرکتیں'' سرزد ہوتی رہی ہیں۔اور تو اور آج بھی وطن کے لئے جان نثاری و وفا شعاری کے دعوے تو خوب ہیں ،مگر عمل ندارد۔۔۔ایک طرف تو کٹ مرنے اور ملک کے لئے کچھ کر گزرنے کے نعرے۔۔تو دوسری جانب ملکی صورت حال پہ محض ڈوب مرنے کا ''جذبہ'' بھی ہماری قوم میں سے ختم ہو چکا۔حالانکہ ایسے کاموں میں زبانی کلامی ایک آدھ پیالہ پانی سے زیادہ کچھ خرچ نہیں آتا ،مگر یوں لگتا کہ قوم پہ منحوسی کے بعداب

کنجوسی کے سائے بھی گہرے ہونے لگے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہماری قوم چلو بھر پانی کا خرچ کرنے کو بھی تیار نہیں۔ ورنہ ماضی میں ایسا جذبہ ہر حساس دل میں مقید ہوا کرتا تھا۔ یقین نہ آئے ذرا اپنے محاوروں پہ ہی نظر دوڑا لیجئے۔ کئی بار ہم اپنی حرکتوں سے وطن عزیز کو یہ باور کروا چکے کہ

ہم تو ڈوبے ہیں ''وطن'' تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے

مندرجہ بالا سطور میں پانی کا ایک پیالہ تو ہم نے تکلفاً عرض کر دیا، حالانکہ یہاں تو بغیر پانی کے ڈوب مرنے کی مثالیں بھی ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہیں۔ آپ ۲۰۰۷ء کے کرکٹ ورلڈ کپ کو ہی دیکھ لیجئے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے گورے کوچ باب وولمر نے دن رات محنت کر کے ٹیم کو دنیا کی تیسری بہترین ٹیم بنا دیا تھا۔ لیکن جب پھل کھانے کا موسم آیا تو پوری ٹیم نے 'بے وفائی' کے وہ ریکارڈ بنائے کہ بے چارا باب وولمر غیرت کھا کر ''ڈوب'' مرا۔ اس کام میں کسی ایک کھلاڑی نے بھی اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے ایک بات تو واضح ہوئی کہ احساس زیاں یا اپنی حالتِ زار پہ ڈوب مرنے کا جذبہ جن قوموں میں مفقود ہو جائے وہ ترقی کے سہانے سپنے دیکھنے کی اہل نہیں ہوا کرتیں۔

خیر اس پہلو کو اگر کسی اور تناظر میں دیکھا جائے، تو ہو سکتا ہے یہ ہماری قوم کی دور اندیشی ہو، اور شاید اسی لئے ملک میں پانی کی قلت کے باعث قوم محاورۃً بھی ''ڈوب مرنے'' کی متحمل نہ ہو سکتی ہو۔ اس دن راوی کنارے پاؤں پسارے یہی بات بار بار ہمارے دل و دماغ پہ دستک دیتی رہی۔ ہمیں ڈاکٹر اقبالؒ بہت یاد

اِنہیں موزوں اوزار ملیں تو یہ ہر شے کا بیڑا غرق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

آئے، نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے فرمایا ہوگا ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اقبال جیسا دانشور جو ایک بار اسکول سے ہونے والی تاخیر کو بھی اپنے کھاتے میں امر کر گیا، ایسا دانشور آج اگر زندہ ہوتا تو معذرت کے ساتھ اپنا یہ شعر واپس لے چکا ہوتا۔ وجہ معلوم کہ فی زمانہ موجوں میں اضطراب تو در کنار، موجوں کا منبع و ماخذ یعنی پانی ہی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے، تو باقی کیا بچا، مطلب جب موجیں ہی نہیں تو اضطراب کیسا۔۔؟ ہاں۔۔۔البتہ موجیں اگر کہیں ہیں تو اس کی نشاندہی ہم کیے دیتے ہیں۔ بقول ہمارے اپنے ہی، (اقبال سے معذرت کے ساتھ)

ملک قائم ربطِ ڈالر کے سوا، اب کچھ نہیں
موج ہے سرکار کی ، دریاؤں میں تو کچھ نہیں

بات دور نکل گئی، دوران سیر ہماری ایک دو مقامی راوین سے بات ہوئی تو بولے "جناب! راوی کی شان و شوکت معدوم ہو رہی ہے، مگر حکومت کا راوی فی الحال چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ لیجئے آپ کو مزے کی ایک اور بات بتاتے جائیں، پچھلے پچاس سال سے یہاں کے مقامی لوگ حکومتوں سے یہی مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ بہتے راوی پہ ہمیں ایک عدد پل بنا دیا جائے، جو ساہیوال اور فیصل آباد کی دھرتی کو آپس میں ملا کر فاصلوں کو کم کر دے، لوگوں کو شکایت تھی کہ اس مطالبے کے باوجود کسی حکومت کے کان پہ جوں تک نہیں رینگی۔' ان سادہ لوح لوگوں کو کوئی بتائے کہ حکومت کے کان اتنے فارغ تھوڑی ہیں۔ اگر ہوں بھی تو بھلا حکمرانوں کے سر میں جوئیں کہاں سے آئیں گی۔؟ جو ان کے کان پہ رینگ سکیں۔"

شاید حکمرانوں کو راوی کے سوکھنے کا انتظار تھا۔ چناں چہ جب لوگ اپنی مدد آپ کے تحت پانی کی غیر موجودگی میں خشک دریا کو عبور کرنے لگے تو جلدی سے احسان عظیم کرتے ہوئے دریا کے اوپر بھاری بھر کم پل کھینچ دیا گیا۔ واہ رے سرکار،، تیری پھرتیاں۔ گزشتہ سے پیوستہ دورِ حکومت میں کچھ ایم این ایز نے دریائے راوی کی حالت زار پہ کافی واویلا مچا رکھا تھا۔ مگران کے منہ کو شوربہ "لگا کر سب کی بولتی بند کرا دی گئی، فوجی حکومت کی طرف سے گوادر پلاٹوں کی منڈی لگی تو راوی کے ان "ہمدردوں" نے بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ یہاں تک کہ میڈیا کو بھی کہنا پڑ گیا۔

اپنے سبھی تعلق، حکومت کے ساتھ رکھ
پیوستہ رہ صدر سے امیدِ پلاٹ رکھ

خیر جیسے تیسے ہم کڑوا گھونٹ بھرے راوی یاترا کے بعد واپس لوٹے۔ اگلے ہی روز حکومت کے ایک وزیر محترم کی جانب سے اہل پاکستان کو خبردار کیا گیا کہ پاکستان میں جنگلات کا رقبہ انتہائی کم رہ گیا ہے وجہ ٹمبر مافیا ہے جس نے اس معاملے میں اپنا مکروہ دھندا شروع کر رکھا ہے۔" دھت تیرے کی۔۔۔ اگلے چند ہفتوں بعد ایک اور وزیر با تدبیر کا فرمان آنکھوں کو "فرحت" بخش گیا۔ "پاکستان میں جلد ہی پانی کے شدید بحران کا خدشہ ہے۔" یا اللہ خیر۔۔۔یقین جانیے ارض وطن پہ جنگلات اور پانیوں کے سب بڑے دشمن تو ہم خود ہی ہیں، شاید اسی لئے

دشت تو دشت، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

پھر اسی پہ بس نہیں۔۔۔۔ حرکتیں بھی اپنی عجیب سی ہیں۔

اور سینٹ میں بھی دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

حرفِ آخر یہی کہ جس دن ہماری قوم نے اپنی حالت پہ شرم سے ڈوب مرنا سیکھ لیا، سمجھ جایئے اس روز "کارواں کے دل میں احساس زیاں پیدا ہو جائے گا، اسی روز ہم ترقی کا اصل مفہوم سمجھ پائیں گے۔ پھر تقدیر بھی انہیں قوموں کی بدلتی ہے۔

دیس کی عظمت کی خاطر، کچھ تو کرنا چاہیئے
ہیں بہت بگڑے، مگر اب تو سدھرنا چاہیئے
خشک ہوگئے سارے دریا بے حسی کی دھوپ سے
دھرنے والو! اس طرف بھی ایک دھرنا چاہیئے
اک منسٹر نے یوں کی، تعریف انکل سام کی
جس کا کھاتے ہو، اسی کا دم بھی بھرنا چاہیئے
ایٹمی طاقت ہیں محسن، ہاتھ میں کشکول ہے
ایک پیالہ لے کے پانی، ڈوب مرنا چاہیئے

شاہد آفریدی

میداں میں آیا شاہد خان
اب روئے گا دشمن کپتان
بالر کی بھی جائے گی جان
آدھے گھنٹے کا ہے مہمان
لیکن اس آدھے گھنٹے میں
رنزوں کا لائے گا طوفان
شاہد مارے چوکے چھکے
بالر کیسے روکے چھکے
اُونچی شاٹیں جھٹ پٹ کھیلے
شاہد ہُک کھیلے کٹ کھیلے
روئے نہرا اور بالا جی
اتنا مت مارو لالہ جی
کچھ میچوں میں ٹل جاتا ہے
لیکن جب یہ چل جاتا ہے
ہر بالر کو دَل جاتا ہے
دھونی کتنا جل جاتا ہے
پہلے ففٹی کرنا لالہ
تم پھر تیزی کرنا لالہ

عابد محمود عابد

نیلوفر فصیح نور

دو بیویوں کا شوہر

ہائے ہائے صد افسوس کہ تم پر ظلم یہ کیوں ڈھایا
کتنا چاہتی ہو تم اور میں تم پر ہی سوکن لے آیا
پہلی محبت کی ریکھا ہو ، میری پہلی بیوی ہو
میرے بچوں کی ماں ہو تم، میرے گھر کی رانی ہو
میرے سنگ جو گزرا ہے وہ دور سنہری یاد کرو
دیکھو تم رویا نہ کرو یوں آنکھیں نہ برباد کرو
ہاں ہاں آج بھی پیار تو سجنی ایک تمھیں سے کرتا ہوں
لیکن یہ ہے بات جدا کہ گھر میں کم کم گھستا ہوں
تم کو کیا معلوم کہ میرا دل تو یہیں پہ رہتا ہے
مِل آؤ اِک بار چلو ہر روز مجھے یہ کہتا ہے
میں پردیس میں خوش رہتا ہوں یہ کیا بات کہی تم نے
تم بس تم ہی رہتی ہو ہر آن خیالوں میں میرے
بچوں کی یاد آتی ہے، اِس گھر کی یاد ستاتی ہے
تم مجھ کو یاد آتی ہو، ہر بات مجھے تڑپاتی ہے
دِل تو بھر پایا نہیں لیکن جانا بہت ضروری ہے
مرد جو ٹھہرا میرا آج کمانا بہت ضروری ہے
چلو جی تم اب ہنس بھی دو، ہنس ہنس کر اللہ حافظ ہو
میں بھی سدھاروں، تم بھی دیکھو گھر کی ذمہ داری کو

او میری دو نمبر بیوی تو کیوں خفا ہے یوں مجھ سے
جب سے گاؤں سے لوٹ کے آیا ہوں میں ملنے کو تجھ سے
ہر ہر بات پہ موڑ کے منہ کو چپ کیوں سادھ سی لیتی ہو
کیوں یوں آڑھی ترچھی ہو کر منہ کو ڈھانپ سی لیتی ہو
مانا گاؤں گیا تھا لیکن دِل تو یہیں پر چھوڑ گیا
بس یہ سمجھ لینا تھا پگلی خود سے رشتہ توڑ گیا
لمحہ لمحہ مجھے ترا چہرہ ہی دِکھائی دیتا تھا
تیرے پہلو میں آنے کو دِل یہ دھائی دیتا تھا
تیری جواں قربت کی گرمی یاد آتی تھی ہر ہر پل
تیری باتیں تیری ہنسی بھی یاد آتی تھی ہر ہر پل
لطف نہیں تھا کسی بھی پہلو بات کوئی کیا خوش آتی
اُس بڑھیا کے پاس تو جانا سمجھو تھی اک خودسوزی
تیری خاطر جا ٹکرایا میں اپنوں بیگانوں سے
جیسے کشتی کوئی نکالے بپھرے ہوئے طوفانوں سے
تم جو میکے چلی گئیں تو رسوا ہو جاؤں گا میں
جانے دو جانے کی باتیں، کیسے بہل پاؤں گا میں
مان بھی جاؤ ظلم نہ ڈھاؤ مجھ پر ایسے جانم جی
ارے یہ چہرہ تو دکھلاؤ ،ہم ہیں تمھارے خصم جی

کبھی یہاں اور کبھی وہاں پر جو میں آتا جاتا ہوں
کبھی میں ایسے کبھی میں ویسے دِل اپنا بہلاتا ہوں
کبھی میں اُس کو کبھی میں اِس کو بیوقوف بناتا ہوں
دِل میں چھپا ہے میرے کیا، سپنے کیا کیا دِکھلاتا ہوں
پہلے پہل کے چند دِن تو ہنستا ہنساتا ہوں سب کو
رفتہ رفتہ پھر بیزار بھی میں ہوجاتا ہوں یارو!
نمبر دو کے پاس جو جاؤں تو پہلی کی یاد آئے
پہلی کے پہلو میں ہوں تو دوجی کی بھی یاد آئے
دونوں کو یکجا رکھنے میں خانہ جنگی کا ڈر ہے
بیچ بچاؤ میں میری جان کے جانے کا خطرہ ہے
شادی ایک ہو یا ہوں دو سمجھو جنجال ہے اس جی کا
دِل کا بھید جو کھل جائے ، خطرہ ہے ٹنڈ کی صافی کا
بات تو ہے پردے کی لیکن پھر بھی بتائے دیتا ہوں
پیار بہت ہے مجھ کو لیکن پیار میں خود سے کرتا ہوں

انجینئر عتیق الرحمٰن

مزا شادی کا یہ آیا

ہمارا شوق شادی کا ہوا ہے اس طرح پورا
کہ اب اک فرش ہی کیا ناک بھی رگڑائی جاتی ہے

کوئی ہم کو کرے نہ تنگ ، دکھتا ہے ہمارا انگ
کہ سارے گھر کی جھاڑو ہم سے ہی لگوائی جاتی ہے

مہارت میں اضافے سے بڑھی عزت ہماری ہے
ہو مرغی یا ہو مچھلی ہم سے ہی تلوائی جاتی ہے

نظر کی گو حفاظت مستقل کروائی جاتی ہے
مگر پھر بھی حسیں چہروں پہ ہی یہ پائی جاتی ہے

پریشاں کیوں ہو تم ، ہنڈیا ہی تو پکوائی جاتی ہے
یہاں تو منے کی لنگوٹ بھی دھلوائی جاتی ہے

ہنر مندی میں اپنا ہم کوئی ثانی نہیں رکھتے
ہمیں ہے علم نیپی کس طرح بدلائی جاتی ہے

نہیں جو جانتے تھے فن وہ ہم پہ کھل گئے سارے
ہوا معلوم بیوی کس طرح ٹرخائی جاتی ہے

فیس بک کی نظم

افتخار حیدر

تمام دنیا میں ہو کا عالم تھا
سب سخنور مرے پڑے تھے کہ نیند کا، نصف موت کا
وقت ہو چکا تھا
ادھر کسی شاعرہ نے ایف بی پہ نظم ٹانکی
وہ نظم کیا تھی فضول بے ربط، بے معانی سی چند سطریں
کہ جن کا سر تھا نہ کوئی پاؤں
مگر کچھ ایسی چمک تھی اس میں
کہ سب سخنور، ادب کے بے لوث کارکن
ہڑبڑا کے اٹھے کہ جیسے بستی میں صور پھونکا ہو شاعرہ نے
کسی نے اس نظم کو زمانے کا درد لکھا
کسی نے اس سے نئے جہانوں کی بات ڈھونڈی
کسی نے اس پر برائے تفریح ایسے لکھا کہ جس سے وہ
مہ جبیں، لچکتی ہوئی
ادائیں دکھا دکھا کر دفاع میں بات کر رہی تھی۔۔۔
بہت ہی پر مغز گفتگو تھی کہ آخرش بات علم کی تھی
عروسِ شعر و سخن سجانے کا مسئلہ تھا۔۔
اچانک افتاد ایسی آئی کہ شاعرہ جس کی نظم تھی
اس کے گھر کی بجلی چلی گئی اور
وہ سب سخن کے مجاہدوں کو بنا سلام و دعا کیئے
اپنے گرم بستر میں گھس گئی تھی۔۔
اور اب یہ منظر کہ ایک شاعر نے نظم لکھی ہے
فیس بک پر لگا بھی دی ہے
تمام بستی میں ہو کا عالم ہے سب سخنور مرے پڑے ہیں

احمد علوی

ہٹ دھرمی

چھوڑوں گا میں عوام کی تقدیر روک لو
جھوٹی کروں گا روز میں تقریر روک لو

باپو کو ڈائری سے ہٹایا ہے جس طرح
چھاپوں گا اپنی نوٹ پہ تصویر روک لو

سرحد پہ فوجیوں کو کھلاؤں گا پتلی دال
کاجو کی روز کھاؤں گا میں کھیر روک لو

جو میری بے وقوفی سے رکھے گا اختلاف
ڈالوں گا اس کے پاؤں میں زنجیر روک لو

گلمرگ میں، میں لاؤں گا کیرل کی گرمیاں
کیرل میں لے کے جاؤں گا کشمیر روک لو

بیگم کو اپنی لایا نہ سسرال سے کبھی
بیگم کو میں سمجھتا ہوں ہمشیر روک لو

اخبار ہو خلاف یا چینل کوئی خلاف
توتا ہمارا پھوڑے گا نکسیر روک لو

انصاف کی اڑاؤں گا ہر روز دھجیاں
خود ساختہ بنوں گا جہانگیر روک لو

نشترؔ امروہوی

شوہر کے فرائض

جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں
بیگم تھکی ہوئی ہیں ٹانگیں دبا رہے ہیں

برتن بھی دھو چکے ہیں کپڑے بھی دھو لئے ہیں
دو چار ساڑیاں ہیں دو چار تولئے ہیں
بچّوں کے پوتڑے بھی اب دھونے جا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

صبح کے وقت گھر میں کچھ ایسی ہڑبڑی ہے
بیگم کو بھی ہے جلدی بچوں میں بھگدڑی ہے
اسکول بس پہ لیکر بچّوں کو جا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

تنخواہ ہے نہ ہم کو ملتی ہے کوئی پنشن
پر نوکری کی کوئی ہم کو نہیں ہے ٹینشن
بیگم کما رہی ہیں ہم عیش اُڑا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

روٹین بس یہی ہے ہر روز کا ہمارا
گھر سے اُنہیں بٹھایا آفس میں جا اُتارا
پہنچا کے آگئے تھے اب لینے جا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

چلّی چکن سے رغبت بیگم کو ہے ہماری
بچّے یہ کہہ رہے ہیں ہم کھائیں گے نہاری
اس واسطے ہی دو دو ہنڈیاں بنا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

اب رات ہوگئی ہے بیوی تو سو رہی ہے
بیٹا تو سوگیا ہے پر بیٹی رو رہی ہے
ہم رات بھر ہر اک کو سو سو کرا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

چھٹّی ہے آج یوں بھی سب دیر سے اٹھیں گے
کب ناشتہ کریں گے اور لنچ کب کریں گے
سنڈے ہے اس لئے سب چھٹّی منا رہے ہیں
جو فرض ہے ہمارا ہم وہ نبھا رہے ہیں

آج کرنی ہے بات چوہے کی
ڈھیٹ کتنی ہے ذات چوہے کی

نصف بہتر جو رکھ گئی سالن
جیسے آئی بارات چوہے کی

کچھ تو نزدیک ہی نہیں آیا
اور تھی کچھ حیات چوہے کی

ڈر کے مارے نکل کے آیا نہیں
بل میں گزری تھی رات چوہے کی

بھاگ جاتا ہے دیکھ کر بلی
بس ہے اتنی بساط چوہے کی

ہم بھی سوٹی پکڑ کے بیٹھے ہیں
آج پکی ہے مات چوہے کی

ناک میں دم کیا گہر اس نے
یاد نسلیں ہیں سات چوہے کی

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

ڈاکٹر عزیز فیصل

دوستو
اب آپ سے کیا پردہ
جب بھی عشق کی رنگین گاڑی میں سفر کرنے کا موقع ملا
ہمیشہ ہجر کی بوگی میں ہی جگہ مل پائی
کبھی وصال کی تسکین آور سیٹ پر چند لمحے بھی بیٹھنے کا
موقع نہیں ملا

نامرادِ سفر کی انہیں صعوبتوں کے سبب
معدے کی بنجر دیواروں پر السر اُگ آئے
تیزابیت کو تو چیونگم سمجھ کر بے چارہ معدہ کب سے چبا
رہا تھا
اوجھڑی کے دھان پان وجود پر بھی چربی چڑھا بیٹھا
اور اب
سوزشِ جگر کی طرف کامیابی سے بڑھ رہا ہوں
پتے اور گردے میں پتھریوں کو اٹھانے کی سکت تو نہیں
تھی

بامرِ مجبوری
اپنے اُترے ہوئے کاندھوں پر
میر تقی میر کی طرح یہ دہرے پتھر اٹھائے پھرتا ہوں
بڑی اور چھوٹی آنتیں میری بسیار خوری پر آگ بگولہ
نہیں ہوتیں
کیونکہ اُنھیں تو میرے فربہ وجود کے گراونڈ میں
(رگبی کے گراونڈ جتنی کشادہ جگہ)
باہم اٹکھیلیاں کرنے کے لئے میسر ہے
دانتوں کے شہر میں کچھ پینڈو کیڑے
میری بدپرہیزی پر مجھے ہمہ وقت دعائیں دینے میں
مصروف رہتے ہیں

میرے دشمنوں کی کم ظرفی ملاحظہ ہو
آہ، حیف، تف
سب نے مجھے مریض مشہور کر رکھا ہے
دوستو!
انصاف آپ کریں
اگر میں واقعی بیمار شمار ہوتا
تو گزشتہ تیس برسوں سے شہر کے مرکزی حصے میں
مریضوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا مطب کس طرح چلا رہا
ہوتا؟؟

اور شہر بھر مجھے
معدہ، جگر، پتہ، گردہ اور دانتوں کے امراض کا
مشترکہ (فائیو ان ون) سپیشلسٹ تو نہ سمجھتا

شوہر کی فریاد

محمد خلیل الرحمٰن

ایک لڑکا بگھارتا ہے دال
دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دِن تھا کہ سورہا تھا تُو
وقت کو یوں ہی کھو رہا تھا تُو
گھر ترا تھا سکوں کا گہوارہ
اور تھا یہ گھر تجھے بہت پیارا
چائے پی پی کے تُو تھا لہراتا
دھوپ لیتا کبھی ہوا کھاتا
ایک امّاں تھی مہرباں تری
دِل سے کھانا تجھے کِھلاتی تھی
یوں تو گھر میں سبھی تھے، ماں باوا
تجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا تجھ کو پال پوس بڑا
کوئی تجھ پر کچھ ایسے آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ
زندگانی کو کردیا تلپٹ
یک بیک طے ہوئی تری شادی
تری دُلہن تھی یا کہ شہزادی
ہوگئی دَم کے دَم میں بربادی
چِھن گئی ہائے تیری آزادی
ایک ظالم سے یوں پڑا پالا
جس نے کولہو میں ہے تجھے ڈالا
کیا کہوں میں کہاں کہاں کھینچا
جیسے منڈی میں تجھ کو جا بیچا
پہلی تاریخ کو کمال کیا
تیری تنخواہ کو حلال کیا
نہ سنی تیری آہ اور زاری
خوب بیوی نے کی خریداری
پھر مقدر تجھے جو گھر لایا
اُس نے یاں اور بھی غضب ڈھایا
دھکّے دے کر کچن میں بھیج دیا
کام سارا ترے سپرد کیا
بولی امّاں سے، اے مری اماں!
یاں پہ بیٹھو ذرا، چلی ہو کہاں
کام کچھ بھی نہ اب کرو گی تُم
تھک چکی ہو تو سو رہو گی تُم
ڈالیں مرچیں نمک لگایا خوب
کی شکایت ، تو جی جلایا خوب
ہاتھ دھو کر پڑی تھی پیچھے یوں
تجھ کو کرنا تھا یوں ہی خوار و زبوں
تُو نے رو کر طلب کیا انصاف
ہائے بیگم ، مرا قصور معاف
کہا لڑکے نے میری پیاری دال
تجھ کو معلوم ہے مرا سب حال
وہ تو رتبہ مرا بڑھاتی ہے
جو پکاتا ہوں میں ، وہ کھاتی ہے
نہ ستاتا ، نہ جی جلاتا تھا
یوں مجھے آدمی بناتا تھا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مشینی حاضری

کیا وہ بھی زمانے تھے
آزاد دل و جاں تھے
ہاتھوں کی لکیروں سے
ہم اگلے زمانوں کی
کھوج میں رہتے تھے
ہاتھوں کی لکیروں نے
اب ہم کو کیا رسوا
قسمت بھی ہوئی کھوٹی
اور وقت کی بیڑی نے
پابند کیا ہم کو
ارشاد تھا افسر کا
اے شاعرِ مستانہ
تُو دیر سے آیا ہے
تنخواہ کٹے گی اب

شوکت جمال

شاعری کا کریش کورس

ٹھانی ہے گر، کریں گے بہر طور شاعری
اِس کے سبھی شروط کی لازم ہے پیروی

لہجے میں درد و رنج کی شدّت بڑھایئے
زلفوں کی جس قدر ہو طوالت بڑھایئے

جاری ہو منہ میں پان تمباکو کا کاروبار
اُچکن کسی بزرگ سے لے لیجیے ادھار

بچّوں کو گھر میں شور مچانے نہ دیجیے
بیگم سے جھگڑے مفت کے مت مول لیجیے

مشقِ سخن کا ہوتا ہے اس بات پر مدار
''آمد'' کے واسطے ملے ماحول سازگار

استاد شاعروں کی کتابیں ہوں طاق پر
پڑھنے کی اُن کو کوئی ضرورت نہیں مگر

غلطی سے بھی نگاہ نہ ڈالیں عروض پر
رہ جائیں گے بھٹکتے ہی ورنہ اِدھر اُدھر

پائیں گے داد آپ گلوکار ہوں اگر
بے وزن شعر لحن سے ہوتا ہے معتبر

برپا کریں محافل شعر و سخن مدام
جن میں صحافیوں کو بھی ہو دعوتِ طعام

اہلِ سخن سے ملنے میں لازم ہے اہتمام
کچھ ہوں قریب، کچھ کو فقط دور سے سلام

بزمِ سخن کہاں ہے، خبر واں کی لایئے
مدعو پھر اپنے آپ کو کروا کے آیئے

جلدی کا کام ہوتا ہے شیطان کا سدا
تاخیر سے پہنچنا ہے پنڈال میں ذرا

ناظم کو بار بار یوں آنکھیں دکھایئے
جیسے کہ کہہ رہے ہوں، ''ابھی مت بلایئے''

انجام کار جلسے میں آئے گا وہ مقام
دی جائے گی حضور کو جب زحمتِ کلام

ایسے اٹھیں کہ آپ کی تھی منتظر عوام
اور یوں چلیں کہ جیسے ہو دریا سبک خرام

وہ شان ہو کہ جیسے غزل کے ہوں بادشاہ
ہو حاضرین کو بھی عطا سرسری نگاہ

جھک جھک کے سامعین کو آداب کیجیے
پھر صدر محترم کی اجازت بھی لیجیے

ناز و ادا سے لیجیے دیوان ہاتھ میں
جیسے ہو شاعری کا دبستان ہاتھ میں

دیکھیں اُلٹ پلٹ کے اُسے پھر ورق ورق
اُستاد شاعروں کا ہے پیدائشی یہ حق

مائک پہ جا کے زور سے کھنکھاریے حضور
اعلان اپنے آنے کا فرمایئے حضور

پہلے بیان اپنے کچھ اوصاف کیجیے
دو چار بار اپنا گلا صاف کیجیے

مطلع اور ایک شعر کا کہہ کر مرے جناب
چھ سات تو گزار دیں غزلیں بلا حجاب

کہہ کر ''ہوئی ہے آج ہی نازل نئی غزل''
ناظم کو گھوریں، بیچ میں ڈالے نہ وہ خلل

جاری رہے پھر آپ کی غزلوں کا سلسلہ
پانی کا بیچ بیچ میں کیجے مطالبہ

''بس'' کا بھی گر اشارہ کریں صدرِ محترم
اُس وقت تک سنایئے جب تک ہو دم میں دم

کشکول بھی گلے میں کوئی ٹانگ لیجیے
ویسے ملے نہ داد تو پھر مانگ لیجیے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

پہلے تو اپنا ویٹ بڑھاتی ہیں بیویاں
پھر جم میں جا کے اس کو گھٹاتی ہیں بیویاں

پچاس کی بھی ہو کے یہ لگتی ہیں تیس کی
میک اپ کا ایسا جادو جگاتی ہیں بیویاں

کالج کے وقت میں تھیں وہ بے حد obedient
شوہر کو یہ بتا کے جلاتی ہیں بیویاں

کرتی ہیں پہلے عقل کا اندھا میاں کو یہ
پھر ان کو اپنے رُخ پہ چلاتی ہیں بیویاں

روتی ہیں ایک بار ہی خود رخصتی پہ یہ
شوہر کو ساری عمر رُلاتی ہیں بیویاں

بیٹے جو اپنی ماں کے اطاعت گزار ہوں
ان کو اپنی ماں سے لڑاتی ہیں بیویاں

غصے میں جن کے میاں ٹماٹر سے لال ہوں
ان سب کی گھر میں چٹنی بناتی ہیں بیویاں

ایسے تو ان کی ماں نے بھی ڈانٹا نہیں کبھی
شوہر کو جیسے ڈانٹ پلاتی ہیں بیویاں

شوہر نہیں ہیں بچے ہیں اُن کے جنے ہوئے
یوں شوہروں پہ حکم چلاتی ہیں بیویاں

جن ماہ رُخوں کو لائے تھے بیحد خوشی کے ساتھ
اُن سب کو دن میں تارے دکھاتی ہیں بیویاں

جاتی ہیں نوکری پر جو بچوں کو چھوڑ کے
شوہر سے اُن کی ٹیچی کراتی ہیں بیویاں

چلنے نہ دیں گھروں میں یہ شوہر کی شوہری
گھر میں یوں مارشل لاء لگاتی ہیں بیویاں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

روزہ خور سے مکالمہ

میں نے کہا کہ روزے رکھو گے تم اس دفعہ
بولا کہ اتنی بھوک کا قائل نہیں ہوں میں

میں نے کہا کہ سحری کا کھانا ثواب ہے
بولا کہ اس ثواب پہ مائل نہیں ہوں میں

میں نے کہا کہ ہم پہ تراویح فرض ہے
بولا کہ اس نماز کا قائل نہیں ہوں میں

میں نے کہا کرو گے تم افطار بھی نہیں
بولا اب اتنا کافرِ کامل نہیں ہوں میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

آلودگی کے مارے ہوئے ایک شخص نے
جا کر کہا حکیم سے سنئے مری بھی بات

ہے منفرد سا کیس مرا غور سے سُنیں
کچھ مسئلوں میں الجھی ہوئی ہے مری حیات

کھانے کے بعد بھوک ہی لگتی نہیں مجھے
سو کر اُٹھوں تو نیند نہ آئے تمام رات

ہوتی ہے کام کرنے سے پہلے تھکن مجھے
اِس خوف سے ہلاتا نہیں میں ذرا بھی ہاتھ

بولا حکیم پاؤ گے تم جلد ہی شفا
بس آج ہی سے دھوپ میں بیٹھو تمام رات

محمد عارف

ماہیے

مجھ کو تو جانو کہتی ہے
تم کو کہتی ہو گی لالا
جلنے والے کا منہ کالا

کل کی خبر نہیں تو کیا ہے
منصوبے تو ہیں صد سالہ
جلنے والے کا منہ کالا

تم ''چیچو کی ملیاں'' والے
میرے نام پہ ''عارف والا''
جلنے والے کا منہ کالا

اوپر پنکھا سوتا ہے
نیچے منا روتا ہے
اب یہ اکثر ہوتا ہے

والد ، بیٹا ، پوتا ہے
جمہوری سمجھوتا ہے
اب یہ اکثر ہوتا ہے

چڑے کی جا پر ہیں کوے
بکرے کی جا کھوتا ہے
اب یہ اکثر ہوتا ہے

حافظ مظفر محسن

پانچ کروڑ لے لو!

پہلی قسط

آج بارہ سال بعد اُس کا فون آیا۔اس دوران میری نہ تو اُس سے کبھی ملاقات ہوئی نہ ہی فون پہ بات،ان بارہ سالوں میں کوئی دن ایسا نہ تھا جب میں نے اُسے یاد نہ کیا ہو۔اُس کا فون آیا تو میں نے ''ہیلو'' کہا تو اُس کا مخصوص قہقہہ اُس کا تعارف کرانے کے لیے کافی تھا۔

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہماری گفتگو دو چار منٹ تک قہقہوں کے تبادلے پر ہی ختم ہوگئی۔۔۔ تیرہ سال پہلے اُس نے مجھے رات ایک بجے فون کیا اور حکم دیا کہ جتنے پیسے تیرے پاس ہیں وہ کسی کاروبار میں لگا لو ذرا بھی تاخیر مت کرنا ورنہ ساری زندگی پچھتاؤ گے کیونکہ اس وقت تمہارا ''ستارہ'' بارہ سال بعد پھر عروج پر آ گیا ہے۔

ایک رات جب میں اُس سے ملنے گیا تو ملازمہ نے آہستہ سے کہا ''بی بی جی اوپر ہیں،آپ چلے جائیں''

شدید گرمی کے موسم میں میں چھت پر چلا گیا وہ جائے نماز پر بیٹھی ایک بڑے سائز کی تسبیح پر کچھ ورد کر رہی تھی، مجھے دیکھا تو مسکرائے اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔میں چھت پہ بڑی دو کرسیوں میں سے بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا۔اس دوران آنکھیں بند کیے وہ آہستہ آواز میں کچھ پڑھتی رہیں نہ جانے کب ٹیک لگائے شدید گرمی کے باوجود میری آنکھ لگ گئی۔جب میری آنکھ کھلی تو وہ دائیں کرسی پر بیٹھی مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

آج اُس کا فون آیا تو اُس نے دو تین قہقہوں کے بعد محبت سے مجھے کہا ''بھائی فوت ہوگیا ہے وہی جو کسی انٹرنیشنل بینک میں مینیجر تھے؟''

''ہاں ہاں وہی طارق بھائی۔۔۔ مجھ سے بڑے تھے عمر میں اُن کو کینسر تھا جب آخری اسٹیج میں تھے تو میرے پاس آ گئے یا یوں کہہ لو کہ مجھے اُنہوں نے مجبور کر دیا کہ میں اُنھیں اپنے پاس بلا لوں ۔۔۔میرا یہ بھائی بڑا صحتمند اور جوان ہمت تھا لیکن کینسر نے اُسے کہیں کا نہ چھوڑا۔۔۔ میری بے بسی اور اُس کی پریشان حالی دونوں نے میرے گھر کو قبرستان جیسا بنا رکھا تھا۔آپ کے کئی فون آئے لیکن میں جواب نہ دے سکی کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنی رنگین زندگی کو ''تالا'' لگا کے کسی سمندر میں پھینک دوں۔ اس

دوران فائیو اسٹار ہوٹلوں سے رات گئے میری دوستوں کے فون آتے رہے لیکن میں اُن میں سے کسی سے بھی رابطہ قائم نہ کر سکی کیونکہ میں نے سوچا تھا اگر کبھی میں اپنی یہ قسم توڑوں گی تو سب سے پہلے آپ سے رابطہ کروں گی۔۔۔ اس دوران کینسر نے طارق کو کچل کر رکھ دیا آخری دنوں میں تو اُس کی گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی سنا ہے ہڈیوں کا کینسر جب آخری اسٹیج میں ہوتا ہے تو انسان کی ہڈیاں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں کریکس (Cracks) آ جاتے ہیں اور ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی جو جو ہڈی ٹیڑھی ہوتی جائے گی اُس کو سیدھا کرنے کی کوشش مت کیجئے گا ان کو کہیں زیادہ اذیت کا شکار ہونا پڑے گا بلکہ کہہ لیں نا قابل برداشت اذیت برداشت کرنا ہو گی۔ اس دوران وہ جب للچائی ہوئی اذیت سے بھرپور نظروں سے مجھے دیکھتا تو میں گھبرا جاتی ڈاکٹر کے مطابق میں ٹیکہ نکال کے بھائی کو خود ہی لگا لیتی کہ اُس کی درد میں کمی اور اذیت کا احساس کم ہو جائے۔

اس دوران ایبٹ آباد والے سردار نے مجھ پر کئی طرح کے وار کئے تم تو جانتے ہو سردار کس قدر ظالم آدمی ہے اُس نے مجھ سے شادی کے لیے کس طرح کا پریشر نہیں ڈالا؟ لیکن میں پوری ہمت سے اُس کا مقابلہ کرتی رہی اس دوران عصر کے بعد میری گردن

ہاہاہاہا۔۔۔ بھلا کبھی کسی ماں کا کام بھی ختم ہوا ہے؟

فرمودات زُبید بھائی

زُبید بھائی بتا رہے تھے کہ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھ لینا اچھی بات ہے۔ بلکہ یہ تو بہت اچھی بات ہے کیونکہ شادی سے پہلے ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لینے سے بندہ شادی سے بچ سکتا ہے۔

اعظم نصر

کے پٹھے کھچ جاتے اور جسم پر نیلے نشان پڑ جاتے میری دادی اماں بتایا کرتی تھیں کہ یہ جادو کی علامات ہیں۔

ایبٹ آباد کا سردار جادو ٹونے کا خود بھی ماہر ہے اور اُس نے کئی عورتیں اس کام کے لیے بھی رکھی ہوئی ہیں میرے سامنے جب میں ایک دفعہ اُسے PC Bhurban ملنے گئی تو وہاں اُس کے پاس میں نے اونٹ کا خون آلود دل دیکھا جس میں وہ چھریاں مار مار کے کچھ پڑھتا چلا جاتا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ کسی بیچارے کا بیڑہ غرق کرنے پر تلا ہوا ہے اُس نے بتایا تھا کہ وہ ارب پتی محض دنیاوی کاروبار کرنے سے نہیں ہوا اُس کے دنیا بھر میں سفلی علوم کے ماہرین سے تعلقات ہیں خاص طور پر ملائشیا اور انڈنیشا میں بسنے والے چینی جادوگر اُس کو پسند کرتے ہیں اور اس نے کئی گر اُن چینی جادوگروں سے بھی سیکھے تھے نیلم بلاک کی انور مائی اور فیصل آباد کے ریاض سائیں سے اُس کے دارینہ تعلقات تھے۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مذہبی لحاظ سے کسی ایک سلسلے سے وابستہ نہیں ان کا دین ایمان پیسہ ہے ان کو بے تحاشہ دولت چاہیئے اُس کے لیے چاہے اُن کا اپنا یا کسی دوسرے کا بیڑہ غرق ہی کیوں نہ ہو جائے اُنھیں کسی کو اذیت دے کے خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسے علوم اور ایسی چیزوں پر اندھا اعتقاد سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہ وہ دلدل ہے جس میں پھنس جانے والے کبھی بھی ہم نے باہر آتا نہیں دیکھا ایسے لوگ اب اس معاشرے میں آپ کو جگہ جگہ دکھائی دیں گے ایسے لوگوں کے موکل بھی لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور اُن کے نظریات بھی تقریباً اُن سفلی علوم کے ماہرین کی طرح کے ہی ہیں اور وہ بھی ہر صبح کی نئے "بابے" یا "ٹونے ٹوٹکے" کے ماہر کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور عقل کے ان اندھوں کو کسی اگلے موڑ پہ ایسا نام نہاد "سائیں" یا ماہر علمیات مل جاتا ہے گویا دونوں منفی قوتیں ایک دوسرے کو مل ہی جاتی ہیں اور دونوں کے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

ایبٹ آباد کے سردار کے پاسپورٹ پر میں نے بھارت، نیپال، ماریشش جیسے ممالک کے کئی کئی ویزے لگے ہوئے دیکھے وہ کہتا تھا کہ لوگ سمجھتے ہیں بنگال کے جادوگر دنیا میں اپنے کام کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جبکہ اُس کے بقول نیپال، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں ایسے کاموں کے ماہرین بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اُن کے موکل پاکستان سے کہیں زیادہ موجود ہیں اُس کے بقول انڈونیشیا، ملائیشیا اور نیپال میں تقریباً ہر دوسرا شخص ایسے منفی کاموں میں دلچسپی لیتا دکھائی دیتا ہے اگر وہ جادو ٹونے والوں کا گاہک نہیں تو اُسے کم از کم ہر دو چار ماہ بعد کسی ماہر نجوم یا پامسٹ کی تلاش ضرور کرنا ہوتی ہے پاکستان کے دو شہروں گجرات اور وزیر آباد کے ماہرین جو بنیادی طور پر چند نسل پہلے علم العداد کے ماہر سمجھے جاتے تھے جواب پیسے کے لالچ میں انڈونیشیا، ملائیشیا اور تھائی لینڈ میں جا بسے ہیں اور ان ممالک کے توہم پرست لوگ ان کو مخفی علوم کا سب سے بڑا ماہر یا نجومی سمجھتے ہیں اور اُن کے بتائے ہوئے راستوں پر آنکھیں موندھے چلتے رہتے ہیں چاہے یہ راستہ اُنھیں موت تک لے جائے یا اُن کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہے لیکن وہ ہر حال میں من مرضی کی بات جاننا چاہتے ہیں یا اپنے دشمنوں کو ہر حال میں نیست و نابود کر دینے کی خواہش لیے در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور کبھی بھی ہار نہیں مانتے، ہمت نہیں ہارتے......

یہ باتیں کرتے ہوئے فاطمہ کو محسوس ہوا کہ بات کافی لمبی ہو گئی ہے اس لیے اُس نے مجھے اپنے ساتھ نیچے آنے کو کہا جہاں اُس نے ایک الماری کا تالا کھولا جس میں ایک بہت بڑا شاپر تھا کالے رنگ کے اس شاپر میں جب اُس نے اُس کو کھولا تو لاکھوں روپے کے نوٹ موجود تھے۔۔۔ اُس نے خاصی سنجیدگی سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے مجھے آہستہ سے پوچھا "تم لو گے یہ پانچ کروڑ؟"

اقبال حسن آزاد

کاروبارِ نوٹس

جب میں نے مندرجہ بالا عنوان پر خامہ فرسائی کا ارادہ ظاہر کیا تو میرے دوست جناب قیصر اقبال بھتے سے اُکھڑ گئے۔ کہنے لگے کہ کاروبارِ نوٹس کی ترکیب غلط ہے کیونکہ کاروبار فارسی کا لفظ ہے اور نوٹس انگریزی کا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور! آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں بھی یہ رسم رہی ہوگی۔ جب سے ہندوستان کی سرزمین پر غیر ملکیوں کے قدم پڑنے لگے تب ہی سے بین النسل، بین المذاہب اور بین الفرقہ تراکیب ظہور پذیر ہونے لگیں تھیں۔ ہمارے وہ بزرگ حضرات جو حصولِ علم کے لئے انگلستان جایا کرتے تھے، ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک عدد میم لانا بھی فرض خیال کیا کرتے تھے اور تاویل یہ پیش کرتے تھے کہ صاحبِ کتاب سے نکاح جائز ہے۔ آج جو یہ گورے گورے، لمبے لمبے، نیلی آنکھوں والے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہاں وہاں نظر آتے ہیں وہ اسی ترکیب کے نتیجے ہیں اور جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو حضرت ولیؔ دکنی نے، جنھیں ولیؔ اورنگ آبادی اور ولیؔ گجراتی بھی کہا جاتا ہے اور جن کے مزار کو گجرات کی دنگائی حکومت نے راتوں رات پاٹ کر اس پر ایک شاہراہ تعمیر کر دی تھی، انہوں نے

آج سے تقریباً تین سوسال قبل فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے ایسے خوبصورت اشعار نکالے ہیں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کی سادگی اور تازگی دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ موصوف کی وضع کردہ تراکیب ملاحظہ فرمائیے۔شیریں بچن، تیغ پلک، صدائے بانسلی، چندن بدن وغیرہ۔ میرے دوست ڈاکٹر آفتاب احمد نے ایک دفعہ اردو فورم کی نشست میں ایک انشائیہ پڑھا جس میں ایک جگہ ''سالِ شمسی'' کی ترکیب استعمال کی گئی تھی۔ بعد میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے سالِ شمسی ترکیب غلط استعمال کی کیونکہ سال فارسی کا لفظ ہے اور شمسی عربی کا۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ نے ترکیب بھلے غلط استعمال کی مگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے شمسی نام کے ایک شخص سے اپنا کوئی حساب چکتا کیا تھا اور ان کے کہنے کا مطلب ''سالے شمسی'' تھا۔ اب تو خیر زمانہ کافی ترقی کر گیا ہے PURITY MUST BE MAINTAINED کہنے والے تو خال خال ہی ملتے ہیں۔ آج ''ترکیب'' کے لئے کسی نسل، قوم اور مذہب کی قید نہیں رہی۔ آج سید جلا ہے سے، شیخ کنجڑے سے، ملک پٹھان سے، ہندو مسلمان سے اور بابا منگ ناتھ اپنی شاگردہ سے مل کر مرکب ہو سکتے ہیں تو بھلا فارسی کا لفظ انگریزی سے کیوں نہیں؟

میری بات سن کر وہ چپ ہو رہے مگر ان کا چہرہ دیکھ کر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے خیال سے متفق نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان کے معاملے میں موصوف کا رویّہ کسی سخت گیر حاکم کی طرح ہے۔ اگر غلطی سے وہ کسی ایسی محفل میں پھنس جاتے ہیں جہاں غلط سلط زبان بولی جا رہی ہو تو اچانک ان کا نرم دکھائی دینے والا چہرہ کرخت ہو جاتا ہے، داڑھی اور سر کے بال کڑے ہو جاتے ہیں، چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی مہربان آنکھیں کچھ بڑی دکھائی دینے لگتی ہیں اور ان میں شعلے کوندنے لگتے ہیں۔ عام طور پر پرسکون دکھائی دینے والی ناک شدت غیظ سے پھڑکنے لگتی ہے اور ہونٹوں کو بھینچ کر وہ اتنی زور سے مٹھیاں جکڑتے ہیں کہ لگتا ہے کہ اردو کی مٹی پلید کرنے والے کو ابھی اُٹھ کر دو جھانپڑ رسید کر دیں گے۔ موصوف کے سامنے میں اپنے پاسبانِ عقل کو اپنی زبان کے آگے بٹھا دیتا ہوں تا کہ ان کے سامنے میرے منہ سے بہاری اردو کے الفاظ نہ جھڑنے لگیں اور ان کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہونے لگیں، لیکن ہر عاشق اردو کا رویّہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اردو کی درگت بنانے والے کی ہی درگت بنا دیتے ہیں۔ میرے برادر ڈاکٹر منظر اعجاز کا رویّہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ البتہ ان کا APPROACH کچھ ہٹ کر ہے۔ ایک دفعہ آپ کسی مشاعرے میں شریک تھے۔ اسٹیج پر ایک شاعر ہاتھ کو جھٹکے دے دے کر شعر پڑھ رہا تھا اور اشعار کو سامعین کی جانب یوں پھینک رہا تھا، جیسے کوئی پتھر پھینکتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کے ہر مصرع میں ''سکتہ'' تھا جسے سن کر باذوق سامعین کو جھٹکے پر جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ شعر ہی کیا جس میں ترنم اور روانی نہ ہو۔ اچھا شعر تو وہ ہے جو اگر تحت میں بھی پڑھا جائے تو موسیقی کا احساس ہو جیسے میرے اردو فورم کے معزز رکن مرزا مشکور بیگ پڑھتے ہیں مگر ان جیسا ہر شاعر نہیں۔ اپنے ہی شہر میں ایک شاعر اپنے بے وزن اشعار کو وزن میں لانے کے لیے ترنم کا سہارا لیتے ہیں، جسے سن کر بھائی قیصر اقبال اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ یہ حضرات وزن اور بحر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ شتر گربہ کا عیب تو عام ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں ''ہم'' ہے تو مصرعہ ثانی میں ''میں''۔ البتہ یہ حضرات ردیف اور قافیہ خوب سمجھتے ہیں اور ان کا سارا زور انہی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ کچھ شعراء اس انداز سے توڑ توڑ کر شعر پڑھتے ہیں جیسے قصائی گوشت کی بوٹی بوٹی کرتا ہے۔ انہیں دیکھ کر کسی لکھنوی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر یاد آ جاتا ہے ۔

یہ دل ہے، یہ گردہ، یہ کلیجی
قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

بہرکیف اس شاعر ناپختہ نے ایک بالکل ہی لنگڑا لولا شعر پڑھا تو جناب منظر اعجاز سے نہ رہا گیا اور انہوں نے زوردار آواز میں داد دی۔

''واہ! واہ! کیا خوب کہا ہے۔ مکرر، مکرر۔'' شاعر نے جھک کر سلام کیا اور حسبِ فرمائش شعر کو دوبارہ پڑھا۔ موصوف نے پھر ہانک لگائی۔ ''ایک بار پھر، ایک بار پھر۔'' شاعر کمر کے بل خم ہوا اور اس نے شعر کو پھر سے پڑھا۔ اس طرح موصوف نے بیچارے شاعر سے وہ

شعر پندرہ مرتبہ پڑھوایا۔ یہاں تک کہ سامعین کے ساتھ ساتھ شاعر بھی بور ہو گیا اور عاجزانہ انداز میں پوچھنے لگا ”جناب عالی! اس شعر میں ایسی کیا بات ہے جو آپ بار بار مجھ سے پڑھوا رہے ہیں؟“ موصوف نے ترسے جواب دیا ”سالے جب تک صحیح نہیں پڑھو گے پڑھواتا رہوں گا۔“

ہاں تو بات ہو رہی تھی کاروبار نوٹس کی۔ دراصل چند روز قبل عرفان صدیقی کا ایک شعر کہیں نظر آ گیا۔

بھلا یہ عمر کوئی کاروبار شوق کی ہے
بس اک تلافیٔ مافات کرتا رہتا ہوں

اب میں میری عمر بھی کاروبار شوق کی نہیں رہی اس لئے تلافیٔ مافات کے لئے کاروبار نوٹس کرتا ہوں۔ اللہ اللہ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب نوٹس کے نام سے طلباء کے کان نا آشنا تھے۔ لکچرار حضرات صرف لکچر دیا کرتے تھے۔ ہر لکچرار کے لکچر دینے کا انداز جداگانہ تھا۔ علامہ جمیل مظہری پٹنہ یونیورسٹی کے دربھنگہ ہاؤس میں آرام کرسی پر نیم دراز ہونٹوں میں سگریٹ دبائے شیروانی اور پائجامہ زیب تن کئے آنکھیں موندے لکچر دیئے جا رہے ہیں اور تشنگانِ علم ان کے ذریعہ ادا کئے گئے ایک ایک لفظ کو آب حیات سمجھ کر ہونٹوں سے لگائے جا رہے ہیں۔ حضرت کلیم عاجز اللہ ان کی عمر دراز کرے کرسی پر سیدھے بیٹھے سر پر ترچھی ٹوپی ڈالے کھڑ کھڑ کرتا پائجامہ پہنے اس قدر آہستگی کے ساتھ علم کے موتی لٹاتے کہ بہرہ تو بہرہ کان والا بھی ان سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا تھا مگر پھر بھی پوری کلاس میں ایک مقدس خاموشی چھائی رہتی، جیسے تکریم کا وقت یہی ہو۔ اگر چچا غالب ان کے شاگرد ہوتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے۔

بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

پروفیسر یوسف خورشیدی اپنے لکچرز کو گل افشانیٔ گفتار کی جگہ اشعار گہر بار سے سجاتے تھے اور ہر شعر کے بعد فرماتے ”دیکھیو؟“ یعنی دیکھا؟ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ پورے پیریڈ میں صرف اشعار پر مشتمل لکچر دے سکتے ہیں۔ مولانا آزاد کالج کلکتہ کے پروفیسر شاہ مقبول احمد جن کا کلاس ہمیشہ دو بجے کے بعد ہوتا تھا ان کا انداز یہ تھا کہ ”داستان تاریخ اردو“ کھول کر بیٹھ گئے اور با آواز بلند کوئی باب پڑھنا شروع کیا۔ ادھر ہم لوگ ڈائمنڈ ہوٹل سے شکم سیر ہو کر لوٹنے کے بعد کھڑکی سے آ رہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں نیند کے جھونکے لیا کرتے۔

تو یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکے لکچر سن کر دماغ میں محفوظ رکھتے تھے اور پھر امتحان گاہ میں بقدر پیمانہ تخیل اپنے اپنے طور پر جوابات حل کرتے۔ ہر لڑکے کی تحریر ایک دوسرے سے جدا ہوتی اور اسی اعتبار سے انہیں نمبر دیئے جاتے۔

پھر زمانہ بدلا اور تعلیم کا معیار گھٹنے لگا تو طلباء نے اساتذہ سے فرمائش کرنی شروع کی کہ آپ جو جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں اگر اسے لکھوا دیا جائے تو بہتر ہوتا۔ چنانچہ اب یہ ہونے لگا کہ اُدھر لکچر ہو رہا ہے اور ادھر لڑکے اسے سرعت کے ساتھ اپنی کاپی میں اتارتے جا رہے ہیں۔ یہ زمانہ بھی ختم ہوا اور اب انہوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ سر! آپ ہی نوٹس بنا کر لکھوا دیں۔ ہم سے یہ کام نہیں ہو پا رہا ہے۔ چنانچہ اساتذہ اب نوٹس تیار کرنے لگے۔ اب یوں ہونے لگا کہ استاد نوٹس لکھوا رہا ہے اور لڑکے لکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ لی اور وہ یہ کہ اب لڑکوں کو DICTATION لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ لہٰذا اب ان کا مطالبہ یہ ہوا کہ سر! آپ ہمیں نوٹس دے دیں ہم اتار لیں گے۔ یہ زمانہ بھی رخصت ہوا اور فوٹو اسٹیٹ کا زمانہ سامنے آ گیا۔ اب نقل کرنے کی زحمت کون گوارا کرے بس نوٹس پر نوٹس چھپنے لگے اور طلباء ہر غم و فکر سے آزاد ہو گئے۔

یادش بخیر! جب ہم ایم اے میں پڑھتے تھے تو ”ہم“ یعنی ہم اور میرے دوست جناب فاراں شکوہ یزدانی جو آج کل متھلا یونیورسٹی میں استاد کے فرائض انجام دے رہے ہیں نے بہت سارا خون جگر کھپا کر اور آدھی رات کا چراغ جلا کر ایم۔اے۔ کے نوٹس تیار کئے جس کا خاطر خواہ صلہ ملا اور ہم دونوں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو گئے۔ بندہ فرسٹ کلاس فرسٹ اور فاراں فرسٹ کلاس سیکنڈ۔ رزلٹ نکلنے کے بعد ایک صاحب نے عاجزانہ لہجے میں مجھ سے وہ نوٹس طلب کئے۔ میں نے سوچا کہ جب ڈگری ہاتھ میں اور پڑھا لکھا دماغ میں محفوظ ہے تو پھر بھلا اب نوٹس کی کیا ضرورت؟ اور میں نے بے دریغ اپنا سارا مال و متاع ان کے حوالے کر دیا۔ چند ماہ بعد جب میں دوبارہ پٹنہ گئے تو معلوم ہوا کہ میرے نوٹس HOT CAKE کی طرح

دل لگانا

محبت کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بہت سوں کا کہنا ہے کہ محبت وہ بیماری ہے جو شادی کا کڑوا گھونٹ پینے ہی سے ختم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں دل لگانے کا مشورہ بہت ہی چھوٹی عمر میں مل جاتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں۔

''بیٹا دل لگا کر پڑھا کرو۔''

نظام الدین

فروخت ہو رہے ہیں۔ پہلے تو مجھے بہت غصہ آیا پھر میرے کاروباری دماغ میں یہ خیال آیا کہ اچھا! اس طرح بھی پیسے کمائے جا سکتے ہیں۔ آپ کو لفظ ''کاروبار'' پر ہنسنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفی ﷺ بھی کاروبار ہی کا فرمایا کرتے تھے۔ بہر کیف! جب میں اس شہر من گیر میں وارد ہوا تو یہاں کی صورت حال دیکھ کر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ دو مختلف جوتوں کی کمپنی نے اپنے اپنے سیلز مین ایک جزیرے پر بھیجے تاکہ وہاں جوتوں کے بزنس کے امکانات کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ دونوں پانی کے جہاز سے وہاں پہنچے۔ وہاں کوئی بھی شخص جوتے نہیں پہنتا تھا۔ یہ دیکھ کر پہلے سیلز مین نے اپنی کمپنی کو تار بھیجا ''یہاں کوئی جوتے نہیں پہنتا ہے۔ میں واپس آ رہا ہوں۔'' دوسرے سیلز مین نے اپنی کمپنی کو لکھا ''یہاں کوئی جوتے نہیں پہنتا ہے۔ اگلے جہاز سے دس ہزار جوڑے جوتے بھجوا دیں۔''

تو میں جب اس شہر میں پہلے پہل آیا تو پایا کہ یہاں اردو کے اساتذہ تو موجود ہیں مگر پڑھاتا کوئی نہیں ہے۔ پڑھاتے بھی کیسے؟ اسکول سے نکل کر کالج تک پہنچنے والے طلباء اردو سے نابلد اور تہی دست ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ مغز پچی کرنے کے لئے کوئی پروفیسر روادار نہ تھا۔ سو میں نے میدان خالی دیکھ کر کاروبارِ نوٹس شروع کر دیا INTRODUCTRY OFFER کے تحت کافی دنوں تک مفت خدمت خلق انجام دیتا رہا۔ پھر مارکیٹ ڈیمانڈ کے پیش نظر نوٹس کی تجارت شروع کی۔ آپ نے ایسے اشتہارات ضرور دیکھے ہوں گے جن میں کہا جاتا ہے BUY THREE GET ONE FREE یا پھر توتھ پیسٹ کے ساتھ برش فری، صابن کے ساتھ شیمپو فری۔ کاش بیوی کے ساتھ ایک عدد سالی بھی فری ملتی تو بیوی کو ڈھونے کا غم کچھ کم ہو جاتا۔ بہر کیف اسی طرح میں نے بھی اردو آنرز کے ساتھ M.B فری کر رکھا ہے۔ میرے بعض کرم فرما یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کے پروفیسر حضرات کا کام محض خدمت خلق انجام دینا اور قوم کے بچوں کو مفت میں اردو کی تعلیم دینا ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے۔

''آپ کو شرم نہیں آتی؟ نوٹس بیچتے ہیں۔''

بندے نے عرض کیا کہ جناب والا! جب ڈاکٹر حضرات سیمپل کی دواؤں کے ساتھ ساتھ انسانوں کا خون اور گردے تک بیچ رہے ہیں، انجینیئر حضرات سرکاری سمنٹ اور بالو بیچنے میں نہیں چوک رہے ہیں ELECTRONIC PRINT MEDIA یا MEDIA سچی جھوٹی خبریں بیچ رہے ہیں، اعلیٰ افسران اور جج صاحبان اپنا ضمیر بیچ رہے ہیں اور سیاست داں اپنا دھرم اور ایمان بیچ رہے ہیں تو ایسے میں اگر میں اپنی محنت سے تیار کیا گیا نوٹس بیچ رہا ہوں تو اس میں کون سا گناہ ہے؟ اور پھر میں اپنے نوٹس پان، بیڑی، سگریٹ کی طرح نہیں بیچتا ہوں، طالب علموں کی باضابطہ کلاس لیتا ہوتا ہوں۔ ان کی زبان درست کرتا ہوں۔ ان کا املا اور جملہ صحیح کرتا ہوں۔ انہیں تذکیر و تانیث اور جمع واحد کا فرق سمجھاتا ہوں۔ صحیح قرآت کے ساتھ اشعار پڑھنے اور انہیں تقطیع کرنے کا طریقہ سمجھاتا ہوں اور پھر انہیں داغ کا یہ شعر سناتا ہوں۔

نہیں داغ آسان یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ چند پروفیسر حضرات تو 'کاٹو اور ساٹو' CUTTING AND PASTING پر یقین رکھتے ہیں۔ ادھر ادھر سے جڑ جڑ کر نوٹس تیار کر لیتے ہیں اور پھر کسی پبلشر کی مدد سے اسے شائع کرا لیتے ہیں جس کے سرورق پر جلی حرفوں میں تحریر ہوتا ہے ''ایک تجربہ کار پروفیسر کے قلم سے۔'' امتحان میں شریک ہونے والے طلباء امتحان کے روز سے خریدتے ہیں، اور کام نکل جانے کے بعد اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پھینک دیتے ہیں۔

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ایک دفعہ میرے پاس ایک طالبہ آئی اور اس نے دریافت کیا ''سر! آپ بی۔ اے آنرز پارٹ ون کے نوٹس کے کتنے پیسے لیتے ہیں؟''

میں نے کہا ''بی بی! میں پڑھاتا ہوں' اپنے نوٹس نہیں بیچتا اور جو مجھ سے پڑھتا ہے اسی کو نوٹس دیتا ہوں۔''

اس نے کہا ''اردو تو اپنا لینگویج ہے۔ اس میں پڑھنا کیا؟''

میں نے جواب دیا ''تو پھر میرے نوٹس کی ضرورت بھی کیا؟ بک کارنر میں چھپے چھپائے نوٹس دستیاب ہیں۔ جا کر خرید لو۔''

میں نے جس وقت اپنا کاروبار شروع کیا تھا اس وقت فوٹو اسٹیٹ کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ غنیمت تھا کہ طلباء نوٹس کی کاپی کر لیا کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کے میرے نوٹس کی تجارت دوسروں کے ذریعہ ہونے لگی۔ اس راز کا انکشاف اس وقت ہوا جب ایک اجنبی لڑکا میرے پاس آیا اور اس نے کچھ جھجکتے ہوئے' کچھ شرماتے ہوئے مجھ سے کہا کہ سر! ذرا آپ یہ نوٹس چیک کر لیجئے۔ پہلے تو جی میں آیا کہ اسے چلتا کردوں۔ نہ جانے کس کا نوٹس اٹھا لایا ہے' لیکن یہ میرے تجارتی اصول کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے نوٹس اس کے ہاتھ سے لے لئے اور اسے چیک کرنے کے لئے اس پر نظریں دوڑائیں۔ سوال دیکھ کر ہی سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ لکھا تھا' مومن کی ہمزل گوئی پر روشنی ڈالئے۔ مجھے یاد آیا کہ میرے شاگردوں میں ایک لڑکا MODERN ART سے کافی دلچسپی تھی اور وہ حروف کو اپنے تئیں خوبصورت بنانے کے چکر میں گھما گھما کر لکھتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ میرے تیار کردہ نوٹس تو نہیں؟ میں نے جب آگے پڑھنا شروع کیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دوبارہ سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ میری تحریر مختلف ہاتھوں سے گزرتی ہوئی کسی عمر رسیدہ' سرد و گرم چشیدہ اس آبرو باختہ عورت کی طرح ہوگئی تھی جس کے خدوخال امتداد زمانہ سے اس قدر مسخ ہوگئے ہوں کہ اسے پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔ مومن پر تیار کیا گیا نوٹس نہ جانے کن کن حادثات و سانحات سے گزرتا ہوا خواجہ میر درد کے اس شعر کی تفسیر بن گیا تھا ؎

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہیں معلوم ہے یہ کس کا لکھوایا ہوا نوٹس ہے؟

اس نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا ''جی سر! آپ کا۔''

''تمہیں کہاں سے ملا؟''

''فلاں لڑکے سے خریدا ہے۔''

''مجھ سے براہ راست کیوں نہیں پڑھا؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ سر بہت پیسہ لیتے ہیں۔''

میں نے نوٹس اس کے منھ پر پھینکا اور پروفیسر مہدی علی کے تیور میں بزبان انگریزی گرجا ''گیٹ آؤٹ۔''

طالب علموں کی سہولت کا خیال کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ایک کمپیوٹر خرید لیا جائے اور اس پر نوٹس ٹائپ کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے تا کہ انہیں نہ نقل کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے نہ مجھے چیک کرنے کی صعوبت۔ مگر اس میں ایک قباحت یہ ہوگئی کہ ایک روز سوئے اتفاق میں ایک فوٹو اسٹیٹ کی دکان پر پہنچ گیا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ اس دکان کا مالک مسلمان تھا اور اسے بھی اتفاق ہی کہیے کہ وہ اردو داں بھی تھا۔ اس نے اپنی دکان پر ایک اشتہار چسپاں کر رکھا تھا۔

''یہاں اردو پاس آنرز کے COMPUTERISED نوٹس SUGGESTIONS ملتے ہیں۔''

میں نے سوچا کہ یہ VIDEO PIRACY جیسی کوئی چیز ہوگئی۔ میں اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ کون سی ایسی ترکیب آزمائی جائے کہ میرے نوٹس بازار میں آنے سے محفوظ رہیں۔ جہاں چاہ وہاں راہ۔ آخر نظام صاحب' کہ میں ان کا شاگرد ہوں اور وہ میرے' وہ اس طرح کہ وہ میرے کالج میں بی۔ اے اردو آنرز کے طالب علم ہیں اور میں ان کے دائرۂ علم میں داخل ہو کر ان سے کمپیوٹر کے رموز و نکات سیکھتا رہتا ہوں' انہوں نے مجھے ایک ایسا نادر طریقہ بتایا کہ اب جو پرنٹ میرے کمپیوٹر سے نکلے گا اس کی فوٹو کاپی کرنا ممکن نہ ہوسکے گا۔ میں نے اس قیمتی نسخے پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے' مگر ان کوؤں سے ڈر لگتا ہے جو کہتے ہیں کہ تو ڈال ڈال تو ہم میں پات پات۔ ہوسکتا ہے کہ وہ میرے نوٹس کی نقل کرنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ نکالیں۔

ہیجڑے۔ شاہی محل سے شاہی محلے تک

اس مغل بادشاہوں کے زمانے میں محل سرا کے اندر زنان خانے میں گھریلو خدمات سرانجام دینے والے ملازمین کو ''خواجہ سرا'' کہا جاتا تھا خواجہ سرا بنیادی طور پر ترک زبان کا لفظ ہے یہ چوبدار، داروغہ، میر مطبخ جیسا شاہی دربار کی جانب سے مقرر کیا جانے والا شاہی محل کا ایک عہدہ تھا گویا ''خواجہ سرا'' شاہی محل میں زنان خانے کے ملک، چوہدری یا سردار تھے جو بیگمات اور شہزادیوں کی سکیورٹی کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے خواجہ سرا کے عہدے پر تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے افراد کو مقرر کیا جاتا تھا یا پھر اس عہدے کیلئے میرٹ پر تعیناتی کی خاطر بیچارے نوخیز لڑکوں کو نربان بنا کر ان کا ازدواجی مستقبل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا جاتا تھا، احمد شاہ ابدالی کے دلی پر قبضے کے زمانے میں لاہور کے صوبے دار معین الملک عرف میر منو کی وفات کے بعد اس کی بیوہ مغلانی بیگم اپنے کمسن بیٹے امین خاں کے نام پر لاہور کی حکمران بن گئی تھی وہ اپنے احکامات ارجمند، محبت اور خوش فہم نامی تین ''خواجہ سراؤں'' کے ذریعے جاری کرتی رہی تھی، زمانہ گزرا تو بادشاہوں کے ساتھ ہی ان کے شاہی دربار اور شاہی حمام سمیت محل سرا بھی ختم ہو کر تاریخ کی کتابوں میں بند ہو گئے لیکن اس دور کے محل سرا کے عہدے ''خواجہ سرا'' کو پہلے ادب اور بعد ازاں صحافت نے زندہ رکھا ہوا ہے۔

اُصولی طور پر اب ہیجڑوں کو ''خواجہ سرا'' کہنا اور لکھنا کم علمی ہے کیونکہ اس طبقے کے فرائض کی نوعیت ہی تبدیل ہو چکی ہے صدیوں پہلے ان سے بادشاہ تنخواہ پر اپنے حرم میں شاہی خواتین کی ذاتی خدمت کا کام لیتے تھے، بادشاہوں کا زمانہ گزرنے کے بعد نوابی مزاج کے لوگوں نے ان کی خدمات سے استفادہ کر لیا تھا اور ہیجڑوں نے شادی بیاہ اور پھر اس کے نتیجے میں کاکے، کاکیوں کی پیدائش پر ناچ گا کر رزق حلال کمانا شروع کر دیا تھا اب جدید دور میں شادیاں میرج ہالز اور بچوں کی پیدائش میٹرنٹی ہومز میں ہونے کی وجہ سے ہیجڑوں کا روزگار مندے کا شکار ہوتا جا رہا ہے جس کے باعث وہ دھندہ تبدیل کرتے جا رہے ہیں، صدیوں پہلے شاہی محل میں رہنے والی یہ تیسری مخلوق اب شاہی محلے میں رہتی ہے اور ان کی وجہ سے لاہور کی ہیرا منڈی اب ہیجڑا منڈی کہلاتی ہے۔

> احمد شاہ ابدالی کے دلی پر قبضے کے زمانے میں لاہور کے صوبے دار معین الملک عرف میر منو کی وفات کے بعد اس کی بیوہ مغلانی بیگم اپنے کمسن بیٹے امین خاں کے نام پر لاہور کی حکمران بن گئی تھی وہ اپنے احکامات ارجمند، محبت اور خوش فہم نامی تین ''خواجہ سراؤں'' کے ذریعے جاری کرتی رہی تھی۔

پنجاب میں تیسری جنس سے تعلق رکھنے والوں کو عرف عام میں زنخے، زنانے بلکہ کھسرے کہا اور لکھا و پکارا جاتا ہے یہ لوگ صدیوں سے خوشی کی تقریبات میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کیلئے میوزیکل گروپ بنا کر روزگار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں ان

کی مخصوص بول چال ہوتی ہے یہ عموماً عورتوں کے بھڑ کیلے لباس پہنے رہتے ہیں اور الٹے استرے سے شیو بنانے کے بعد شوخ میک اپ کر کے عورتوں جیسا حلیہ اپنائے رکھتے ہیں، خواتین میں یوں گھل مل جاتے ہیں جیسے حقیقتاً ان میں سے ہی ہوں، کمسن لڑکے ان سے یوں دور بھاگتے ہیں جیسے انہیں بچھو سمجھتے ہوں تاہم جوان مردان کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں البتہ بابوں کو ہیجڑے نجانے کیوں پسند نہیں کرتے حالانکہ بیچارے بزرگ انہیں ہی نہیں کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ وہ ہیجڑوں کے بڑے ہمدرد ہوتے ہیں انہیں بھی بزرگوں سے دلی ہمدردی ہونی چاہیے، ہندی کا ایک قدیم شاعر کہہ گیا ہے

"جس تن لاگے وہی یہ دکھڑا جانے"

ہیجڑوں کو بعض بلکہ اکثر لوگ بس ایویں ہی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے سب پروفیشنلز تکنیکی طور پر ہیجڑے نہیں ہوتے ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق ان میں "شوقیہ فنکاروں" کی بھی بہت بڑی تعداد شامل ہو چکی ہے، ظاہر ہے جب بیروزگار نوجوانوں کو نوکری نہیں ملے گی تو وہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کیلئے کوئی تو کام دھندہ کریں گے، شادی بیاہ، بچوں کے جنم اور ان کے ختنے یا عقیقے پر ہونے والی والی تقریبات میں ناچ گانا کر کے ان کی گزر بسر ہو جاتی ہوگی ویسے بھی چوری، ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کرنے سے تو ناچ گا کر کمانا لاکھ درجے بہتر کام ہے، ہیجڑے بڑے خوش اخلاق، ملنسار اور امن پسند ہوتے ہیں، ملکی قوانین کا مکمل احترام کرتے ہیں کسی کیس کے حوالے سے ان کا نام سننے میں نہیں آیا میڈیکل سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود میٹرنٹی کیس کے سلسلے میں تو کبھی نہیں آیا، پولیس والے بھی ان کا خاص خیال رکھتے ہیں کوئی ہیجڑا کبھی پولیس مقابلے میں نہیں مارا گیا البتہ پولیس تشدد نے کئی لوگوں کو ہیجڑا ضرور بنا ڈالا ہوگا ۔ہیجڑوں کا تو ڈبل سواری یا ٹریفک کے کسی دوسرے قانون کی خلاف ورزی پر چالان تک نہیں ہوا ہوگا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ اخلاقی حدودو قیود کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جا سکتا ہے، اس حوالے سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کا اپنا ریکارڈ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ وہ اگر ہیجڑوں کو پکڑ کر حوالات میں بند بھی کر دیتے ہوں گے تو ان کے خلاف مقدمہ درج نہیں کرتے ہوں گے، انہیں صبح سویرے رہا کر دیتے ہوں گے۔

> **کمسن لڑکے اُن سے یوں دور بھاگتے ہیں جیسے انہیں بچھو سمجھتے ہوں تاہم جوان مردان کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ البتہ بابوں کو ہیجڑے نجانے کیوں پسند نہیں کرتے، حالانکہ بیچارے بزرگ انہیں ہی نہیں کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ وہ ہیجڑوں کے بڑے ہمدرد ہوتے ہیں انہیں بھی بزرگوں سے دلی ہمدردی ہونی چاہیے۔**

تیسری جنس کے نام بھی ان کی طرح بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں اپنی شخصیت کی طرح یہ نام بھی بیک وقت مونث اور مذکر رکھتے ہیں ان کے نام غالباً پشتو زبان کی گرائمر کے مطابق ماسی خدا بخش، آنٹی مراد بخش، استاد ببلی، بوبو یوسف اور باؤ زلیخاں قسم کے ہوتے ہیں، یہ نک نیم بھی گڑیا، رانی، مانو، بلی، پنکی، ٹنکی طرز کے رکھتے ہیں، ہیجڑوں نے کوئی فلمی نام بھی نہیں چھوڑا تاہم نقل کے حوالے سے صرف ہیروئینوں کا انتخاب کرتے ہیں ان میں بھی ثناء، ریما، میرا، زارا، نور، ریشم وغیرہ پائے جاتے ہیں البتہ فلمی ہیروئینوں کے برعکس ہیجڑوں کے سکینڈلز منظر عام پر نہیں آتے شاید اس لئے کہ بیچارے صرف منہ زبانی محبت کر سکتے ہیں، ہیجڑوں کے حوالے سے گزشتہ دنوں شائع ہونے والی آزاد نظم نے حساس دل افراد کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

دیکھ کر آئینے میں اپنا سراپا اکثر
اپنے ماں باپ کی قسمت پہ ہنسی آتی ہے
ہائے! میں جن کے لئے فخر کا باعث نہ ہوا

ہائے! میں جن کے لئے باعثِ ذلت ٹھہرا
میرے حصے میں نہ خدمت، نہ شہادت آئی
ملک اور قوم کا احسان نہ چکایا میں نے
میرے رازق کی عنایت ہے کہ جی لیتا ہوں
پیٹ بھر لینے کو مل جاتی ہے روٹی کسی طور
میری فطرت میں ودیعت ہے مجھے غم کا مزاج
سو میرے لب پہ فغاں کل تھی نہ فریاد ہے آج
دنیا والو! مرا احساس کرو، سوچو تو
اپنی مرضی سے تو ایسا نہیں ہوتا کوئی
میں بھی دل رکھتا ہوں سینے میں جگر بھی، مجھ کو
طنز و تشنیع کے نشتر نہ چبھوئے جائیں
میرے زخموں کا مداوا تو مگر ہو کہ نہ ہو
اے خدا تجھ سے شکایت تو مجھے کرنی ہے
میرے صناع مجھے تو نے بنایا ہے مگر
ایسی عجلت میں کہ اِس سے نہ بنایا ہوتا

چند برس قبل ہیجڑوں کے حقوق کیلئے عدلیہ میں دائر ہونے والے ایک کیس کا بڑا چرچا رہا ہے تاہم حکومت نے اس حوالے سے جاری ہونے والے عدالتی فیصلے پر مکمل عمل نہیں کیا، انہیں صرف کراچی کنٹونمنٹ بورڈ نے نادھندگان سے ریکوری کیلئے عارضی بنیادوں پر ملازمت فراہم کی تھی یا پھر شاید نادرا کے اعلیٰ افسروں نے انہیں کچھ نوکریاں دی تھیں، ہیجڑوں کو عام سرکاری اداروں میں نوکریاں، خاندانی جائیداد میں حصہ اور دیگر اہم حقوق نہیں مل سکے اگر انہیں انصاف نہ ملا تو شاید پورے ملک میں احتجاج کرتے ہوئے تالیاں بجاتے پھریں، سپریم کورٹ کو چاہیے کہ ہیجڑوں کو ماتحت عدلیہ میں بطور" چوبدار" اہلکار بھرتی کرنے کے احکامات جاری کردیں یہ نہ صرف تالیاں بجاتے ہوئے ملزموں کے گھروں میں جاکر عدالتی سمن کی تعمیل کراسکتے ہیں بلکہ سماعت کے موقع پر کمرہ عدالت کے دروازے پر کھڑے رہ کر احاطہ میں موجود پیشی پر آئے ہوئے مدعیوں اور ملزموں کے نام پکارنے کا فریضہ بھی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

دوا خانے کے اداکار

مزاح مت

کے ایم خالد

kmkhalidphd@yahoo.com

کوئی دور تھا کہ جب اداکار صرف تھیٹر، ٹی وی ڈرامہ یا فلموں میں ہی پائے جاتے تھے مگر اب زمانہ اداکاروں کی ہر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی بہتات ہے حتیٰ کہ میڈیا کا سب سے خشک شعبہ نیوز اور حالات حاضرہ بھی اس سے محفوظ نہیں تین دہائیوں قبل تک پی ٹی وی کے ان شعبوں میں ان شخصیات کا قبضہ تھا جنہیں شائد کبھی نہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا اب میڈیا کے ان شعبوں میں جو جتنی ''جولی اور ہولی'' (جولی انگلش اور ہولی پنجابی زبان کا لفظ ہے) طبیعت کا مالک نیوز کاسٹر یا اینکر ہو وہ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

اِن دہائیوں قبل تک پی ٹی وی کے ان شعبوں میں ان شخصیات کا قبضہ تھا جنہیں شائد کبھی نہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا اب میڈیا کے ان شعبوں میں جو جتنی ''جولی اور ہولی'' (جولی انگلش اور ہولی پنجابی زبان کا لفظ ہے) طبیعت کا مالک نیوز کاسٹر یا اینکر ہو وہ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

ماضی میں چونکہ پبلسٹی کا مناسب انتظام نہیں تھا اور طب کے شعبے میں تو خاص طور پر اس حکیم کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا جو کسی مریض کو بھی اپنی تعریف دوسروں تک پہنچانے کے لئے راضی کرتے تھے کسی حکیم کی شہرت سینہ بہ سینہ ہی پھیلتی تھی اور یہ شہرت بھی مریض کی مرض سے شفایابی سے مشروط ہوتی تھی اور حکیم صاحب کی شہرت کے اس پھیلاؤ میں برسوں درکار ہوتے تھے۔ زمانہ بدلا اور نیم حکیم اخباروں اور ویگنوں، گاڑیوں میں بانٹے جانے والے اشتہارات کے ذریعے مریضوں تک پہنچنے لگے لیکن اس میں بھی اصل حکیم سے زیادہ نیم حکیم شامل تھے۔ جن کا مقصد ہی مریضوں کی جیب خالی کرنا تھا۔

مختلف چینلز پر چلنے والے حکیموں کے اشتہارات بے دھڑک اور بلا روک ٹوک لمبے لمبے دورانیہ کے اشتہارات دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے ان چینلز کی ملکیت انہی حکیموں کی ہے اور ان کی چوبیں گھنٹے کی ''حکیمانہ نشریات'' سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان دو چار عطائیوں کے پاس ہی دنیا کی ہر بیماری کا علاج ہے اور ان نشریات کی بدولت پی آئی اے سمیت پوری دنیا کی ائر لائنز کی چاندی ہوگئی ہے اور دنیا بھر سے مریض جوق در جوق پاکستان کا رخ کر رہے ہیں۔

نہ جانے ان حکماء کے پاس اپنی پبلسٹی کے اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا کہ وہ چینلز پر اپنے ایک گھنٹے کے اشتہار کے بعد دوسرے گھنٹے ایک نئی بیماری کی علامات، علاج، پرہیز کا پھر ''رٹا'' لگا کر آ دھمکتے ہیں حکیم صاحب خود بھی اداکاری کے شوقین محسوس ہوتے ہیں جو کہ شائد فلموں یا ڈراموں میں اداکاری کے جوہر نہ دکھا سکنے کے باعث اپنا اداکاری کا شوق بھی حکیمی کے ساتھ

ہی پورا کرنے کی کوشش میں مصروف دکھائے دیتے ہیں۔اپنی اداکاری کے ساتھ ان عطائی حضرات نے پورے ملک کے خاص شہروں سے علاقائی بیمار محسوس ہونے والے اداکار بھی دریافت کرتے ہیں ان میں مرد وزن کی کوئی قید نہیں بلکہ جتنا مریض اداکار بوڑھا ہوگا اتنا ہی وہ کامیاب ہوگا جو کہ اپنی علاقائی زبان میں پہلے تو حکیم صاحب تک پہنچنے تک کا حال بیان فرمائیں گے اس کے بعد اپنی بیماری میں مبتلا ہونے اور پھر حکیم صاحب سے علاج اور پھر چند ہی ہفتوں میں اس سے شفایابی کی نوید سنائیں گے یہ علاقائی اداکارانہ اشتہار آدھے گھنٹے سے ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا ہے اس میں اس علاقائی مریض کی اداکاری کی داد تو بنتی ہے جو خوشی غمی کے سارے تاثرات اپنی اداکاری میں سمو دیتا ہے۔

ان اداکاروں کے علاوہ اس حکیمانہ اشتہاری دوڑ میں ماضی کے وہ اداکار بھی شامل ہیں جن کا فلموں میں توتی بولتا تھا اب وہ ان حکیمانہ اشتہاری فلموں میں طوطے کی طرح بول رہے ہیں ان کی اشتہاری فلموں میں کام کی سمجھ تو یہ ہی آتی ہے چونکہ اب فلمیں نہیں بن رہی تو وہ اپنا صرف فلمی ٹھرک ہی پورا کرنے کے لئے ان اشتہاری فلموں میں کام کر رہے ہیں جب کہ آٹو گراف دیتے وہ جوانی سے لے کر اب تک وہ اپنی فٹنس کا سبب حکیم صاحب کی دوائیوں کو ہی گردانتے ہیں جیسے وہ حکیم صاحب کی دوائی جوانی سے ہی استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ایک اداکار گلو بادشاہ ہیں جن کے خیال میں حکیم صاحب کی دوائی سے ان کا نہ صرف معدہ ٹھیک رہتا ہے بلکہ ان کے جوڑوں میں رہنے والا درد بھی رفو چکر ہو چکا ہے۔’’ماچس تو ہوگی آپ کے پاس‘‘ کو پہچان کا روپ دینے والے اداکار فالج کی اداکاری کرتے ہوئے حکیم صاحب کی دوائی سے تندرستی کا اظہار کرتی اداکاری سے حکیم صاحب کا دل موہ لیتے ہیں۔ان اداکاروں کے علاوہ بھی بہت سے صف اول کے اداکار ان حکماء کا ’’چورن‘‘ بیچنے میں پیش پیش ہیں۔

مریض تو بے چارے مرض کے ہاتھوں دیوانے ہوتے ہیں ماضی کی فلموں کے شوخ وشنگ اداکاروں کے علاوہ اپنی علاقائی زبان میں علاقائی اداکار مریض کو اپنی اداکاری سے گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس پر حکیم صاحب کی چرب زبانی، مریض بس اسی حکیم کو مسیحا سمجھتے ہوئے اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

> **مختلف چینلز پر چلنے والے حکیموں کے اشتہارات بے دھڑک اور بلا روک ٹوک لمبے لمبے دورانیہ کے اشتہارات دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے ان چینلز کی ملکیت انہی حکیموں کی ہے اور ان کی چوبیس گھنٹے کی ’’حکیمانہ نشریات‘‘ سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان دو چار عطائیوں کے پاس ہی دنیا کی ہر بیماری کا علاج ہے اور ان نشریات کی بدولت پی آئی اے سمیت پوری دنیا کی ائر لائنز کی چاندی ہوگئی ہے اور دنیا بھر سے مریض جوق در جوق پاکستان کا رخ کر رہے ہیں۔**

> **اس حکیمانہ اشتہاری دوڑ میں ماضی کے وہ اداکار بھی شامل ہیں جن کا فلموں میں توتی بولتا تھا اب وہ ان حکیمانہ اشتہاری فلموں میں طوطے کی طرح بول رہے ہیں ان کی اشتہاری فلموں میں کام کی سمجھ تو یہ ہی آتی ہے چونکہ اب فلمیں نہیں بن رہی تو وہ اپنا صرف فلمی ٹھرک ہی پورا کرنے کے لئے ان اشتہاری فلموں میں کام کر رہے ہیں جب کہ آٹو گراف دیتے وہ جوانی سے لے کر اب تک وہ اپنی فٹنس کا سبب حکیم صاحب کی دوائیوں کو ہی گردانتے ہیں جیسے وہ حکیم صاحب کی دوائی جوانی سے ہی استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔**

ذکر کچھ ملتان کا

ملتان کا شمار نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔اس کا ذکر شاہنامہ فردوسی میں بھی ملتا ہے۔ملتان کی دھرتی کئی خون ریز جنگوں کی چشم دید گواہ رہ چکی ہے۔یہاں پر ہندو اور سکھ ہزار سال تک حکمرانی کر چکے ہیں،ہندووٴں کے بقول یہ شہر ان کے دیوی،دیوتاوٴں کا مرکز رہا ہے۔آثار سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان،ہڑپہ اور موہنجوداڑو قریب تین ہزار سال قبل ایک ہی زمانے میں تہذیب وتمدن کا مرکز تھے۔سنا ہے کہ سکندرِاعظم فتح کی غرض سے ملتان تک آ پہنچا تھا مگر شہر کو فتح کرنے کا خواب دل میں لئے نہ صرف ملتان بلکہ دنیا ہی سے کوچ کر گیا۔ہوا کچھ یوں کہ دورانِ جنگ زہر سے بجھا ایک تیر اسے آ لگا اور یہی اس کی موت کا سبب بنا۔

مدینۃ الاولیا کہلایا جانے والا یہ شہر ماضی میں ہندووٴں اور سکھوں کی عبادت گاہوں کی کثرت کی وجہ سے بھی نمایاں مقام رکھتا تھا۔

ملتان کو اسلامی عہدِ حکومت میں خاص شہرت ملی۔نوجوان سپہ سالار محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں شہر کو فتح کیا،کوئی دس ہزار عرب آباد کئے اور شہر میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی۔تیسری صدی ہجری تک ملتان اور مضافات میں مدارس اور مساجد کا جال پھیل گیا اور یہ شہر علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔چوتھی صدی ہجری میں اسے محمود غزنوی نے فتح کیا۔اسی زمانے میں البیرونی یہاں آیا اور پانچ سال سے زیادہ عرصہ تک یہاں قیام پذیر رہا،اس کی تصنیف ''کتاب الہند'' میں بھی ملتان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔

ملتان کو مدینۃ الاولیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں اکابر اولیا کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت بہاء الدین زکریا،شیخ صدرالدین عارف،شیخ رکن الدین، حضرت شمس تبریز،شاہ گردیز، شاہ حسین آگاہی،سید موسیٰ پاک شہید اور سلطان احمد قتال قابلِ ذکر ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملتان نے خاصی ترقی کی۔شہر کی آبادی لگ بھگ پندرہ لاکھ ہے،جن میں بیس پچیس کو تو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں جبکہ دیگر کے قول وفعل کے ذمہ دار نہیں۔پرانا شہر تو اب بھی اپنی تنگ گلیوں اور بازاروں سمیت چھ دروازوں میں گھرا ہوا ہے جن میں دہلی گیٹ،بوہڑ گیٹ،لوہاری گیٹ،حرم گیٹ،پاک گیٹ اور دولت گیٹ شامل ہیں۔اندرونِ شہر تو مزید گنجائش نہ تھی البتہ بیرونِ شہر پھیلتا اور بڑھتا چلا گیا۔کنٹونمنٹ کا علاقہ بہت خوبصورت اور جدید ہو گیا ہے۔نئی بستی گلگشت کی جدید طرز اور کشادہ بازار قابلِ ذکر ہیں۔جھیلیں اور پارک بھی

ملتان کا خاصا ہیں۔ گو ہمیں آج تک کسی نے نہیں دیئے مگر ملتان کے تحفے بہت مشہور ہیں، جن میں شامل ہیں گرما، ہاتھی دانت کی چوڑیاں، آرائشی سامان اور سوہن حلوہ۔

ملتان کے مشہور سیاست دانوں اور دیگر شخصیات میں احمد سعید کاظمی، ڈاکٹر اسلم انصاری، اصغر ندیم سیّد، کرکٹر انضمام الحق، یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی، جاوید ہاشمی اور سید فخر امام شامل ہیں۔

اور ہاں ملتان کا اصل تعارف تو ہم کرانا ہی بھول گئے تھے، اس شعر میں ملاحظہ کیجئے ۔

چہار چیز است تحفۂ ملتان
گرد، گرما، گدا و گورستان

موت کی سواری، مون کی موٹر بائیک

''اب کیا ارادہ ہے''؟

مون نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ہم نے کھڑکی کا پردہ سرکاتے ہوئے باہر کے موسم کا جائزہ لیا۔ آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز دھوپ نے خبردار کیا کہ ابھی باہر مت نکلو! سو ہم نے ملتانی ملاقاتیں کچھ دیر کو مؤخر کر دیں۔

''ذرا سورج کو شام کی اوڑھنی اوڑھ لینے دو، پھر نکلتے ہیں''

مون نے بھی اس تجویز پہ اتفاق کیا۔

طے یہ ہوا تھا کہ صحافی، محقق اور شاعر جناب محبوب تابش سے ہوتے ہوئے ڈاکٹر مختار ظفر کے ہاں سلامی دیں گے اور پھر صابر انصاری کے پاس چلیں گے۔

شام ڈھلے مون نے موٹر بائیک نکالی اور سٹارٹ کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس نے سنگل سٹینڈ پہ ہی کھڑی بائیک کو بائیں ٹانگ سے کِک لگائی اور دائیں ہاتھ سے ریس دی۔

''دائیں پیر سے کِک لگاؤ نا، تمہیں پتا نہیں کہ دایاں ہاتھ پیر چلانا شیوۂ مسلمانی ہے''

ہم نے تجویز دی
مگر کافر بائیک پھر بھی نہ مانی۔

امروہہ میں مشاعرہ بہت سکون سے چل رہا تھا۔ مجمع سے ایک بہت معقول شخصیت والے صاحب اُٹھے اور عادل لکھنوی صاحب کی طرف اشارہ کر کے بشیر بدر سے بولے ''ڈاکٹر صاحب، وہ شاعر جن کی صورت ہو بہو تارا مسیح (جس جلاد نے سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی تھی) جیسی ہے، انہیں پڑھوا دیجئے۔''

بشیر بدر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ عادل لکھنوی کو دعوتِ سخن دیتے ہوئے کہا ''میں شاعری کے تارا مسیح سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور امروہہ کے ذوالفقار علی بھٹو کا کام تمام کر دیں۔''

''یار ایک حادثے میں دائیں ٹانگ کو نقصان کو پہنچا تھا اس لئے زیادہ زور نہیں لگا سکتا''۔

''اور یہ حادثہ بھی اسی بائیک پر پیش آیا تھا کیا''؟ ہم نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

''نہیں وہ پرانی بائیک تھی'' مون نے جواب دیا۔

''تھی تو بائیک ہی نا!''

ہمیں تشویش لاحق ہوئی۔ سنا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور اگر آج وہی حادثہ پھر ہو گیا تو؟ کہیں برطانیہ کی سیر محض ایک خواب ہی نہ رہ جائے۔

''جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا'' ہم نے خود کو تسلی دی۔ بچ رہے تو لندن گوریاں جا تاڑیں گے اور اگر خدانخواستہ شہید ہو گئے تو جنت میں حوریں منتظر ہوں گی۔

لگتا تھا کہ دوبارہ جی اٹھنے کے لئے بائیک ہمارے ''قم'' کہنے کی منتظر تھی۔ مون نے بائیک پر بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے ریس دی اور ہم نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے دائیں پاؤں کے ساتھ زور دار کِک لگائی۔ اگلے ہی لمحے کمال ہو گیا۔ بائیک سٹارٹ ہو گئی۔

کچھ دیر میں حالات نے ثابت کر دیا کہ ہم بائیک پر نہیں بلکہ ملک الموت کے کاندھوں پہ سوار ہیں۔ جس راستے سے چیونٹی بھی پرمیٹ کے گزرے اُس راستے سے بائیک سمیت ہم دونوں کا گزر جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

''بھئی کچھ تو احتیاط کرو کیوں موت کے منہ میں لئے جاتے ہو'' ہم نے ایک بار پھر احتیاطی تدابیر کا راگ الاپا۔

''میرے چندا گھبراؤ مت کچھ بھی نہیں ہوگا'' مون نے بھی پھر وہی جواب دیا۔

ہمیں کئی خدشات نے گھیر لیا۔آگے ایک تنگ سی گلی آ گئی، وہ بھی یک طرفہ ٹریفک کے لئے۔

''تو انٹری میں کیوں گھس آئے''؟

ملتان کی گلی گلی سے واقف ہوں،گھبراؤ نہیں سیدھا ڈاکٹر مختار کے ہاں جانکلیں گے''

''موت کی گلی سے بھی خوب واقف ہو میاں!اس لئے تو موٹر سائکل کی نمبر پلیٹ پر سرخ لفظوں میں لکھوار کھا ہے کہ سواری اپنی جان کی حفاظت خود کرے، ڈرائیور کی خیر ہے''

ہم نے اسی دوران ایک رازدار دوست کو فون کیا:

''بھئی یونس دیکھو، اس وقت ہم وصیت نامہ لکھنے کی حالت میں نہیں لہذا جو کچھ کہیں پلے باندھ لو۔ہمارے کمرے میں جو ایک بڑا سا صندوق ہے اس میں ایک اور چھوٹا صندوق ہوگا جس میں کلثومی کی تصویریں اور خط رکھے ہیں۔خطوط اور تصاویر کو دریا برد کر دینا اور اس کے دیئے ہوئے چند تحفے بھی ہوں گے وہ تم اپنے استعمال میں لے آنا یا پھر بیچ کے ہمارے لئے قرآن خوانی کروا دینا'' ساتھ ہی ایک صحافی دوست کو بھی اطلاع دے دی کہ ہمارے مرنے کی خبر ہر صورت جلی حروف میں چھپنی چاہئے، نیلے کوٹ اور گلابی ٹائی والی تصویر بھی لگانی ہے۔ایک مولانا کو بھی بتا دیا کہ ہماری حادثاتی موت کی صورت میں شہادت کا فتویٰ تیار رکھیں۔

حسین آگاہی چوک سے نکلے تو سینما کی دیوار پر کسی ہندوستانی فلم کے اشتہار لگے تھے۔ہم دونوں کی نظریں آنے جانے والی ٹریفک سے زیادہ فلمی حسیناؤں کی نیم عریاں تصویروں پر تھیں کہ ایک ریڑھی والا جو برف لادے جا رہا تھا، نے خبردار کیا ورنہ حادثہ یقینی تھا۔تو نمبر چونگی جا پہنچے،اوور ہیڈ پل تعمیر ہونے کی وجہ سے سڑکیں پتھروں سے اٹی تھیں اور فضا دھول سے۔

کونے میں پھولوں کی ایک دکان دکھائی دی۔ہم نے ڈاکٹر صاحب کو پھول پیش کرنے کے لئے تازہ گلابوں کا ایک گلدستہ لیا اور گلگشت کو چل دیئے۔ڈاکٹر صاحب اپنے آفس میں موجود تھے، چائے اور بسکٹ سے ہماری تواضع کی گئی۔ذکر چل نکلا ملکی حالات کا، ڈاکٹر صاحب خاصے مایوس دکھائی دیتے تھے، کہنے لگے:''حالات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ بحیثیتِ مجموعی ہم حالات کی خرابی کے ذمہ دار ہیں اور ساتھ ہی درستگیٔ احوال کا کوئی سنجیدہ رویہ بھی نہیں اپنایا جا رہا الٹا حالات کا رونا رویا جاتا ہے، ایسے میں بہتری کی کوئی بھی توقع عبث ہے''

گرما گرم چائے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ گفتگو نے بھی لطف دیا۔ان سے اجازت لی اور صابر انصاری کی طرف چل دیئے۔پر پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے دولت گیٹ جا پہنچے۔معمول کے مطابق ٹریفک کا رش، مٹی دھول کی فراوانی کے ساتھ ساتھ کھانے کی اونچی اونچی دکانیں بھی دیکھنے کو ملیں۔کوئی کڑاہی گوشت میں ماہر تو کوئی حلوہ پوری میں اور کوئی تکا تک میں۔مٹی کے برتنوں کی دکانیں بھی تھیں اور فٹ پاتھ پر برف کے پھٹے بھی لگے تھے۔دولت گیٹ سے محلہ آغا پورہ کو مڑے، تھوڑا آگے پہنچے تو سڑک مٹیالے رنگ کے پانی سے بھری تھی۔

''بھئی یہ تو کوئی مقدس مقام معلوم ہوتا ہے، دیکھو نا چشمہ ابل پڑا ہے''

''یہ قدرتی چشمہ نہیں بلکہ بارش کا پانی ہے'' مون نے جواب دیا۔

''مگر ان دنوں تو کوئی بارش نہیں ہوئی''

''ہوئی تھی نا پچھلے ماہ''

''تو پانی اب تک کھڑا ہے؟'' ہماری تشویش بجا تھی۔

''یہ ایک نشیبی علاقہ ہے آس پاس کے اونچے علاقے کا پانی بھی یہاں جمع ہو جاتا ہے''

''تو انتظامیہ کیا کرتی ہے''؟

''انتظامیہ۔۔۔۔۔''؟ مون نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔پھر خود ہی بولا ''شہر کی انتظامیہ اونچے اونچے

مکانوں میں رہتی ہے اور بڑے بڑے محلات کے خوابوں کی تعبیر میں مصروف رہتی ہے، نیچے والوں پہ نظر ہی نہیں پڑتی"

ہم ابھی اسی کشمکش میں تھے کہ یہ دریا سا کیسے عبور کیا جائے، اتنے میں دور سے ایک دیہاتی سر پہ مٹی کے برتن اٹھائے پانی میں چل کے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سر پر مہارت سے رکھے گھڑے کو تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لنگوٹی کو سنبھالے ہوئے تھا۔ جیسے جیسے پانی گہرا ہوتا جاتا ویسے ویسے وہ لنگوٹی اوپر کرتا جاتا۔ ایک جگہ شاید گڑھا تھا، پانی کمر تک آ پہنچا اور لنگوٹی تقریباً سینے تک۔ اگلے ہی لمحے قدرے اونچی جگہ تھی، اب کے پانی گھٹنوں تک تھا اور لنگوٹی بدستور کمر سے اوپر۔ دیکھنے والوں کے ہاتھ تماشہ آ گیا، کوئی بے شرم اور بے غیرت کہے جا رہا تھا تو کوئی محض ہنسے جا رہا۔ دیہاتی بیچارہ ایسا گھبرایا کہ بغل میں دبے چمڑے کے جوتے بھی پانی میں گر گئے۔ جوتے بچانے کے لئے وہ جھکا ہی تھا کہ گھڑے والا ہاتھ بھی پھسل گیا اور وہ گھڑا بھی ملت کی ڈولتی کشتی کی طرح پانی میں ہچکولے کھانے لگا۔

"پتلی گلی سے نکلتے ہیں" مون کو راستہ سوجھا۔

"اس کی مدد ہی کر دیتے"

"وہ کون سا ڈوب چلا ہے"

"کچھ دیر ٹھہر کے اس کے ڈوبنے کا انتظار کر لیتے ہیں"

مون نے سُنی اَن سنی کر دی اور دائیں جانب بائک موڑ دی۔ سامنے مٹھائی کی ایک دکان نظر آئی، سوچا دوست احباب جمع ہوں گے منہ میٹھا کر لیں گے۔ مون نے سڑک کے کنارے بائک روکی اور ہم شیشے کا دروازہ کھول کر دکان میں داخل ہو گئے۔ کئی مٹھائیاں شوکیس میں سجی تھیں، ہماری مطلوبہ چیزیں سیلز مین نے صفائی والے میلے سے ایک کپڑے کے ٹکڑے سے ہاتھ پونچھ کر پیک کرنی شروع کر دیں۔

"یار کوئی چمٹا وغیرہ استعمال کر لیتے یا کم از کم پولیتھین کے دستانے ہی ہاتھوں پہ چڑھا لیتے"

ہم نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا، مگر دکان والا برہم ہو گیا۔

"حضرت تھوڑا صفائی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے نا"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ مٹھی بھر داڑھی والے وہ صاحب چیخ اٹھے (یعنی کسی مسلمان سے صفائی کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے ہم ایک ناقابلِ تلافی جرم کے مرتکب ہوئے تھے) کہنے لگے "بھائی صاحب! آپ کی داڑھی اسلام کے مطابق نہیں اور آپ بات کرتے ہیں صفائی کی!"

ان دنوں ہم نے خشخشی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی جو بعض مولویوں کے نزدیک کسی شمار و قطار میں نہیں آتی۔

"ہماری داڑھی کو چھوڑیے آپ کی تو پوری زندگی اسلام کے مطابق نہیں" ہم نے دل ہی دل میں یہ کہا اور مٹھائی خریدنے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ ہمارے اس فیصلے پر دکاندار یوں خوش ہوا جیسے میدانِ جنگ میں اسلام کا جھنڈا لہرا دیا ہو۔

صابر انصاری کے ہاں خاصا رش تھا۔ کئی شعرائے کرام تشریف فرما تھے (سامع ایک بھی نہیں تھا) دیوار پہ ٹنگے پَینا فلیکس پر ہماری شاعری کی کتاب کے تعارف سمیت موٹے حروف میں ہمارے اوصافِ حمیدہ بیان کیے گئے تھے اور "انصارِ ادب" کے زیرِ اہتمام "ایک شام ارمان یوسف کے نام" کی گئی تھی۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی!" ہم نے صابر انصاری کے کان میں سرگوشی کی۔

"بس جلدی میں کچھ خاص نہ کر سکا" انصاری کے جواب نے ہمیں مطمئن کر دیا۔

کرسیٔ صدارت پر مہربان، شفیق اور ہر دلعزیز شخصیت ارشد ملتانی براجمان تھے۔ ریڈیو کے معروف کمپیئر اور میزبان ڈاکٹر شوذب کاظمی، استاد فدا ملتانی نبیل طور، محمد اسلم ہمدم، رحمت انصاری اور کئی دوسرے شعرا بھی موجود تھے۔

ایک صاحب نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف ہاتھ بڑھایا اور بولے "خاموش"

ہم نے آدھا سلام کیا ہی تھا کہ چپ سادھ لی۔ حکم بھی یہی تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب تھے مہر محمد اجمل اور "خاموش" اُن کا تخلص ہے۔

روبینہ شاہین بینا

موجِ غزل میں مزاح کا عنصر

موجِ غزل فیس بک کا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کا شعری ادب کا فروغ ہے۔اس ادبی گروہ کے منتظمین کی اَن تھک محنت اور جدت طرازیوں کے طفیل یہ گزشتہ کئی برسوں سے کامیاب طرحی مشاعروں کا انعقاد کر چکا ہے۔نوجوان شعراء کے ساتھ ساتھ بہت سے نامی گرامی شعراء ان مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور اُردو کے شعری ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔نوجوان شعراء وشاعرات کو یہاں رہنمائی اور اصلاحِ سخن کے بھی مواقع بھی میسر ہیں۔اس ادبی گروہ کے منتظمِ اعلیٰ جناب ہاشم علی خان ہمدم ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور نوجوان شعراء و شاعرات کی خصوصی حوصلہ افزائی کے شدت سے قائل ہیں۔

اس ادبی گروہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے منعقد کردہ ہفتہ وار طرحی مشاعروں میں ہر بار باقاعدگی سے شرکت کرنے والوں میں طنزیہ ومزاحیہ شعراء وشاعرات کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی ہے اور دیے گئے طرحی مصرعوں پر اپنے زعفران زار فن کے جادو جگاتی ہے۔یہی نہیں، بلکہ یہاں بسا اوقات طنز و مزاح پر مبنی مشاعروں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے جس میں کسی بھی مزاحیہ شاعر کے کلام سے مصرع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان مشاعروں میں تمام شعراء طنز و مزاح پر مبنی کلام پیش کرتے ہیں۔ایسے شعراء بھی مزاح گردی کرتے نظر آتے ہیں جن کے اپنے خیال کے مطابق وہ مزاح تخلیق نہیں کر سکتے۔

اس سہ ماہی کے دوران بھی دو عدد مزاحیہ مشاعروں کا اہتمام کیا گیا تھا۔پہلا مشاعرہ ۱۹؍جنوری ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ منعقد ہوا۔اس شعری نشست کے لئے معروف مزاحیہ شاعر جناب انور مسعود صاحب کی غزل کے درج ذیل شعر میں سے مصرع لیا گیا تھا۔

ہے آپ کے ہونٹوں پہ جو مسکان وغیرہ
قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ

اس مشاعرے میں جن شعراء وشاعرات نے شرکت کی اُن کے اسمائے گرامی تھے جناب عامر حسنی، جناب عادل اشرف، جناب افضل مرکزی، جناب زین علی احمر، جناب علیم اسرار،

ڈاکٹر امواج الساحل صاحب، جناب احمد علی برقی اعظمی، محترمہ دلشاد نسیم، جناب محمد فہیم، جناب غضنفر علی، جناب گوہر رحمٰن گہر مردانوی، جناب ہاشم علی خان ہمدم، جناب عرفان قادر، محترمہ جیا قریشی، جناب ڈاکٹر منظور احمد، جناب انعام الحق معصوم صابری، ڈاکٹر مظہر عباس رضوی صاحب، جناب محمد محمود، جناب محمد علی بٹ، محترمہ نور جمشید پوری، جناب نوید ظفر کیانی، جناب عمر عامر، محترمہ رعنا حسین، جناب رمز جلال آبادی، جناب ساگر کاشمیری، جناب سالک جونپوری، جناب شاہین فصیح ربانی، جناب شاہد دلنوی، ڈاکٹر شاہد رحمٰن صاحب، محترمہ شہناز رضوی، ڈاکٹر محمد تبسم پرویز صاحب، محترمہ ذہینہ صدیقی، جناب ذیشان فیصل شان، جناب ذوالفقار نقوی، محترمہ قدسیہ ظہور، جناب نعت مالکی، محترمہ رابعہ بصری اور راقمہ الحروف۔ چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں:

مت جانا بشیراں کی دکاں پر بھی عزیزو
جائے نہ کہیں ہاتھ سے ایمان وغیرہ

شاہد دلنوی

لائیں گے ترے واسطے توشیبہ کا ٹی وی
چاہے ہمیں جانا پڑے جاپان وغیرہ
اب "مار نہیں، پیار" کا قانون ہے لاگو
کھنچتے نہیں اسکول میں اب کان وغیرہ

شاہین فصیح ربانی

ممکن ہے جوانی تمھیں پھر راس نہ آئے
سردی میں تو تم پہن لو بنیان وغیرہ

ذہینہ صدیقی

کھاتے ہیں کبھی وہ جو کہیں پان وغیرہ
بہتر ہے رکھیں پاس اگلدان وغیرہ

انعام الحق معصوم صابری

کالج میں کیوں جائیں کہ باہر ہی پڑے ہیں
یہ میر تقی میر کے دیوان وغیرہ

ڈاکٹر امواج الساحل

یوں پھیلتا جاتا ہے کوئی فضلِ خدا سے
تنگ پڑنے لگے کمرہ و دالان وغیرہ
اُس شخص کی کج فہمی کے انداز تو دیکھو
لیڈر کو سمجھتا ہے جو انسان وغیرہ

نوید ظفر کیانی

اک قائدِ اعظم کی جھلک کافی ہے ان کو
روکیں جو کہیں راستہ دربان وغیرہ
مہنگائی کے اس دور میں سوچا ہے یہ مظہر
بس کھائیں ہوا چھوڑ دیں سب نان وغیرہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دسویں کے ہمیں نے کیے حل پرچے تمہارے
تم نے کبھی مانا نہیں احسان وغیرہ

عادل اشرف

پھر اس نے لگانا ہے دوبارہ کوئی چکر
رکھے ہیں یہی سوچ کے گلدان وغیرہ
پانامہ کے بزنس تو پنپتے ہی رہیں گے
روتے ہیں تو روتے رہیں عمران وغیرہ

روبینہ شاہین بینا

کیا آپ کو یہ بات بھی معلوم نہیں تھی
سرکار میں ہیں آپ کے دربان وغیرہ

علیم اسرار

ہر ایک کو سی پیک سے ایسی ہوئی الفت
لگتا ہے چنے بیچیں گے جاپان وغیرہ
یہ سوچ کے لبرل تو سبھی باپ ہیں ان کے
چھٹی پہ چلے جاتے ہیں شیطان وغیرہ

ذیشان فیصل شان

غائب جو ہوا جیب میں دھیلا نہیں چھوڑا
ظالم تھا وہ اک اور بھی مہمان وغیرہ

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

دیوانہ بہت سوچ کے دیوانہ ہوا ہے
سمجھو نہ اسے آپ یوں نادان وغیرہ

رمزؔ جلال آبادی

پنجاب کی پولیس جنہیں ڈھونڈ رہی ہے
رہتے ہیں کراچی میں کہاں ڈان وغیرہ
بلو سے ملکا ہے کبھی پنو سے پنگا
پنڈو کا مقدر نہیں ایان وغیرہ

ہاشم علی خان ہمدم

یہ عشق مری جان ترا روگ نہیں ہے
سودائے محبت میں ہے نقصان وغیرہ

جیا قریشی

ہر حال میں کرنا ہے ادا، جتنا بھی مانگیں
ہے ٹیکس بھی شاید کوئی تاوان وغیرہ
ہر چوّل کی اک خاص نشانی ہے کہ ہر وقت
ہے اپنے خیالوں میں ہی لقمان وغیرہ

عرفان قادر

چہرے پہ جو لادا ہے یہ سامان وغیرہ
"قربان گئے اس پہ دل و جان وغیرہ"
بیگم کا چلے ہاتھ، نکل تیلی گلی سے
ہو جائے نہ دیدہ کوئی سنسان وغیرہ

عامر حسنی

مے خانے میں کیا کام ہے ان کا یہ بتاؤ
خود کو جو بتاتے ہیں مسلمان وغیرہ

شہناز رضوی

تم مجھ سے الجھتے ہو بڑے شوق سے لیکن
سن میرے قبیلے سے ہیں یہ ڈان وغیرہ

سالک جونپوری

گاڑی میں تو مشکل سے یہ بچے ہی گھسیں گے
رکھیں گے کہاں اپنا یہ سامان وغیرہ

محمد فہیم

کیا خوب نئی آن نئی شان وغیرہ
ہوتی ہی نہیں آپ کی پہچان وغیرہ

ڈاکٹر منظور احمد

رکھتا نہیں ہوں اس لئے اے یار مقفل
گھر میں نہیں میرے کوئی سامان وغیرہ

ذوالفقار نقوی

وعدے ہیں سیاسی، کبھی پورے نہیں ہوتے
ٹی وی پہ بہت سنتے ہیں اعلان وغیرہ

قدسیہ ظہور

دوسرے مزاحیہ مشاعرہ کے لئے چلبلے اور شگفتہ لہجے نے خوبصورت شاعر جناب عبدالحکیم ناصف صاحب کی غزل کے درج ذیل شعر میں سے مصرع لیا گیا تھا۔

مدت ہوئی کہ دیکھا نہیں ہم نے آئینہ
خود سے نظر ملائے کئی سال ہو گئے

اس مشاعرے میں جن شعراء وشاعرات نے شرکت کی اُن کے اسمائے گرامی تھے جناب عامر حسنی، جناب عادل اشرف، جناب افضل مرکزی، جناب محمد فرحت اللہ خان، جناب علیم اسرار، ڈاکٹر امواج الساحل صاحبہ، ڈاکٹر شوکت شفا شیدا، محترمہ دلشاد نسیم، جناب محمد فہیم، جناب غضنفر علی، جناب گوہر رحمٰن گہر مردانوی، جناب ہاشم علی خان ہمدم، جناب عرفان قادر، محترمہ جیا قریشی، جناب ڈاکٹر منظور احمد، جناب انعام الحق معصوم صابری، ذکیہ شیخ مینا، جناب محمد محمود، جناب محمد رضا کریم رہبر، محترمہ نور جمشید پوری، جناب نوید ظفر کیانی، جناب عمر عامر، محترمہ رعنا حسین، جناب رمز جلال آبادی، جناب ساگر کاشمیری، جناب سالک جونپوری، جناب شاہین فصیح ربانی، جناب شاہد دلنوی، ڈاکٹر شاہد رحمٰن صاحب، محترمہ شہناز رضوی، جناب ریاض انزنو، محترمہ ذہینہ صدیقی، جناب ذیشان فیصل شان، جناب شکیل رشڑوی، محترمہ قدسیہ ظہور، جناب نعمت مالکی، محترمہ رابعہ بصری اور راقمۃ الحروف۔
چند منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں:

چیں بہ جبیں پڑوسی تھے شوقِ ریاض پر
سو ہم کو نہائے کئی سال ہو گئے
اب واپسی کا ذکر بھی کرتے نہیں ہیں وہ

آئے تھے بن بلائے کئی سال ہو گئے

نوید ظفر کیانی

گاڑی چلا رہے ہیں دس کی سپیڈ پہ
ٹکر کسی سے کھائے کئی سال ہو گئے

ڈاکٹر شاہد رحمن

وہ ملک میں ہے اور یہاں چین سے ہیں ہم
بیگم کی ڈانٹ کھائے، کئی سال ہو گئے
برقعہ بغیر اپنا نکلنا محال ہے
قرضے یہاں اٹھائے، کئی سال ہو گئے

محمد فرحت اللہ خان

خود سے نظر ملائے کئی سال ہو گئے
تیری نظر میں آئے کئی سال ہو گئے

محمد ریاض علیم

خوابوں میں تیرا آئے، کئی سال ہو گئے
یوں بے سبب ستائے، کئی سال ہو گئے

شکیل رشروی

کیا ذائقہ ہے آپ کے ہاتھوں میں ہائے ہائے
نان و کباب کھائے کئی سال ہو گئے

معصوم صابری

تجھ کو جو دیکھوں عید ہو جاتی ہے پھر مری
اب عید بھی منائے کئی سال ہو گئے

احمد مسعود قریشی

آئی ہے عقل مجھ کو بڑی مشکلوں کے ساتھ
دنیا سے مار کھائے کئی سال ہو گئے
سسرالیوں سے رشتے بھی لوہے کے ہیں چنے
ہم کو مگر چبائے کئی سال ہو گئے

روبینہ شاہین بینا

رخ سے نقاب اٹھائیے محفل کے درمیاں
محفل کو جگمگائے کئی سال ہو گئے

ذکیہ شیخ مینا

گالوں سے اس کے آج تک سرخی نہیں گئی
تھپڑ کسی کا کھائے کئی سال ہو گئے
کیا پوچھتے ہو مجھ سے پنامہ کے کیس میں
دولت کہیں چھپائے کئی سال ہو گئے

ہاشم علی خان ہمدم

بیگم گئی ہوئی ہیں کئی سال سے میکے
دل کا سکوں لٹائے کئی سال ہو گئے

شہناز رضوی

پیسے کی ڈھونڈنے سے بھی ملتی نہیں ٹریل
مٹی میں ، سب دبائے کئی سال ہوگئے

ذیشان فیصل شان

مسجد سے دم دبائے کئی سال ہو گئے
جوتا اسے چرائے کئی سال ہو گئے

محمد رضا کریم رہبر

ان دو مشاعروں کے علاوہ ہر ہفتے کی شام کوفی البدیہہ طرحی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں دوسرے شعراء کے علاوہ مزاح گو شعراء و شاعرات کا ایک عنصر پھلجڑیاں چھوڑتا رہتا ہے۔

۱۴ رجنوری ۲۰۱۷ء کی شام کو بھی موجِ غزل کے ۳۹ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔اس مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

رہے ہیں زوجۂ اوّل سے ناکوں ناک مگر
اِک اور عقد کا سودا ہمیشہ سر میں رہا
یہی ہے آج کے شوہر کا نامۂ اعمال
خدا کے ڈر میں نہیں بیوی کے اثر میں رہا

نوید ظفر کیانی

سکڑ کے ہوگئی شوہر کی سلطنت اتنی
کہ جیسے بن کے گلہری کسی شجر میں رہا

نصیبِ شان میں لکھی تھی شاعری لیکن
پھنسا یہ پیاز میں آلو میں یا مٹر میں رہا

ذیشان فیصل شان

گرا تھا شام کو اک سُست آدمی اُس میں
تمام رات خوشی سے پڑا گٹر میں رہا
خُدا کا شکر فضا میں نہیں اُڑا بالکل
جنابِ صدر کا ہر شعر بحر و بر میں رہا

عرفان قادر

۲۸ رجنوری ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کے ۴۱ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔اس مشاعرے میں کا طرحی مصرع جناب غضنفر علی کی ایک منفرد غزل سے لیا گیا تھا۔مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

بچوں کو کوئی کر نہ سکا زینہار چپ
آنکھیں دکھا دکھا کر کہا بار بار چپ!
یاروں میں جس کو چپ بھی کرانا محال تھا
سسرال میں ہے صورتِ سنگِ مزار چپ
جب صور پھونکا جائے گا تو ہڑبڑائیں گے
ورنہ ہے صدرِ مملکت کی شاہکار چپ

نوید ظفر کیانی

سوشکھ ہوں "ایک" چُپ ہو، اگر یہ درست ہے
کیسا سکون ہو جو رہیں "چار چار" چُپ
ویسے تو تھا جواب، مرے ہر سوال کا
ہے کون زن مُرید؟ ہوئے بے شمار چُپ

عرفان قادر

حیرت زدہ تھی دیکھ کے منظر نظر مری
بیٹھی تھیں ایک کمرے میں خاتون چار چپ
ویسے تو خوب چلتی ہے دن رات ہی مگر
شاید زباں پہ کرتی ہے رہ کر وہ دھار چپ

نورجمشید پوری

اِسی طرح ۱۱رفروری ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کے ۴۳ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں طرحی مصرع محترمہ فاخرہ انجم کی ایک غزل سے لیا گیا تھا۔ مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

یہ جون ایلیا سے بن کے رہ گئے ہو کیوں؟
تمھارے شہر میں کیا قحط ہے غذائی میاں
کچھ اس ادا سے طلب کی ہے فیس ظالم نے
وہ ڈاکٹر مجھے لگنے لگا قصائی میاں

نوید ظفر کیانی

وہ برقعے والی کو بیگم سمجھ کے پاس گئے
اس لئے تو سڑک میں ہوئی پٹائی میاں
بنا کے تجھ کو وہ رکھیں گے دیکھنا نوکر
کبھی نہ رہنا وہاں بن کے گھر جمائی میاں

نورجمشید پوری

بھلا بتاؤ اسے ڈیٹ کون کہتا ہے
وہ ساتھ لے کے چلی آئی اپنی تائی میاں
میں لوڈ کرتا ہوں ہر روز دس روپے کا مگر
چرا رہا ہے کوئی میرا وائی فائی میاں
یہ تایا، ماموں کی لڑکی سے شادیاں نہ کرو
ہماری بیوی بھی کہتی ہے ہم کو 'بھائی میاں'

غضنفر علی

اب ایسے چور کو کس قید میں لیا جائے
چرا کے دل مرا جس نے نظر چرائی میاں
تو معترف نہیں اس کے سیاسی باؤنسر کا
اگرچہ خان نے تیری وکٹ گرائی میاں

روبینہ شاہین بینا

۱۸رفروری ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کے ۴۴ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے کے صاحبِ طرح شاعر جناب مختار احمد تھے۔ مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

جو اہلِ مسند و دستار کے ہیں کاسہ لیس
اُنھیں کے قول نصابوں میں مستند کیے جائیں
رقیب روز پھنساتا ہے اک نئی لڑکی
اور اپنا کام یہی ہے کہ بس حسد کیے جائیں
تکور کے عوض آتا ہے کوئی قطری خط
وہ اتنے نیک نہیں ہیں یونہی مدد کیے جائیں

نوید صدیقی

اسامی بانگ بھی دینے کی ہو تو ہٹتے نہیں
فقط وہ اپنے ہی چوزوں کو نامزد کئے جائیں
وہ اپنی ٹانگ ہمیں کھینچنے جو دیتے نہیں
تو کیوں نہ اُن سے بھلا عمر بھر حسد کئے جائیں

نوید ظفر کیانی

عروضیوں سے فقط اتنی سی گزارش ہے
سبب خفیف بڑھا کر نہ یوں وتد کیے جائیں
سرائے اہل ادب کا یہ حال ہے بینا
کہ کام کچھ نہ کریں اور بس حسد کیے جائیں

روبینہ شاہین بینا

عروض دان مرے شعر مسترد کئے جائیں
غزل میں اپنی مگر درد کو ورَد کئے جائیں
نہیں خرید سکے کوئی قیمتی تحفہ

اکاؤنٹ میرے رقیبوں کے منجمد کیے جائیں
ہیں دو ہی اچھے، اگرچہ ہوں ایک درجن بھی
کہا ہے کس نے؟ کہ پیدا ہی دو عدد کیے جائیں

عرفان قادر

۴/مارچ ۲۰۱۷ء کو موج غزل کے ۴۶ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ مشاعرہ مرحوم باقی صدیقی کے نام تھا۔ اس طرحی مشاعرے کے لئے جس مصرع کا انتخاب کیا گیا تھا وہ اُن کے درج ذیل شعر سے اخذ شدہ تھا۔

ہر کنارے کی طرف صورتِ دریا دیکھو
راستہ روک بھی لیتے ہیں سفر کے ساتھی

مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

ایسی منزل پہ بھی لے آتی ہے شامت اکثر
جس جگہ کام نہیں آتے قطر کے ساتھی
جس طرح خاک میں رُل کر بھی ہے زندہ بھٹو
ویسے ہی زندہ ہے تجھ پر کوئی مر کے ساتھی

نوید ظفر کیانی

جام پیتے ہیں کرپشن کے جیے جاتے ہیں
دختِ رز کے نہیں ہیں دخترِ زر کے ساتھی
جس نے پیدا کیا، اُس کا نہ کبھی ہو پایا
ساری دنیا کے شیاطین بشر کے ساتھی

روبینہ شاہین بینا

دیکھ کر سمت ہوا کی وہ بدل جاتے ہیں
یعنی کچھ لوگ اِدھر کے نہ اُدھر کے ساتھی
جاں مصیبت میں ''شریفوں'' کی پھنسی جب بھی نوید
آگئے ان کے تحفظ کو ''قطر'' کے ساتھی

نوید صدیقی

''جو بھی ہے جیب میں، فوراً ہی نکالو'' کہہ کر
''راستہ روک بھی لیتے ہیں سفر کے ساتھی''

میک اپ کر کے نکلنا ہے نری دھوکا دہی
''چار سو بیس'' نہ بن اتنا سنور کے، ساتھی

عرفان قادر

۱۱/مارچ ۲۰۱۷ء کو موج غزل کے ۴۷ ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ مشاعرہ خوبصورت لب و لہجے کے شاعر جناب سعود عثمانی کے نام تھا۔ مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

رکھوں گا ترقی کی طرف پہلا قدم میں
جس روز طبیعت کو میں درباری کروں گا
اس وہم سے باہر نہیں نکلے کبھی سر سے
میں جب بھی کروں گا کوئی فنکاری کروں گا

نوید ظفر کیانی

آنکھوں کا مقدمہ بھی عدالت میں چلے گا
ہاں دل کی وکالت بھی میں سرکاری کروں گی
یہ خانگی دنیا کی روایت ہے میاں جی
ہر کام کا فرمان بھی میں جاری کروں گی
شادی ہے مری نند کی، مجھ کو ہے سنورنا
دلہن سے کہیں بڑھ کے میں تیاری کروں گی

روبینہ شاہین بینا

نقصان اٹھایا ہے محبت میں ہمیشہ
اب اُن کے کریڈٹ سے خریداری کروں گا
یہ نام دغابازی قمر سارے جہاں میں
مشہور رہے کوششیں میں ساری کروں گا

قمر رضا مطلبی

مجنوں نے کہا، دشت میں آزاد ہوں آزاد
چاہوں گا جہاں، پان کی پچکاری کروں گا
کر کر کے سفر ڈوب نہ جائے تُو گھڑے پر
اے سوہنی! بُک تیرے لئے لاری کروں گا
اوروں کی ''زمینوں'' پہ کیے جاؤں گا قبضہ
یہ کام بحیثیتِ پٹواری کروں گا

عرفان قادر

۱۸ر مارچ ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کے ۴۸ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ مشاعرہ موجِ غزل کی خوبصورت شاعرہ محترمہ شہناز رضوی کے اعزاز میں رکھا گیا۔ اُن کے جس خوبصورت شعر میں سے طرحی مصرعے کا انتخاب کیا گیا وہ کچھ یوں تھا۔

پھر اس کے بعد نیند کو آنکھیں ترس گئیں
اِک شخص میرے خواب میں آیا تھا اور بس

مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

بیوی سے پوچھئے کبھی شوہر کی حیثیت
اک جانور تھا جس کو سدھایا تھا اور بس
ویسے اُنہیں پسند تو فیض و فراز تھے
پر تائی کے نصیب میں تایا تھا اور بس

نوید ظفر کیانی

کتنی نجانے گالیاں سننی پڑیں مجھے
آنٹی کو میں نے خالہ بلایا تھا اور بس
غالب چچا بھی خواب میں آ کر ڈرا گئے
اک شعر ہی تو اُن کا چرایا تھا اور بس

سالک ادیب

''پھر اس کے بعد نیند کو آنکھیں ترس گئیں''
اے سی کا ایک بار بل آیا تھا اور بس
تب سے بھگت رہی ہے عوام اپنے دیس کی
گنجوں کو حکمران بنایا تھا اور بس

محمد خلیل الرحمٰن، خلیل

بابیل کے بھی قتل کو تسلیم کر لیا
تھانے کا ایک چکر لگایا تھا اور بس
اب قوم کا نصیب نہیں کالا باغ بھی
لیڈر نے سبز باغ دکھایا تھا اور بس

روبینہ شاہین بینا

اس دن کے بعد سے وہ پڑے ہسپتال میں
ہم نے بنا کے کھانا کھلایا تھا اور بس
لے کر وہ گو بھی آ گئے لوٹے جو شام کو
جوڑے کا ان سے پھول منگایا تھا اور بس

نور جمشید ہوری

۲۵ر مارچ ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کے ۴۹ویں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ طرحی مشاعرہ خوبصورت شاعرہ محترمہ زہرہ نگاہ کے ایک خوبصورت مصرع پر رکھا گیا تھا۔ جو کچھ یوں تھا۔

حرف حرف گوندھے تھے طرزِ مشکبو کی تھی
تم سے بات کرنے کی کیسی آرزو کی تھی

مشاعرے میں شریک ہونے والے مزاحیہ شاعروں کا کلام درج ذیل ہے۔

آج بیٹے کو کیسے زن مرید کہتی ہیں
آرزو بھلا کس کو چاند سی بہو کی تھی
کھائے جاتی تھی بیگم یوں دماغ میرا کیوں؟
کس قدر میں چارہ تھا، کس قدر وہ بھوکی تھی

نوید ظفر کیانی

حال ''دردِ دل'' کا تھا، جس کو ہم نے بتلایا
بعد میں کھلا عقدہ، ڈاکٹر ''فلُو'' کی تھی
شاعری دسمبر پرستن کے ہو گئی شاداں
قوم جو ہوئی ماری گرمیوں کی لو کی تھی

عرفان قادر

ٹاک شو میں طوطوں نے ایسی گفتگو کی تھی
جس کو سن کے لوگوں نے خوب ہاؤ ہو کی تھی
ہر گلی میں پھینکے تھے جان بوجھ کے ریپر
پاپڑوں کی مشہوری ہم نے کو بکو کی تھی

روبینہ شاہین بینا

فیس بک کے دوسرے ادبی گروہوں کے منتظمین کی طرف سے ارسال کردہ اِسی نوعیت کی رپورٹوں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

مدیر

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ